تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
سوانحِ حیات
علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمۃ اللہ علیہ
www.KitaboSunnat.com
از قلم
ابوبکر قدوسی
www.KitaboSunnat.com
مکتبہ قدوسیہ

فضیلۃ الشیخ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ اپنے علم و فضل اور حسن عقیدہ کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ دعوت الی اللہ کے باب میں ان کی مساعی نہایت پاکیزہ تھی۔ الشیخ حافظ احسان خواص اہل علم کے ہاں اپنی مولفات کی وجہ سے معروف تھے۔ ان کی کتب بہت ہی مفید اور نفع بخش تھیں۔ وہ حقیقی معنوں میں مجاہد مسلمان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی شہادت قبول فرمائے جو انہوں نے اسلامی عقیدے کے دفاع اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں پائی۔

(سماحۃ الشیخ علامہ ابن باز رحمہ اللہ)

میری شیخ الفاضل احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ سے ملاقات تھی۔ میں ان کے عمدہ اخلاق اور عقیدے سے آگاہ تھا۔ علوم شرعیہ اور سنت نبوی سے ان کا تمسک اور سلف صالحین سے ان کی عقیدت مثالی تھی۔ عقیدہ اہل سنۃ والجماعۃ کے دفاع میں ان کی جدوجہد عمدہ تھی۔

(سماحۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین رحمہ اللہ)

الشیخ احسان الٰہی ظہیر اہل سنت کے جلیل القدر داعی تھے، دعوت الی اللہ میں ان کی جدوجہد بہت بابرکت تھی۔ عقائد اہل سنت کے دفاع اور گمراہ فرقوں کے ردّ میں ان کی غیرت سے میں بہت اچھی طرح واقف ہوں۔

(امام کعبہ فضیلۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السبیل رحمہ اللہ)

شیخ احسان عربی میں اپنے الگ ہی اسلوبِ تحریر کے موجد تھے۔ انہوں نے کسی کا اسلوب نہیں اپنایا۔ ان کی تحریر میں عجیب بانکپن تھا۔

(امام کعبہ شیخ الدکتور صالح بن حمید)

گر بہ تو افتدم نظر، چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو
شرح دہم غمِ تو را، نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پئے دیدن رُخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کُو بہ کُو
اگر تو مرے
رو بہ رو آئے
تو میں تری
جدائی کے غم
نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو
تجھے بتاؤں
کہ تجھے دیکھنے کو میں، کیسے
در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو
مانند صبا، سرگرداں رہا

تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
از قلم
ابوبکر قدوسی

جنوری ۲۰۱۶ء میں
شفیق پریس سے چھپوا کر شائع کی گئی۔
بادشاہی مسجد، جس کے جوار میں علامہ شہید نے ساتھیوں سمیت
دنیا سے رخت سفر باندھا۔

اِنتساب

اپنے والدِ محترم

مولانا عبدالخالق قدوسی شہید رحمہ اللہ

کے نام

جو علامہ رحمہ اللہ کی علمی اور تحریکی زندگی

کے آغاز سے اختتام تک ہم سفر رہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

عُرْسُ الشَّهادة

شعر: عبدالرحمن صالح العشماوي
الرياض ٧/٨/١٤٠٧هـ

كان الشيخ الفاضل "إحسان إلهي ظهير" يُلقي أمام جماعته المسلمين بباكستان درساً دينياً وقدَّم مجهولٌ باقة ورد إلى أحد الحاضرين طالباً منه إيصالها إلى الشيخ وتسابقت الأيدي لإيصال الباقة إليه .. ولم يكن الناس يعلمون أن تلك الباقة كانت تحمل في أحشائها قنبلة الموت .. وصلت الباقة إلى الشيخ فانفجرت وقتلت عدداً ممن كانوا حوله وأصابته بجروح خطيرة .. ثم انضمَّ بعدها بأيام إلى قافلة الشهداء .. فهنيئاً له الشهادة التي نحسبه من أهلها إن شاء الله.

ماذا جرى .. يتراخى في يديَّ القلمُ — وفي مفاصل شعري قد سرى ألمُ
ماذا جرى .. كلماتي لا تطاوعني — وأحرفي بمعاني الصمت تلتزمُ
يبكي بلا أدمعٍ قلبي الحزينُ، ولا — شدوٌ يخفّف عن قلبي ولا نغمُ
كأنَّ وجه نشيدي وجهُ غانيةٍ — لاذ الشحوب به، واجتاحه الندمُ
كأنني عاشقٌ شطَّ المزارُ به — في بلدةٍ، ما بها أهلٌ ولا رحمُ
أفرغتُ في قلبي حزني، فيا عجبي — من الحروف على معناه تستترُ
لم أتهم همتي لما بكيتُ، ولم — أعلن بأني، أمام الناس متهمُ
نظرتُ من كُثُبٍ إحساسي إلى زمني — فهالني صنمٌ من فوقه صنمُ
وهالني ما رأت عيناي من بشرٍ — أو ما لهم بشرٌ، لكنهم نعمُ
تركتهم في غمار العيش وانصرفت — نفسي إلى عالمٍ بالخير يتسمُ
صرفتُ وجهي عن الأنداد فابتهجت — نفسي، وأشرق في آفاقها الحلمُ
وشاهدت مقلتي ظلاً وساقيةً — وروضةً غسلت أزهارها الديمُ
رأيت فيها رجالاً لا يروق لهم — إلا الجميل، ولا تعدو همُ الشيمُ
هذا أخي بدأت بالأمس رحلته — إلى الخلود، وللأخيار ما غنموا
ناديته ورياح الحزن عاصفةٌ — والليل تركض في ميدانه الظُّلَمُ:
"إحسانُ" سافرت عن دنيا مؤنسةٍ — إلى عوالم خيرٍ، كلُّها نِعَمُ
سافرت والأرض حبلى بالخطوب وكم — قد أنجبت سقماً في ذيله سقمُ
سافرت عن كل خدَّاعٍ ومحترفٍ — للغدر، ليس له دينٌ ولا ذِمَمُ
كم بدعةٍ نشرتها بيننا فرقٌ — تضاءلت في حروف أرضاها القيمُ

رفعت في وجهها صوت العقيدة في ... قوم بآذانهم من جهلهم صممُ

ناديتهم - يا أخا الإسلام - ترشدهم ... إلى كتاب هو النبراس، والحكمُ

لكنهم جهلوا، ما كنت تعلمه ... وبعضهم علموا، لكنهم كتموا

وهربوا غدرهم في باقة حملت ... وردا، وفي وردها الجرم الذي اجترموا

يا باقة الورد يا رمز المحبة قد ... أصبحت رمز الأسى في كف من ظلموا

ما أنت للغدر، لكن الذين بغوا ... غطوا بأوهامهم عينيك وانتقموا

يا باقة الورد.. لو أن الضمير صحا ... لما تخبأ فيك الموت والألمُ

أقوام من عالم يعلو السفيه به ... وتستمد له من حقده النظمُ

يا عالم الرعب يا دنيا مخاوفنا ... إلى متى هذه النيران تضطرمُ؟

إلى متى يقتل الأخيار ترضيةً ... للظالمين، وما من ناصر لهمو؟

قد يرسل الفارس المقدام حربته ... لكنها بقضاء الله تصطدمُ

فلا تصيب مكانا من ضحيته ... وربما ناله من حدها العدمُ

«إحسان» إن أحكم الطغيان قبضته ... وسل خنجره، فالله منتقمُ

قوافل الشر تمضي في تآمرها ... والخير منتصرٌ، والشر منهزمُ

رأيتك اليوم في عرس الشهادة توهما ... تاهت خطاك، ولا زلّت بك القدمُ

قد يعجب الناس أن يلقى الممات فتى ... وقلبه فرح والثغر يبتسمُ

لكنه عجبٌ يلقى نهايته ... عند الشهيد الذي بالله يعتصمُ

تحيةً يا أخا الإسلام صادقةً ... أبثها نغماً ما مثله نغمُ

وعدٌ من الله - يا إحسان - أن لنا ... عقبى، وإن عرانا ليس تنفصمُ

حبل العقيدة يبقى بيننا أبداً ... وكل حبل سوى الإيمان ينصرمُ

عبد الرحمن صالح العشماوي

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ علیہ

شب و روز کے آئینے میں

پیدائش	۳۱ مئی ۱۹۴۰ء
تکمیل حفظ قرآن	۱۹۴۸ء
درس نظامی (جامعہ اسلامیہ، گوجرانوالہ)	جنوری ۱۹۶۲ء
جامعہ سلفیہ	۱۹۶۲ء
مدینہ یونیورسٹی داخلہ	۱۹۶۳ء
شادی	۸ اگست ۱۹۶۵ء
پہلی کتاب القادیانیۃ اشاعت	۱۹۶۷ء
مدینہ سے واپسی	۱۹۶۷ء
چینیانوالی مسجد	اگست ۱۹۶۷ء
الاعتصام کی ادارت	ستمبر ۱۹۶۷ء
ترجمان الحدیث کا اجراء	۱۹۶۹ء
ہفت روزہ اہلحدیث کی ادارت	جنوری ۱۹۷۰ء
جمعیت اہلحدیث کا قیام	۱۹۸۱ء
آغاز جلسہ ہائے عام (موچی دروازہ، لاہور)	۱۸، اپریل ۱۹۸۶ء
آخری جلسہ (قلعہ کچھمن سنگھ)	۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء
شہادت	۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء

مضامین

انہوں نے کہا!

- ''ہمارا راستہ دو طرف جاتا ہے، مگر منزل ایک ہے، یا سر بلند رکھ کے غازی بن کے جیو یا سر کٹا کے شہید بن کے مرو''

- ''خدا کی قسم! اہلحدیث اپنے آقا ﷺ کی شجاعت کے وارث بن جائیں تو پورے پاکستان کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ کرنے کی جرات نہیں کرسکتی۔''

- ''ہم کانٹوں پہ چلنا سیکھے، تلوار کی دھاروں پہ رقص کرنا سیکھے، بندوقوں کے آگے محمد ﷺ کی عظمت کے لیے کھڑے ہونا سیکھے۔''

- ''میں تمہیں لڑاؤں گا، رب کی توحید، محمد ﷺ کی عظمت، رب کے قرآن، ﷺ محمد کے فرمان کے لئے، رب کعبہ کی قسم تم سارے پلٹ جاؤ تو میں اکیلا لڑوں گا۔''

- ''ان شاء اللہ باطل کو دبا کے رہیں گے، حق کے لئے ٹکرا کے رہیں گے اور کائنات میں محمد ﷺ کا پرچم لہرا کے رہیں گے۔''

- ''جو نبی کے بعد کسی اور کی بات کو حجت سمجھتا ہے وہ عملی طور پر نبوت کا منکر ہے۔''

- ''مُردوں سے ڈرنے والے کبھی زندہ کہلانے کا حق رکھتے ہیں؟''

- ''اگر بزدلی سے قومیں بچا کرتیں تو بہادروں کو کبھی موت نہ آتی''

- ”جنت بہت بڑی نعمت ہے لیکن نبی کائنات ﷺ کی رفاقت جنت سے بھی بڑی چیز ہے۔“

- ”اسلام صرف نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج کا نام نہیں ہے۔ اپنی زندگی کو ایک کامل اور مکمل دستور کے سانچے میں ڈھالنے کا نام ہے۔“

- ”حسین رضی اللہ عنہ کو وہ مائیں پیدا کرتی ہیں جو فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی ہوں۔“

- ”محمد رسول اللہ ﷺ نے جو دین تمہیں عطا کیا ہے، اس دین کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو گے، اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لو گے تو یاد رکھو! ساری دنیا کی مخالفتیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔“

- ”دو ہی چیزیں ہوتی ہیں جو استقامت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ایک لالچ ہوتا ہے اور دوسرا خوف۔“

- ”میں جو کچھ کہوں گا، خواہ قتل بھی ہو جاؤں، اس کی تردید نہیں کروں گا۔“

- ”میں اپنے ایمان اور عقیدے میں سیاسی مصلحتوں کی آلودگی قبول کر کے اپنی سیاست کی دکان نہیں چمکا سکتا۔ میں اس ملک میں زندگی بھر اقتدار میں نہ آؤں مجھے کوئی غم نہیں ہوگا میں کلمۂ حق کہنے سے کبھی نہیں ہچکچاؤں گا۔“

- ”جب قوموں کو غلام بنا لیا جاتا ہے تو پھر وہ وہی کچھ سوچتی ہیں جو ان کا آقا انہیں پڑھائے اور سکھائے۔“

- ”اسلام جب تک اس ملک میں نہیں آتا ہماری روحیں مضطرب ہیں۔“

- ''ہٹ دھرمی اور تعصّب انسان کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔''

- ''مادیت سے مادیت لڑسکتی ہے۔ جب مادیت کے مقابلے میں فروتری ہو، کم تری ہوتو پھر مادیت نہیں روحانیت لڑا کرتی ہے۔''

- ''یاد رکھو! سندھی، بلوچی، پشتون اور پنجابی اکٹھے رہ سکتے ہیں جب تک محمد ﷺ کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو جائیں ورنہ قومیتوں اور جغرافیوں کا بت قوم کوٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔''

- ''عہدوں سے چمٹے رہنا جماعتوں کے لیے ہرگز نیک فال نہیں ہوتا۔''

- ''بحران کبھی قوموں کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیتے ہیں اور کبھی انہیں زندہ جاوید کر دیتے ہیں۔''

- ''ایک نظریاتی ملک میں سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ کرنی چاہیے وہ معاشرے کی اپنے نظریات کے مطابق پرداخت ہے تاکہ وطن اور اہل وطن فکری طور پر آپس میں ہم آہنگ ہوں۔''

- ''اقتصادی مساوات قانون فطرت کے خلاف ہے۔''

- ''رائے اور فکر کا اختلاف تو ہوسکتا ہے لیکن دین کے نام پر گروہ بندی اور فرقہ وارانہ عصبیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

- ''خوش اطواری اور خوش پوشی کی بات اپنے اپنے مزاج پر منحصر ہے۔ اس کے لیے تونگری اور امارت کا ہونا ضروری نہیں۔''

- ”اسلام، جمہوریت اور پاکستان لازم وملزوم ہیں اور کسی ایک کی نفی پاکستان سے انکار کے مترادف ہے۔“

- ”جس ملک کی بنیاد ہی ایک عقیدے پر رکھی گئی ہو، اس ملک میں کسی بھی ایسی بات کا فروغ جو اس کے عقیدے کے مطابق نہ ہو انتہائی مہلک ثابت ہوا کرتا ہے۔“

- ”جس کے اندر اختلاف برداشت کرنے کا مادہ موجود نہ ہو، اس کو پہلے اختلاف کی بات نہ کرنی چاہیے۔“

- ”دلیری صرف اس قوم میں پائی جاتی ہے جو غیرت مند ہو اور غیرت مند صرف وہ قومیں ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو گناہوں کی آلودگیوں سے بچا کے رکھتی ہیں۔“

- ”مولویت غلامی کا نام نہیں کائنات کی آقائی کا نام ہے۔“

- ”حسد دین کے طالب علموں کے لیے پہلی رکاوٹ ہے۔ جو بندہ اس رکاوٹ کو پار نہیں کرتا، وہ کبھی دین کی خدمت نہیں کرسکتا۔“

- ”قومیں ہمیشہ ماضی سے اپنا مستقبل سنوارا کرتی ہیں۔“

- ”کسی بھی مملکت میں سکون اور طمانیت کی فضا سیاسی استحکام ہی کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے۔“

سخن ہائے گفتنی

کچھ برس گزرے کہ میں نے مجلّہ ''الاخوۃ'' کے لیے علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید سے متعلق اپنی یادوں پر مشتمل چند مضامین لکھے۔ احباب نے انہیں بے حد پسند کیا ورنہ مجھے لکھنا کہاں آتا ہے۔ یا شاید اس لیے بھی کہ میری تحریر میں قلم سے زیادہ جذبات شامل تھے اور ''سانجھے دکھ'' سب کو رلا دیتے ہیں۔

ایک روز خیال گزرا کہ ان مضامین کی ضخامت پچاس یا ساٹھ صفحات کی تو ہو گی کیوں نا چند صفحات کا مزید اضافہ کر کے اس رسالے کو شائع کر دیا جائے۔ جب لکھنا شروع کیا تو پھر ارادہ کر لیا کہ علامہ شہید کے حالات زندگی پر مشتمل نسبتاً مفصل کتاب مرتب ہو جائے تو بہت ہے...... مگر میرے مزاج کا عجب معاملہ ہے کہ میں بے انتہا متساہل ہوں، بہت جوش سے کام شروع کرتا ہوں مگر ادھورا چھوڑ دیتا ہوں۔ اپنی ساری زندگی اس مزاج کے ''کارہائے نمایاں'' سے عبارت ہے کہ

نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا

پھر بھی دو تین سالوں میں اس کتاب کو ادھورا ہی سہی ''مکمل'' کر لیا۔ ''ادھوری کتاب'' یوں کہ بہت سے ایسے عنوانات علامہ کی زندگی کے پہلو تھے جو میرے علم میں ہیں، چاہیے تھا کہ ان پر تحقیق کی جاتی اور لکھا جاتا...... مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وقت نکالا جائے۔ سو میری بے ہنگم اور بے ترتیب مشغولیت نے ایسا نہ کرنے دیا۔ ''مکمل کتاب'' اس طرح کہ بہرحال کتاب بھی ہے اور شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں بھی...... اگرچہ دعویٰ نہیں مگر گمان ہے کہ علامہ کے حوالے سے اس میں بہت کچھ وہ ہے

جو پہلے شائع نہیں ہوا...... اور ہاں اگر آپ کو کہیں تکرار ملے یا ربط کی کمی تو میں عرض کر چکا کہ بعض مضامین کتنے ہی برس پہلے لکھے گئے تھے۔ اس کتاب کے آخر میں اپنے والد گرامی پر لکھا گیا ایک مضمون بھی شامل کر دیا گیا ہے سبب اس کا یہ ہوا کہ اس میں علامہ شہید اور اہل حدیث یوتھ فورس کے بارے میں کافی واقعات تھے۔ اگر چہ کچھ اپنے بچپن کا ذکر بھی تھا مگر موضوع سے مناسبت کے سبب اسے بھی شامل کر دیا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ علامہ شہید کی جماعتی زندگی، اختلافات کی کہانیاں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علامہ کے بعد احتجاجی تحریک کے کتنے ہی ناگوار اور ناگفتہ بہ قصے تھے جنہیں میں نے نظر انداز کر دیا جب کہ بہت کچھ لکھنے کے بعد قلم زد کر دیا۔ ایک دوست کا کہنا تھا کہ لکھنے میں آپ کا انداز اور الفاظ گاہے تلخ ہو جاتے ہیں جب کہ مزاج نرم...... میں نے یہ کہتے ہوئے کہ

جھیاں تن میرے تے لگیاں　　　تینوں اک لگے تے تو جانیں

بہت کچھ ختم کر دیا۔ جانتا ہوں اس کے باوجود کچھ پیشانیاں شکن آلود رہیں گی۔ جن دوستوں نے اپنے پیہم اصرار سے مجھے لکھنے پر مجبور کیے رکھا، ان کا شکریہ ، ورنہ میں تو منیر نیازی کی طرح

ہمیشہ　دیر　کر　دیتا　ہوں

اور خاص طور پر شکریہ جناب شبیر میواتی کا کہ جنھوں نے علامہ سے متعلق ''چٹان'' کے شمارے اور دیگر اشیا بن مانگے فراہم کیں اور خالد عبداللہ بھائی کا کہ جن کا شوق میرے لیے مہمیز کا کام کرتا رہا۔

انیس ستمبر، دو ہزار پندرہ

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

کچھ ستارے کبھی غروب نہیں ہوتے

کشمیر کے پہاڑوں سے جب پورب کے لیے ہوائیں چلتی ہیں، تو پہلے سیالکوٹ کے قدموں کو چھوتی ہیں اور پھر آگے نکل جاتی ہیں۔ جموں و کشمیر کے دامن میں شمالی پنجاب میں واقع سیالکوٹ ہمیشہ ہی منفرد رہا ہے۔ ممکن ہے یہ جملہ کہ ''کچھ ستارے کبھی غروب نہیں ہوتے'' نسبتاً بڑھا ہوا تفاخر ہی رہا ہو اور مبالغہ ہی گردانا جائے لیکن کچھ ایسا بے اصل بھی نہیں، کہ بسا اوقات ایسا ہوا ضرور ہے۔ ملا عبدالحکیم ہو یا علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض یا علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ سیالکوٹ کے کچھ روشن ستارے ایسے ضرور رہے ہیں کہ کہا جا سکے ''کچھ ستارے کبھی غروب نہیں ہوتے۔''

شیخ نظام دین

سیالکوٹ سے مشرق کی سمت دس کلومیٹر دور گاؤں میں شیخ نظام دین کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اس دور میں دیہاتوں میں سائیکل پر کپڑے بیچے جاتے تھے اور یہ ''سائیکل والی دکان'' ایک الگ ہی کشش رکھتی تھی۔ شیخ نظام الدین کی یہ دکان بھی گاؤں گاؤں گھومتی۔ شیخ صاحب کے بعض دوسرے عزیز بھی اسی کاروبار سے وابستہ تھے۔ شیخ رمضان، شیخ نظام الدین کے چچا زاد بھائی تھے وہ شیخ اہل حدیث ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنے عزیز پر محنت شروع کر دی اور اس کے نتیجے میں شیخ نظام الدین بھی اہل حدیث

ہو گئے۔ اللہ نے شیخ نظام الدین کو چھ بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک احمد دین تھے۔

شیخ احمد دین

شیخ احمد دین جوان ہوئے تو آبائی پیشہ اختیار کیا۔ کپڑے فروخت کرتے کرتے گاؤں چھوڑا اور سیالکوٹ آ بسے۔ ''بنت مریم'' نامی بستی میں رہائش اختیار کی۔ شیخ احمد دین کے کاروبار میں اللہ نے برکت عطا کی۔ انہوں نے سیالکوٹ شہر میں کپڑے کی دکان سجا لی۔ اب وہ ایک باقاعدہ تاجر بن گئے تھے۔ جب فراخی عطا ہوئی تو دل کے شوق پورے کرنے کی آرزو بیدار ہو گئی۔ انہیں سیاست میں حصہ لینا اچھا لگتا تھا۔ گھڑ سواری اور شکار کا شوق بھی تھا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ یہ شوق انہیں آوارگی کی طرف نہ لے گئے بلکہ اس دوران دین سے تعلق گہرا ہوتا گیا۔ شیخ احمد دین کو اللہ تعالیٰ نے نرینہ اولاد سے محروم رکھا تھا۔ اس خواہش میں دوسری اور پھر تیسری شادی کی۔ من کی مراد بر آئی۔ اللہ نے بیٹا دے دیا۔ ظہور الٰہی نام رکھا۔ اکلوتا بیٹا اور تین مائیں، گود سے نہ اترتا تھا۔ بہت نازوں پلا تھا۔ بیٹا جوان ہوا تو باپ کے سارے شوق رد کر دیئے۔ والد کی صرف ایک بات قبول کر لی۔ وہ تھی مذہب سے گہرا تعلق۔

ادھر شیخ احمد دین بوڑھے ہو چلے تھے۔ خاندان پھیل چکا تھا۔ اب ان کو سب لوگ تخاطب کے لیے ''لالہ جی'' کہتے تھے۔ بستی بھر میں ان کا خاندان ہی آباد تھا۔ سو ''بنت مریم'' اب احمد پورہ کہلاتا تھا۔

حاجی ظہور الٰہی

''لالہ جی'' کو اللہ رب العزت نے پانچ بھائی دیئے تھے، البتہ بیٹا انہیں صرف ایک ملا۔ ''ظہور الٰہی'' اکلوتے تھے سو سارے ارمان تو اب پورے ہونے تھے۔ ان کے لیے دینی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ جو قرآن کریم ناظرہ تک محدود تھی اور پھر سکول بھیجا گیا مگر سکول میں آپ نے چند سال ہی پڑھا اور پھر ''شیخوں'' کے دستور کے مطابق کاروبار

میں ''ساتھ لگا'' لیا گیا۔ تب اس دور میں اور آج بھی کسی حد تک ''شیوخ'' میں تعلیم کی ضرورت اتنی ہی ہوتی تھی کہ کھاتے لکھنے یا پڑھنے میں منشی کی محتاجی نہ ہو۔ اس ''روایت'' کے پیش نظر شیخ ظہور الٰہی جلد ہی لالہ جی کی دکان سجانے آ پہنچے۔ جب شیخ ظہور الٰہی سن شعور کو پہنچے تو سیالکوٹ مولانا محمد ابراہیم میر رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل سے روشن تھا۔ شیخ ظہور الٰہی ان کی مجلس، درس میں جانے لگے۔ روز بروز یہ آنا جانا بڑھتا گیا۔

احسان الٰہی

شیخ ظہور الٰہی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی کہ ایک روز مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے ''علم اور عالمِ دین کی فضیلت'' کے عنوان پر درس دیا۔ شیخ ظہور الٰہی بھی اس درس میں موجود تھے۔ درس کچھ ایسا پر تاثیر تھا کہ مجلس میں بیٹھے بیٹھے شیخ صاحب نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر شادی کے بعد میرے گھر بیٹا پیدا ہوا تو میں اسے قرآن کریم کا حافظ اور دین کا خادم بناؤں گا۔ [1] شیخ صاحب کی شادی ہو گئی اور اللہ نے 31 مئی 1940ء [2] کو آپ کو پہلے بیٹے سے نوازا۔ ''لالہ جی'' کے خاندان میں مدت بعد بیٹا آیا تھا کہ شیخ ظہور الٰہی اکلوتے ہی تھے۔ ساتویں روز یعنی 6 جون کو بچے کا عقیقہ کیا گیا۔ اور اس روز ہی نام رکھا گیا ''احسان الٰہی۔'' جی ہاں، یہ بچے کا نام طے ہوا۔ سبب یہ ہی رہا ہوگا کہ اولاد نرینہ کے حوالے سے مدتوں بعد اس خاندان پر ''اللہ کا احسان'' ہوا تھا۔

خواب روشنی بن گئے

''احسان الٰہی'' کی پیدائش سے پہلے دادی محترمہ نے خواب دیکھا کہ ان کے کمرے میں ایک بلب روشن ہے اور اس کی روشنی پھیل رہی ہے۔ آپ نے اس خواب کے بارے میں ایک عالم دین سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ (ان شاء اللہ) آپ

---

[1] ترجمان الحدیث/ مارچ: 1988، ص: 53۔

[2] ترجمان الحدیث، شہداء نمبر۔ انٹرویو، حاجی ظہور الٰہی۔ صفحہ نمبر 55، طبع 1988۔

کے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو دین کی روشنی پھیلائے گا اور بڑا عالم بنے گا۔ تعبیر ایسی درست ہوئی کہ آج آپ کی پھیلائی روشنی سے ایک جہاں منور ہے۔

لاڈلا پوتا اور لالہ جی

اب لالہ جی کا لاڈلا پوتا تھا اور لالہ جی تھے۔ اکلوتے بیٹے والوں کے بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ ہر وقت سانس حلق میں اٹکا ہوتا ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، میں جانتا ہوں، یہ کیفیت کیا ہوتی ہے۔ لالہ جی نے ساری عمر ایک بیٹے کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ اب اللہ نے دوسرا ''بیٹا'' پوتے کی شکل میں دیا تو اس کے لاڈ دیکھنے والے تھے۔ پوتے کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ، ہر فرمائش دادا کے لیے حرف آخر ہوتی۔ احسان الٰہی کی پھوپھو ''حمیدہ'' کہتی ہیں کہ احسان الٰہی جو مانگتا اس کو دیا جاتا۔ کبھی گھوڑا لے آتے اور اس پر سیر کروائی جاتی۔ کبھی پوتے کو مچھلی کے شکار پر لے جاتے۔ لالہ جی کو جو بھی شوق تھے جوانی کے، اب وہ پورا کرنے کو ساتھی اور دوست مل گیا تھا۔

خود علامہ احسان الٰہی ظہیر اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

''مجھے اپنے دادا جی سے گھڑ سواری کے شوق کے علاوہ بھی چند شوق ملے کسی حد تک سیاست کا شوق بھی۔ انہیں شکار کا بہت شوق تھا اور یہ شوق بھی مجھے ادا جی سے ملا تھا۔ وہ مچھلی پکڑنے اور بندوق سے شکار کرنے کا شوق رکھتے تھے اور بچپن میں مجھے اپنے اس شوق میں شامل کر لیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے جب میں نے بندوق چلائی، میری عمر دس برس تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں بہت کم لوگوں کے پاس بندوقیں ہوا کرتی تھیں۔ شکار کے تمام لوازمات اور ہر قسم کا شکار کا سامان ہمارے گھر میں موجود تھا۔ میرے والد شیخ ظہور الٰہی کو میرے دادا جی کے کسی بھی شوق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ماسوائے دینی رغبت کے۔''

رہے شیخ ظہور الٰہی وہ اپنے انداز میں چل رہے تھے۔ دیسی گھی سے اپنے بیٹے کی مالش کرتے۔ خاص زور گردن کی پچھلی طرف ہوتا۔ حاجی ظہور الٰہی کا خیال تھا کہ اس طرح بندے کے اعصاب مضبوط ہوتے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ خوراک کا اہتمام ہوتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ حاجی ظہور الٰہی کو اللہ تعالیٰ سے اپنا عہد یاد تھا۔

جسمانی تربیت

حاجی ظہور الٰہی علامہ صاحب کی جسمانی تربیت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''علامہ ابتدا سے ہی تنومند، مضبوط اعصاب اور مضبوط اعضاء والے تھے تاہم میں نے ان کے جسم کو مزید صحت مندی اور طاقت وری کے جوہر سے آراستہ کرنے کے لیے ان کی خوراک کا خوب خیال رکھا۔ جب تک علامہ جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ میں زیر تعلیم رہے، ان کا کھانا روزانہ سیالکوٹ سے بھیجا جاتا تھا۔ تاکہ خوراک کی کمی کی وجہ سے ان کی صحت کمزور نہ ہو جائے۔ اس طرح پاکستان میں جہاں بھی زیر تعلیم رہے، ان کی خوراک کا خاص خیال رکھا گیا۔ خورد ونوش کے ساتھ ساتھ میں ان کے جسم پر تیل ملتا اور خاص کر ان کی گردن کے اوپر نیچے خوب مالش کرتا تاکہ ان کے اعصاب مضبوط سے مضبوط تر ہو جائیں کیونکہ اعصاب ہی تو ہیں جو زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا اعصابی نظام کمزور ہوتا ہے۔ وہ کوئی کام بھی جرأت و ہمت سے نہیں کر پاتے۔ دنیا میں تبدیلی لانے کے لیے جہاں اور عوامل کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے، وہاں اپنے اعصاب کو قائم اور حواس کو حاضر رکھنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ [1] جی ہاں۔ یہ تھا علامہ کی ذہنی اور جسمانی تربیت کے لیے حاجی ظہور الٰہی صاحب کا نقطہ نظر اور معیار۔''

ابتدائی تعلیم کے لیے ایم بی پرائمری سکول محلّہ دھاریوال میں داخل کرا دیا گیا۔ جبکہ اس سے پہلے ناظرہ قرآن آپ پڑھ چکے تھے۔ لیکن پرائمری کی تکمیل سے پہلے ہی سکول سے اٹھا کر حاجی ظہور الٰہی اپنے عہد کی تکمیل کے لیے سرگرم ہو گئے۔ عمر فاروق قدوسی

---

[1] ترجمان الحدیث، شہدا نمبر طبع مارچ/ اپریل: 1988ء ص: 52.

''الاخوۃ'' میں شیخ منیر احمد [1] کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ سکول داخل ہو چکے تھے میں انہیں سکول چھوڑنے جاتا۔ میں انہیں کندھوں پر اٹھا لیتا اور ان کا بستہ میرے ہاتھوں میں ہوتا۔ اگر کبھی پیدل چلانے کی کوشش کرتا تو وہ بالکل پیدل نہ چلتے اور کندھے پر سوار رہنے کی ہی ضد کرتے۔ چوتھی جماعت تک میں انہیں کندھے پر بٹھا کر لے جاتا۔ چوتھی کے بعد انہیں حاجی ظہور الٰہی صاحب نے حفظ قرآن کریم کے لیے مدرسے بھیج دیا۔''

پنن دا کھوہ

باپ کی تربیت اور ماں کے دودھ کے زیر اثر شرک سے بے زاری ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی کہ آپ خود اپنی ایک تقریر میں اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ابھی اپنی ماں کی گود میں تھے اور اکلوتے بیٹے تھے اور بیٹے بھی ایسے کہ سارے خاندان کی آنکھوں کا تارا۔ آپ بیمار ہو گئے اور بیماری بھی ایسی شدید کہ بچنے کے امکانات معدوم نظر آنے لگے۔ محلے کی کچھ خواتین آپ کی والدہ کے پاس آئیں۔ ان میں سے ایک بولی کہ بچے کو پنن کے کنویں پر لے جاؤ اور وہاں جا کر اسے غسل دو، بچہ ''ہرا بھرا'' ہو جائے گا۔ پنن کا کنواں سیالکوٹ میں مشہور تھا، جیسے ماضی میں درگاہوں اور مزاروں پر کنویں ہوتے ہیں اور ان سے منسوب قصے کہانیاں لوگوں نے گھڑی ہوتی ہیں اور ''کاروبار تصوف'' چلتا رہتا ہے۔ علامہ شہید کی والدہ نے یہ الفاظ سنے تو بے اختیار جواب دیا ''میں یہ تو گوارا کرلوں گی کہ میرا بیٹا مر جائے لیکن پنن کے کنویں پر نہیں جاؤں گی۔ اگر اللہ نے شفا دینی ہوگی تو ایسے ہی دے دے گا۔'' اور پھر اللہ نے شفا دے دی اور یہ

---

[1] شیخ منیر احمد، حاجی ظہور الٰہی صاحب کے ملازم تھے اور مدت تک حاجی صاحب کے پاس رہے۔ بہت نیک اور متشرع بزرگ تھے۔ اکثر راوی روڈ حاجی محمد صادق مرحوم کے گھر آ کر ٹھہرتے اور علامہ کے بچپن کے قصے سناتے۔ حاجی صادق صاحب علامہ کے رشتے میں ماموں تھے۔

بچہ بڑا ہو کر نہ جانے کتنی مرجھائی روحوں اور زخمی دلوں کی روحانی شفا کا سبب بنا۔

حفظ قرآن کریم

حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے جب بیٹا دیا، انہوں نے اسے قرآن کریم حفظ کروانے کا ارادہ کر لیا تھا اور ساتھ عالم دین بنانے کا بھی۔ ان کے اس ارادے اور نیت کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

ان دنوں مسلکی چپقلش تو چلتی رہتی تھی لیکن اس کی وجہ سے تقسیم ایسی گہری نہ تھی کہ نفرت کی بنیاد پڑ جاتی اور معاشرتی تعلقات بھی شجر ممنوعہ ٹھہرتے۔ اسی ماحول میں حاجی صاحب نے علامہ شہید کو اونچی مسجد، بازار پنساریاں میں، جو سوہنی شاہ کے نام سے معروف تھے، کے پاس حفظ قرآن کے لیے داخل کروا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ استاد صاحب کی شہرت نہایت عمدہ اور سخت گیر استاد کی تھی اور ان کے شاگردوں کی منزل بہت پختہ ہوتی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ اب تو ''مار نہیں، پیار'' کا سلوگن رائج ہے، ورنہ کسی دور کی بات ہے کہ والدین بچے کا بازو پکڑتے اور ان الفاظ میں استاد کے حوالے کرتے کہ ''لیں جی یہ بچہ آپ کے پاس ہے، ہڈیاں ہماری، گوشت آپ کا ہے'' مطلب یہ کہ جتنا چاہیں ماریں 'کھلی چھٹی' البتہ ہڈی نہ توڑیئے گا۔ اب یہ تو طے ہے کہ حاجی ظہور الٰہی صاحب نے ایسا کوئی جملہ نہیں بولا ہو گا کہ ''احسان الٰہی'' اکلوتا بھی تھا اور لاڈلا بھی۔ خاندان کی آنکھ کا تارا بھی تھا۔

رہے استاد صاحب، ان کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ ان کی مسجد اوپری منزل پر تھی۔ گاہے کسی نالائق شاگرد کو سبق سکھانے کے لیے کانوں سے پکڑ کر اٹھا لیتے اور منڈیر سے باہر لٹکا لیتے۔ اب کانوں کا کیا حشر ہوتا، انسانی رہتے یا خرگوش کے، اس کا پتہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور معلوم پڑتا ہے کہ ''منزل'' واقعی ''پکی'' کرا دیتے ہوں گے کہ ہم نے اپنے کانوں سے سارا سارا رمضان تراویح میں علامہ کی منزل میں

غلطی نہ سنی۔

البتہ ایک مسئلہ تھا کہ استاد صاحب کا لہجہ پنجابی تھا سو اس کا تھوڑا بہت اثر علامہ کے لہجے میں بھی در آیا۔ مدینہ طیبہ میں گزرے ماہ و سال بھی اس لہجے کو ''حجازی'' رنگ نہ دے سکے۔

مدرسہ شہابیہ میں

حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ بچے کو قرآن کریم تو اچھی طرح یاد ہو گیا ہے لیکن عمدہ لہجہ اور اچھا تلفظ بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے تکمیل حفظ کے بعد حاجی ظہور الٰہی مرحوم نے علامہ کو اپنے محلے میں مدرسہ شہابیہ میں داخل کروا دیا۔ مدرسہ شہابیہ سیالکوٹ میں مسلک دیوبند کی مشہور درس گاہ تھی۔ اس میں قاری عبدالرحمٰن صاحب سندھی حفظ و قرآت کے استاد تھے۔ نہایت عمدہ لہجے میں تلاوت کرتے۔ آنکھوں سے نابینا تھے۔ علامہ کو ان کی کلاس میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں ان کے کلاس فیلو مشتاق احمد تھے اور یہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا۔

شیخ نذیر احمد کہتے ہیں کہ:

''قرآن کریم کے بہتر تلفظ اور تجوید کے لیے حاجی صاحب نے حافظ احسان الٰہی ظہیر کو کچھ دن کے لیے پسرور بھیج دیا۔ وہاں میاں نذیر صاحب پگانوالے کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ میاں نذیر صاحب اہل حدیث تھے۔ کچھ عرصہ علامہ صاحب نے وہاں تعلیم حاصل کی۔ پسرور میں کھانے وغیرہ کا اچھا انتظام نہ تھا۔ دوسرے دن علامہ صاحب گھر آجاتے تھے۔ پسرور سے واپس سیالکوٹ آنے کے بعد قاری فضل کریم کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے قراءت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ کوچہ کندی گراں میں یہ مدرسہ قائم تھا سال یہاں قراءت سیکھی اور سند حاصل کی۔'' [1]

[1] مجلہ ''الاخوۃ'' عمر فاروق قدوسی۔ مئی 2010ء

پروفیسر مشتاق احمد

پروفیسر مشتاق احمد شکر گڑھ میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ علامہ کے بچپن کے دوست تھے۔ بلکہ ''لنگوٹیا'' کا لفظ مناسب رہے گا۔ علامہ کی ابتدائی تعلیم، حفظ قرآن اور لڑکپن کے دنوں کی یادیں میرے ساتھ تازہ کرتے ہوئے انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ پروفیسر صاحب جب گفتگو کر رہے تھے، اتنی روانی سے اور مسلسل بول رہے تھے کہ جیسے ان کے سامنے گزرے واقعات کسی فلم کی مانند چل رہے ہوں اور مجھے بہت کم سوالات کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ مجھے اس کی وجہ بھی سمجھ آ رہی تھی کہ علامہ اپنے لڑکپن میں بھی شاید ایسے ہی تھے جیسے جوانی سے دم آخر تک۔ یعنی متحرک، تیز دم، پر جوش۔ سو ایسے آدمی کی ہمراہی میں گزرے واقعات سدا تازہ رہتے ہیں۔ جیسے آخری سالوں میں ہم نے انہیں قریب سے دیکھا اور وہ دن فیض کے اس شعر کی تصویر بن گئے۔

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقی گلفام
وہ عکس رخ یار سے لہکے ہوئے ایام

جب علامہ شہید نے قاری عبدالرحمٰن رحمہ اللہ سے پڑھنا شروع کیا تو اس سے پہلے ہی باقاعدہ تراویح کی امامت کا آغاز کر دیا تھا، تب آپ کی عمر نو برس تھی۔ ان دنوں کے حوالے سے عمر فاروق قدوسی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''قرآن کریم کے دور کے لیے شیخ منیر ہوتے یا پھر چوہدری عبدالغنی جو کہ حاجی صاحب کے ملازم تھے۔ شیخ منیر کا کہنا ہے کہ پہلے مصلے میں بھی ہم دونوں کی ڈیوٹی تھی۔ ہم علامہ صاحب کو دور کراتے تھے۔ علامہ صاحب نے تقریباً دس مصلے سیالکوٹ میں اپنے آبائی محلّہ احمد پوری میں سنائے تھے۔ پہلے مصلے میں حافظ عالم صاحب سامع تھے۔ وہ رشتے میں علامہ صاحب کے ماموں لگتے تھے۔ سیالکوٹ سے لاہور منتقل ہوئے تو توحید

آباد راوی روڈ میں اپنا گھر بنایا۔ بہت اللہ والے بزرگ تھے۔ ہر وقت قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے۔ گلیوں بازاروں میں بھی آتے جاتے ہوئے حافظ صاحب کی زبان کلامِ الٰہی سے تر ہوتی تھی۔ اللہ ان کی مغرفت فرمائے۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ حافظ محمد عالم علامہ صاحب کے پہلے مصلے میں سامع تھے۔ نمازِ تراویح علامہ صاحب پڑھاتے اور وتر حافظ عالم۔ انہیں حاجی ظہور الٰہی صاحب نے سختی سے کہا ہوا تھا کہ اپنے بھانجے کی بالکل رعایت نہیں کرنی۔ اگر کوئی غلطی ہوئی تو فوراً لقمہ دینا۔ درگزر سے کام نہیں لینا۔ پہلے مصلے میں حافظ عالم نے علامہ صاحب کی کافی غلطیاں نکالیں۔ حاجی صاحب بھی نماز میں شریک ہوتے تھے۔ ایک روز تو علامہ صاحب اپنے والد کے سامنے رو پڑے کہ ماموں نے غلط لقمے دیئے ہیں۔ استاد کی غلطی نکالنا حاجی صاحب کے مزاج کے خلاف تھا اور استاد بھی حافظ محمد عالم جیسے پختہ حافظ۔ حاجی صاحب نے اپنے بیٹے کو ہی ڈانٹا اور ایک لگا بھی دی کہ تم نے دور صحیح نہیں کیا۔ اگر دھیان سے دور کرتے تو اس طرح غلطیاں تو نہ کرتے۔ علامہ صاحب دور کے دوران ادھر ادھر دیکھتے۔ جس طرح شرارتی بچوں کا وتیرہ ہوتا ہے کہ تمام تر ذہانت کے باوجود وہ سبق پر دھیان کم دیتے ہیں اور دھیان دیں بھی تو ان کی شرارتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ علامہ صاحب کی انہی شرارتوں اور لاپرواہی کے ساتھ دور جاری تھا۔ ایک روز شیخ منیر نے علامہ صاحب کو دو تین تھپڑ لگائے کہ تم توجہ سے کیوں نہیں پڑھ رہے۔ علامہ صاحب اپنے والد کے پاس چلے گئے اور شیخ منیر کی شکایت لگائی۔ لیکن وہاں کیا اثر ہونا تھا۔ شیخ صاحب کی زجر و توبیخ بھی تو

حاجی ظہور الٰہی کی ہدایت پر عمل کا نتیجہ ہی تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بھی شیخ صاحب کے عمل کی ''توثیق'' فرمائی اور اپنے صاحب زادے کو ڈانٹا کہ تم دھیان سے سبق نہیں پڑھ رہے ہو گے، اس لیے منیر نے تمھیں مارا ہے۔ شیخ منیر کہتے ہیں کہ علامہ بہت تیز قرآن پڑھتے تھے۔ میں بھی کہتا اور حاجی صاحب جب سنتے تو وہ بھی کہتے کہ آہستہ پڑھا کرو۔ کچھ روز تو آہستہ پڑھتے اور پھر وہی تیزیاں۔'' [1]

پہلا مصلّٰی

احمد پورہ کی مسجد اہل حدیث، کہ جس کو ''مسجد شیخاں والی'' بھی کہا جاتا ہے، میں علامہ شہید نے حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد پہلی مرتبہ نماز تراویح کی امامت کروائی۔ اس مسجد کو ''شیخاں والی'' احمد پورہ میں کثرت سے آباد شیخ برادری کے سبب کہا جاتا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس مسجد کی تعمیر میں بھی اس برادری کی تحریک اور شوق کا دخل تھا۔ 1922ء میں اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس مسجد کو بنانے کا سبب بھی دل چسپ تھا کہ قریبی محلے کی ''مسجد علامہ یعقوب والی'' میں یہ لوگ نماز ادا کرنے جاتے۔ ''وہابیوں'' کے اس آنے جانے کی وجہ سے مستقل لڑائی جھگڑا رہتا۔ حتیٰ کہ ایک روز غصے میں آ کر اس مسجد کی انتظامیہ نے ان صفوں کو آگ لگا دی جن پر ان وہابیوں نے نماز ادا کی تھی۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ اپنی مسجد ہی بنا لینی چاہیے۔ اس طرح وہاں مسجد اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا۔

لڑکپن کی یادیں

پروفیسر مشتاق اپنے ان دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جب علامہ نے حفظ مکمل کر لیا تو فوراً ہی ''مصلّٰی'' سنانا شروع کر دیا۔ دونوں دوست روزانہ ظہر کے

[1] مضمون ''الاخوۃ'' از عمر فاروق قدوسی، مئی ۲۰۱۰ء

وقت اکٹھے ہو جاتے اور قرآن کریم کا ''دور'' کرتے۔ ایک دوسرے کو سنانے کے بعد اپنی اپنی مسجد میں تراویح کے لیے جدا ہو جاتے۔ علامہ مسجد شیخاں والی میں نماز تراویح کی امامت کراتے جبکہ پروفیسر مشتاق احمد مسجد اوّل میں امامت کراتے۔ ان کا یہ معمول علامہ کے مدینہ یونیورسٹی جانے تک قائم رہا۔

سیالکوٹ کے شبینے

رمضان کے آخری عشرے میں دونوں دوست مسجدوں کی تلاش میں نکل جاتے۔ وہ اس لیے کہ جہاں کہیں شبینہ ہو رہا ہوتا، وہاں چند پارے سناتے اور کسی اگلی مسجد کی تلاش میں نکل جاتے۔ کیسی مبارک مصروفیت تھی۔ علامہ کی شہادت سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ آپ راوی روڈ ہماری مسجد (محمدی مسجد زیر انتظام جماعت غرباء اہل حدیث) میں طاق رات کو درس دینے کے لیے آئے۔ مسجد کے خطیب قاری عبدالسلام (اللہ ان کی مغفرت کرے۔ جواں سال ہی تھے کہ وفات پا گئے) علامہ سے پوچھنے لگے علامہ صاحب شبینہ جائز ہے یا نہیں؟'' علامہ کو پتہ تھا کہ وہ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ کہنے لگے ''اپنے استاد سے پوچھو''۔ پھر ہنستے ہوئے فرمایا میرے نزدیک تو اس میں کوئی حرج نہیں۔'' علامہ کو پتہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ حنیف اس کو درست نہیں جانتے۔ واپس چلیے علامہ کے بچپن کی طرف۔ علامہ نے پانچ سال پروفیسر مشتاق احمد کے ساتھ دور کیا اور شبینے تلاش کیے۔ کہا کرتے تھے ''ساڈا وی اکو ای یار اے'' علامہ سیالکوٹ میں رہ کر دوستیاں نہ پال سکے۔ حالانکہ بعد میں ان کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا اور ان میں ان کے بے تکلف دوست بھی کثرت سے تھے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

مولانا ابوالکلام آزاد جب بچے تھے تو اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر گھر کے ٹرنک ایک قطار میں رکھ کر قطار بنا کر کھیلتے۔ بہنوں سے کہتے تھے ''لاکھوں کا مجمع ہے۔ تم کھو دلی

والے مولانا صاحب آ رہے ہیں'' جن لوگوں کو قوموں کی قیادت کرنا ہوتی ہے، وہ کم پر سمجھوتا نہیں کرتے۔ بچپن سے ہی زیادہ کی ''فکر'' میں رہتے ہیں۔ علامہ بھی اپنے لڑکپن میں ایسے ہی تھے۔ مطالعے کے شوقین تھے۔ دین کی غیرت وراثت میں ملی تھی۔ ان کے لڑکپن کے دنوں میں آفندی صاحب سیالکوٹ آئے۔ بہاء اللہ کے نام نہاد صحابیوں میں یہ واحد زندہ شخص تھے اور ان کا لیکچر بہائی سنٹر میں تھا۔ آفندی صاحب نے تقریر کی۔ ابھی تقریر کا اختتام ہوا تھا کہ علامہ کھڑے ہو گئے اور آفندی سے سوال شروع کر دیئے اور تھوڑی دیر میں بہاء اللہ کے ''صحابی صاحب'' کو زچ کر کے رکھ دیا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ علامہ شہید نے کتاب ''البہائیہ'' لکھی اور یہ ان کا کمال بھی تھا اور اعزاز بھی کہ عالم اسلام کو بالعموم اور عام عرب کو بالخصوص ایران سے جنم لینے والے اس بہائی مذہب کے عقاید ونظریات اور اس کی تاریخ کا علم ہوا۔

جامعہ اسلامیہ میں

حفظ قرآن کی تکمیل ہو چکی تھی۔ کتنی ہی منزلیں سنائی جا چکیں اور کتنی ہی طے ہو چکی تھیں۔ اب حاجی ظہور الٰہی کو اپنے عہد و پیماں کا دوسرا مرحلہ طے کرنا تھا۔ یہ دینی تعلیم کا باقاعدہ حصول تھا۔ اس لیے احسان الٰہی کو مولانا اسماعیل حلیم کے پاس بھیجا گیا۔ ان سے آپ نے ابتدائی کتب پڑھیں، جن کا ذکر مولانا عبداللہ کلیم کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

> ''علامہ مرحوم نے مولانا صاحب سے الفیہ، کافیہ، شرح تہذیب اور دیگر تفاسیر و حدیث میں استفادہ کیا تھا۔ جب مولانا موصوف علامہ کے آبائی محلہ احمد پورہ سیالکوٹ کی جامع مسجد میں خطیب تھے۔'' [1]

لیکن احمد پورہ کی مسجد میں ابتدائی کتب تو پڑھی جا سکتی تھیں اعلیٰ تعلیم کا حصول خواب ہی تھا ...... اس لیے دینی تعلیم کے باقاعدہ حصول کے لیے حافظ احسان الٰہی کو

---

[1] ترجمان الحدیث، صفحہ نمبر ۱۶۰۔

جامعہ اسلامیہ ❶ گوجرانوالہ میں داخل کروا دیا گیا۔

جامعہ اسلامیہ میں ان دنوں مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی رحمہ اللہ متعلم تھے۔ جبکہ ابتدائی کتب مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ سے پڑھنا شروع کیں۔ اچھے اساتذہ کی موجودگی میں علامہ کے جوہر کھلنا شروع ہوئے اور شیخوں کے گھر میں بھی ایک عالم دین جنم لینے لگا۔ لاڈ پیار اپنی جگہ مگر تعلیم میں کوئی رعایت نہ تھی اور علامہ نے بھی اپنا وقت ضائع نہ کیا اور دل لگا کر خوب پڑھا۔ خود بیان کرتے ہیں:

> ''علم میں گہرائی پیدا کرنے کے لیے میں نے ہر فن کی ایک ایک بنیادی کتاب زبانی یاد کی ہے۔ چنانچہ نحو میں ''الفیہ'' اصول تفسیر میں ''الفوز الکبیر'' مصطلح الحدیث میں ''نخبۃ الفکر'' معانی میں ''تلخیص المفتاح'' اس طرح دیگر بنیادی کتب مجھے ازبر تھیں۔'' ❷

حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ کی بعض باتیں اور نظریات نرالے تھے۔ دل چسپ بھی ہوتے مگر دلائل کی طاقت کے ہمراہ۔ ان کا خیال تھا کہ مدرسے کے کھانے زکوۃ کے کھانے ہوتے ہیں۔ احسان الٰہی کا وہاں کیا حق ہے۔ سو اہتمام یہ کیا گیا کہ سیالکوٹ سے کھانا جانے لگا۔ احسان الٰہی کو مدرسے کا کھانا کھانے کی سختی سے ممانعت تھی۔ آج بعض دوست اور بزرگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں بلکہ ایک بزرگ نے تو اس واقعے کو مبالغہ پر محمول کر کے ماننے سے انکار کیا۔ نتیجتاً میں نے خود اس معاملے کی تحقیق کی۔ اور اس معاملے کو سچا پایا۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی۔ مولانا شمشاد سلفی جو علامہ کے مدرسہ فیلو تھے، انہوں نے کہا کہ ''بھائی ہم تو اس کھانے میں شریک ہوتے تھے۔'' علامہ کے گھر سے کھانا آتا، کپڑے آتے۔

---

❶ یہ مدرسہ حاجی محمد ابراہیم انصاری نے قائم کیا تھا۔ جن کے بیٹے عثمان ابراہیم رکن اسمبلی بھی رہ چکے ہیں۔
❷ علامہ احسان الٰہی ظہیر از قاضی محمد اسلم سیف۔

ملازم کپڑے تبدیل کروا کر پرانے ساتھ لے جاتا۔ جو لوگ حاجی ظہور الٰہی کو قریب سے جانتے تھے، ان کے لیے یہ عجیب نہ تھا۔ کیونکہ حاجی صاحب کا مزاج ایسا تھا کہ ان کے لیے یہ اہتمام مشکل نہیں تھا۔ شیخ منیر روزانہ سیالکوٹ سے کھانا لے کر آتے۔ اگر کسی روز ان کا آنا ممکن نہ ہوتا تو کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی کہ حاجی ظہور الٰہی متمول بھی تھے اور معاملہ ان کے بیٹے کا تھا کہ جسے انہوں نے اللہ کے دین کی راہ میں لگایا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حاجی کا کوئی ملازم دستیاب نہ ہوتا تو بس والے کو کھانا دے دیا جاتا۔ روزانہ کی آمد و رفت کی وجہ سے بس والے جانتے تھے کہ یہ کھانا حافظ صاحب کا ہے۔ جامعہ کلاتھ مارکیٹ گوجرانوالہ کے سامنے سڑک کے پار بس کا اڈہ تھا۔ ہمالیہ ٹرانسپورٹ، جموں کشمیر ٹرانسپورٹ، نیشنل ٹرانسپورٹ۔ یہ اس دور کی مشہور بس سروسز تھیں۔

وہاں بازار میں حاجی ظہور الٰہی کے ایک دوست حافظ محمد طفیل کی دکان تھی۔ ان کا بھی حاجی صاحب کی طرح کپڑے کا کاروبار تھا۔ بس والے ان کی دکان پر کھانا پہنچا دیتے، ورنہ شیخ منیر کھانا لاتے تو سیدھے مدرسے جاتے۔

گوجرانوالہ میں کراؤن کلاتھ مارکیٹ میں حاجی ظہور الٰہی نے کمرہ لیا ہوا تھا۔ اس کمرے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کی رہائش تھی۔ دن کے وقت وہ مدرسے ہوتے اور رات کو اپنے کمرے میں آ جاتے۔ دوسرے تیسرے روز حاجی صاحب کا بسلسلہ کاروبار گوجرانوالہ چکر لگتا تو وہ بھی یہیں ٹھہرتے۔ اس وقت حاجی صاحب کے اہل خانہ سیالکوٹ میں ہی رہائش پذیر تھے۔ پندرہ دن بعد علامہ صاحب سیالکوٹ اپنی والدہ محترمہ کی دعائیں سمیٹنے چلے جاتے۔

کچھ عرصہ بعد گوجرانوالہ سے ہی حافظ احسان الٰہی کے لیے گھر کے کھانے کا اہتمام ہو گیا۔ حاجی ظہور الٰہی نے اپنا کاروبار اور رہائش سیالکوٹ سے گوجرانوالہ منتقل کر

لی اور ملازمین کو اس سفر سے نجات مل گئی۔

جامعہ اسلامیہ میں بخاری شریف مولانا ابو البرکات احمد رحمہ اللہ سے پڑھ رہے تھے اور کلاس میں چار طالب علم تھے۔ مولانا شمشاد احمد سلفی، مولانا عبدالصمد ریالوی، مولانا بشیر کشمیری اور حافظ احسان الٰہی ظہیر۔

مولانا محمد شمشاد سلفی بیان کرتے ہیں کہ

"علامہ بلا کے ذہین طالب علم تھے۔ جس کی وجہ سے اساتذہ ان کی شوخی طبیعت سے صَرفِ نظر کرتے۔ ہم دن بھر پڑھتے رات کو شہر گردی کو نکل جاتے۔ کہیں کوئی بھی جلسہ ہوتا ہم ضرور جاتے، چاہے شیعہ کا ہو یا بریلویوں کا، علامہ ضرور سننے جاتے۔ رات کو مدرسے کی چھت پر سب دوست بیٹھ جاتے۔ محفل ادب جم جاتی۔ شعر و شاعری کا دور چلتا۔ علامہ کی فارسی زبان تب بھی بہت عمدہ تھی۔ نہ جانے اُس عمر میں انہوں نے یہ استعداد کہاں سے اور کیسے حاصل کی۔ شعبان کا مہینہ آ گیا۔ ہمارے امتحان شروع ہو گئے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ ہمارا امتحان لینے تشریف لائے۔"

گوجرانوالہ کے شب و روز

حافظ احسان الٰہی ظہیر گوجرانوالہ میں محض طالب علم بن کر نہ رہ سکے۔ بلکہ مدرسے کے فارغ اوقات میں شہر کی طرف نکل جاتے اور بہت جلد وہاں کی ادبی اور علمی مجالس کا حصہ بن گئے۔ حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی مرحوم ان دنوں کی یادیں تازیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا علامہ مرحوم سے ذاتی علاقہ ان دنوں سے ہے جب وہ گوجرانوالہ درسِ حدیث کے طالب علم تھے اور میں گوجرانوالہ جماعت اسلامی کے شفا خانوں میں بحیثیت انچارج طبیب کام کرتا تھا وہ تقریباً ہر روز بلاناغہ بعد

بسم الله الرحمن الرحيم

شهادة التخريج وسند التحصيل من الجامعة الاسلامية اهل الحديث گوجرانواله فنجاب باكستان

الحمد لله الذى هدانا لهذا وما كنا لنهتدى لولا ان هدانا الله ورفع السماء ووضع الارض احكم الكتاب
الذى فيه شفاء لكل مرض وجعل السنة بيانا لما فى الكتاب من المقصد والغرض
والصلوة والسلام على من ارسل سوة لنا فى الاقوال والافعال جعل سيرته حجة لنا فى جميع الاحوال بعثه الله
معلما وهاديا ومزكيا ومحض النجاة فى اتباعه الى ان يرفع هذا النظام واعطاه تلامذة اختارهم لصحبته واقامة دينه
والاتمام بهذا الزمام وعلى من تبعه من الصحابة الكرام والتابعين العظام والفقهاء اولى الافهام والمحدثين الاعلام
اما بعد فان الحافظ احسان الٰهى بن الحاج ظهور الٰهى المتوطن فى بلدة سيالكوٹ من پاكستان الغربى
قرء فى الجامعة الاسلامية للجمعية السلفية الواقعة فى گوجرانواله فى فنجاب باكستان الغربى

وفاز فى الامتحان فى الدرجة العالية
الفقه واصول الحديث والتفسير واصوله والعلوم الخادمة لها من الصرف والنحو والبيان والمعانى والادب من المعقول والمنطق
والفلسفة والتاريخ والجغرافية والطبعيات والسياسيات والمعاشيات وغيرها من فنون العلوم حتى صار اهلا للتعليم والتدريس
فاجزناه ونوصيه ان يتبع السلف الصحابة والتابعين فى الاعتقاد والعمل ويحسن الظن بالائمة المجتهدين
ائمة الحديث واساطين السنة وان يجتنب البدع والاهواء ويصرف اوقاته فى درس الكتاب والسنة
وندعو الله ان يوفقه للعمل بما يرضاه من القول والفعل انه جواد كريم ملك بر رحيم

توقيعات

توقيع المدرسين — توقيع رئيس المدرسين

علامہ شہیدؒ کی درس نظامی کی سند کا عکس

علامہ شہیدؒ نے عصری علوم کے حصول کا سفر ۱۹۶۰ء میں فاضل فارسی کے امتحان سے شروع کیا جو ۱۹۷۰ء تک مختلف مضامین میں ماسٹر کی ڈگریوں کے حصول تک جاری رہا۔ ان کی چند اسناد کی تصاویر

چند لمحے اقبال کے ساتھ

حافظ احسان الٰہی ظہیر

حافظ احسان الٰہی ظہیر

سعودی عرب کا انقلاب

اور — اس کا پس منظر

چٹان

زمانہ طالب علمی میں ہی علامہ شہیدؒ کے مضامین ملک کے صف اوّل کے جرائد میں شائع ہونے لگے۔ آغا شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں شائع ہونے والے چند مضامین۔ یہ تمام مضامین مدینہ یونیورسٹی کے دور میں شائع ہوئے۔ جب طالب علم کی عمر محض 23 یا 24 برس تھی۔

جامع اہل حدیث مسجد چینیانوالی کوچہ چابک سواراں لاہور میں

مولانا حافظ احسان الٰہی صاحب ظہیر سیالکوٹی فاضل مدینہ یونیورسٹی

خطبہ جمعۃ المبارک

جمعہ ۲۵ جمادی الاوّل ۱۳۸۷ ہجری

بمطابق یکم ستمبر ۱۹۶۷ء کو

ارشاد فرمائیں گے

شیخ محمد اشرف سکریٹری ٹرسٹ کمیٹی جامع اہلحدیث مسجد چینیانوالی کوچہ چابکسواراں لاہور

انجمن اہلحدیث رجسٹرڈ شادباغ لاہور نے جامع اہل حدیث شادباغ
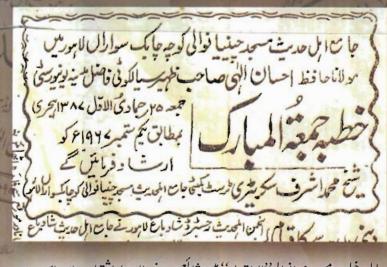
بطور خطیب مسجد چینیانوالی ''الاعتصام'' میں شائع ہونے والا پہلا اشتہار۔ علامہ اس سے پہلے دو جمعے پڑھا چکے تھے۔ یہ اشتہار ان کی تقرری پر شائع ہوا۔

نمازِ عید شہر سے باہر کھلے میدان میں

سنتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق پڑھنے کے لئے

اقبال پارک (منٹو پارک) میں وقت مقررہ پر پہنچیے!

مولانا حافظ احسان الٰہی ظہیر ایڈیٹر ''الاعتصام'' خطیب جامع مسجد چینیانوالی خطبہ عید ارشاد فرمائیں گے

نماز کا وقت } نماز ٹھیک ۸ بجے ان شاء اللہ شروع ہو جائے گی، تمام نمازیوں سے استدعا ہے کہ وقت مقررہ پر پہنچ جائیں۔ سنتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تقاضا ہے کہ نمازِ عید الاضحیٰ طلوعِ آفتاب کے بعد جلدی ادا کی جائے۔

مستورات کے لئے حسب دستور پردہ کا معقول انتظام ہوگا، مستورات سے استدعا ہے کہ چھوٹے بچوں کو ہمراہ نہ لائیں، نماز کے لئے سادہ لباس پہن کر آئیں اور خاموشی کے ساتھ خطبہ سنیں۔

تکبیراتِ عید } نماز کے لئے جاتے وقت بلند آواز سے حسب ذیل تکبیرات پڑھنی چاہئیں: اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر و للّٰہ الحمد۔ نماز کے انتظار میں جب تک بیٹھے رہیں ذکر الٰہی، فکر آخرت، درود شریف اور استغفار میں مصروف رہیں اور لایعنی باتوں سے پرہیز کریں۔

لاؤڈ سپیکر: عیدگاہ میں لاؤڈ سپیکر کا وسیع انتظام ہوگا، ہر نمازی اپنی اپنی جگہ خطبہ سن سکے گا، اسلئے نماز کے بعد اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں اور توجہ سے خطبہ سنیں۔

قربانی کی کھالیں } آپ کو معلوم ہے کہ ٹرسٹ کمیٹی مسجد چینیانوالی کے زیر اہتمام مختلف ادارے چل رہے ہیں جن کے ماہانہ اخراجات ہزاروں روپے ہیں، ان میں سے ایک مدرسہ حفظ القرآن و الحدیث ہے جس میں اس وقت مقامی طلباء کے علاوہ بیس بیرونی طلباء بھی زیر تعلیم ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو تیس تیس روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اتنے بڑے اخراجات تنہا ایک کمیٹی اس وقت تک پورے نہیں کر سکتی جب تک آپ کا پورا پورا تعاون حاصل نہ ہو، اس لئے آپ سے اپیل کی جاتی ہے کہ آپ اپنی قربانی کی کھالیں مدرسہ مسجد چینیانوالی کے طلباء کے اخراجات کے لئے دے کر اجر دارین حاصل کریں۔

قربانی کی کھالیں ٹرسٹ کمیٹی کے دفتر مسجد چینیانوالی کوچہ چابکسواراں لاہور کے علاوہ مندرجہ ذیل مقامات پر جمع کر کے ثواب دارین حاصل کریں

(۱) میاں عبدالکریم صاحب صدر ٹرسٹ کمیٹی ۵۴۲ اکاؤنٹنگ انڈین لوہاری گیٹ لاہور۔ (۲) شیخ محمد اشرف سکریٹری ۳۰ وارث روڈ لاہور۔ (۳) شیخ شجاع الدین صاحب مرحوم ۵۷/۲ شادباغ لاہور۔ (۴) حکیم عبدالغفور صاحب فنانشل سکریٹری ۱۵۲ حویلی کابلی مل لاہور (۵) قاضی عبدالحمید صاحب کا چھو پورہ لاہور۔ (۶) بابو محمد بشیر صاحب بی۔ اے نمبر ۴۹/۱۲۹ اندرون موچی گیٹ لاہور (۷) چوہدری عبدالرشید اکبری منڈی حویلی مصر الوالی لاہور۔ (۸) حاجی محمد اسحاق حنیف گاندھی سکوئر لاہور۔

الداعی الی الخیر

شیخ محمد اشرف سکریٹری ٹرسٹ کمیٹی مسجد چینیانوالی کوچہ چابکسواراں ..... لاہور

لاہور آمد پر منٹو پارک میں نماز کے اجتماع کا اشتہار جس کی امامت و خطابت آپ نے کی اور ایوب خان کے خلاف تحریک میں آپ کے اس خطبے نے آپ کو صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا۔

الاعتصام

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی

نویں سالانہ عظیم الشان کانفرنس

باغ بیرون موچی گیٹ ـــــ لاہور

اندریں حالات

شعبہ نشرو اشاعت مرکزی جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان

ور مدیر "الاعتصام" پہلا
ارہ۔ اگرچہ اس سے پہلے
و شمارے بھی علامہ شہید
نے مرتب کیے تھے، ان
کے اداریے پر علامہ شہید کا
نام درج ہے۔

اللہ نزل احسن الحدیث

مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان

ہفت روزہ

اہلحدیث لاہور

ایڈیٹر

احسان الٰہی ظہیر ایم۔ اے

جلد ۱ | ۱۴ ذی قعدہ ۱۳۸۹ – جمعۃ المبارک – ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء | شمارہ ۱

سالانہ چندہ آٹھ روپے فی پرچہ بیس پیسے

الاعتصام کی واپسی پر جمعیت اہل حدیث نے اپنے پرچے "اہلحدیث" کا اجرا کیا۔ اس کے پہلے مدیر علامہ شہید مقرر ہوئے۔

علامہ شہید کے ذاتی مجلّے
''ترجمان الحدیث'' کا
آغاز 1969ء میں ہوا۔
اس کا سرورق

''الاسلام'' علامہ شہید کی
جمعیت اہلحدیث کا ترجمان
پرچہ تھا۔اس کا سرورق

لاہور میں آمد کے بعد علامہ شہیدؒ نے عملی زندگی کا آغاز شیخ محمد اشرفؒ کی ملکیت اس تاریخی عمارت حدیث منزل سے کیا، ادارہ ترجمان السنۃ کا دفتر بھی یہیں تھا اور ماہنامہ ترجمان الحدیث کا آغاز اسی عمارت سے کیا گیا۔علاوہ ازیں مکتبہ قدوسیہ جو کہ کشمیری بازار میں تھا اردو بازار منتقلی سے قبل کچھ دن یہاں بھی رہا۔

ادارہ ''ترجمان السنہ'' کے زیراہتمام شائع ہونے والی چند ابتدائی کتب

1974ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ''الاعتصام'' کا شائع ہونے والا خاص نمبر۔ اس کے سرورق پر میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسیؒ کی عربی نظم شائع ہوئی۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
جمعیت اہلحدیث کے رہنما علامہ احسان الٰہی ظہیر پر قاتلانہ حملہ کی ناکام کوشش
علامہ یوسف کلکتوی انتقال فرما گئے
پاکستان آمد پر علامہ کی جرأت مند تحریروں اور تقاریر نے ان کے
لیے خطرات کے دروازے کھول دیے۔ لیکن آپ کی فطری جرأت
نے آپ کو رکنے نہ دیا اور آپ آگے ہی بڑھتے گئے یہاں تک کہ
شہادت کو گلے لگالیا۔
نوائے وقت
علامہ احسان الٰہی ظہیر انتقال کر گئے
ریاض کے شاہ فیصل ہسپتال میں ٹانگ کا آپریشن کامیاب نہ ہو سکا، مرحوم کی جان بچانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں
علامہ احسان الٰہی ظہیر انتقال کر گئے

KINGDOM OF SAUDI ARABIA
THE PRESIDENCY OF ISLAMIC RESEARCHES AND IFTA
OFFICE OF THE GRAND MUFTI

المملكة العربية السعودية
رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء
مكتب المفتي العام للمملكة

عدد ٢٦٧

٢٠٦٨/ص

إلى حضرة الأخ الكريم علي موسى الزهراني سلمه الله

وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته. وبعده صاحب الفضيلة الشيخ إحسان إلهي ظهير رحمه الله معروف لدينا وصحيح العقيدة وقد قرأت بعض كتبه فسرني ما تضمنته من النصح له ولعباده والرد على خصوم الإسلام.. وأسأل الله أن يضاعف مثوبته وأن يتغمدنا وإياه بالرحمة إنه سميع قريب والسلام.

المفتي ١٤٠٩/٤/٢٠

الشیخ ابن بازؒ کے علامہ شہیدؒ کے بارے میں تاثرات

		الاسم	الرقم
	[illegible]	[illegible]	
-	ممتاز	مهذب حسن عبد [illegible]	١
-	ممتاز	[illegible]	٢
	جيد جدا	محمد ابراهيم [illegible]	٣
-	جيد جدا	عبد الله [illegible]	٤
	مقبول	محمد قاسم [illegible]	٦
-	مقبول	محمد يوسف [illegible]	٧
-	مقبول	بشير الجوهري	٨
٨٧/٨٦	ممتاز	حافظ احسان الهي	٩
-	جيد	حبيب الله بن محمد وزير	١٠
	مقبول	غلام قادر محمد	١١
٨٨/٨٧	ممتاز	حافظ عبد الله بن منشي مبارك	١٢
-	ممتاز	[illegible]	١٣
-	جيد جدا	عبد الله مراد علي	١٤
-	جيد جدا	محمد [illegible]	١٥
-	جيد جدا	عبد السلام الحافظ كيلاني	١٦
-	جيد جدا	حافظ ابو الطيب [illegible]	١٧
-	جيد جدا	محمد لطف الله عبد القيوم	١٨
٨٩/٨٨	ممتاز	صلاح الدين [illegible]	١٩
-	ممتاز	[illegible] الله [illegible]	٢٠

هذا كشف لخريجي الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة وفيه يظهر اسم الشيخ إحسان رقم (٩) في التسلسل وقد أخذ ممتاز، حيا تخرج عام ٨٦/٨٧ من كلية الشريعة.

مدینہ یونیورسٹی کے ایک امتحان کی رزلٹ شیٹ

۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء آخری جلسے کا دعوت نامہ

نماز عصر محلہ نور باوا گلی نمبر ۵ میں میرے پاس تشریف لاتے۔ علامہ مرحوم ان دنوں سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان تھے۔ البتہ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کی یہ غیر نصابی سرگرمیاں بھی علمی و دینی اور ادبی موضوعات سے متعلقہ تھیں۔ مسلک اہل حدیث کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ جب وہ مسلک اہل حدیث کے موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے تو مجھے ان کی سوچ کا اندازہ ہوتا وہ اس بات پر کبیدہ خاطر ہوتے کہ اہل حدیث سلفی العقائد ہونے کے باوجود آج اپنی انفرادیت و تشخص کو گم کر بیٹھے ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں دوسری تنظیموں میں شامل ہو کر ان کے مقاصد کی تقویت کا سبب بن رہے ہیں اور انفرادی رول باقی نہیں رہا۔ وہ جماعت کے تشخص کو بحال کرنے کے حق میں تھے الغرض روز محفل ہوتی اس حوالے سے تبادلہ خیال رہتا مجھے اندازہ ہوتا کہ یہ نوجوان اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے یقیناً ایک روز اس خلا کو پر کرے گا۔ انہی دنوں ایک ہفتہ وار علمی و ادبی نشست ڈاکٹر اسحاق جاوید کی رہائش گاہ پر منعقد ہوتی جو بعد میں ماڈل ہائی سکول گوجرانوالہ منتقل ہو گئی ماڈل سکول کی اس نشست میں علامہ مرحوم میرے ساتھ جانا شروع ہوئے اس نشست میں اس وقت کے مقامی نامور شعراء اور ادباء سبط الحسن ضیغم، ڈاکٹر رفیق چودھری، بشیر انصاری، راز کاشمیری، پروفیسر اسرار احمد، میاں ایم آئی شمیم، علامہ یعقوب انور اور ارشد مہر ایسے لوگ ہوتے۔ اگرچہ علامہ ابھی نوجوان تھے تاہم اپنی سوجھ بوجھ اور وسعت مطالعہ کی بنا پر جلد ہی اپنا مقام بنا لیا ان کی ٹھوس تنقید و دلائل پر حاضرین پوری توجہ دیتے اس طرح اپنی انفرادیت کو جلد منوالیا۔'' [1]

حکیم راحت نسیم سوہدروی کی اس تحریر کو آپ نے پڑھا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ محض سندھ، اٹھارہ برس کی عمر میں علامہ کی سوچ اہل حدیث جماعت کے بیے کیسی قائدانہ انداز فکر لیے ہوئے تھی اور حکیم صاحب کا گمان کہ یہ نوجوان ایک روز قیادت کے اس خط کو پورا کرے گا، درست ثابت ہوا۔

حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کے زیر سایہ

حافظ احسان الٰہی جامعہ اسلامیہ سے فراغت کے بعد حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کے پاس چلے گئے جو ان دنوں جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں مسند تدریس پہ فائز تھے۔

حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ اپنے زمانے کے امام تھے۔ عظیم محدث تھے۔ ستر سال بخاری شریف پڑھائی۔ میرے والد محترم کے بھی استاد تھے۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ آج پنجاب کا کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کا براہ راست یا بالواسطہ شاگرد نہیں۔ آپ کے علمی مقام و مرتبے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے مدینہ یونیورسٹی کو چھوڑا تو ان کی جگہ حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کا انتخاب کیا گیا۔

آپ کے بارے میں علامہ نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ ''روئے ارض پہ آج تک میں نے حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ ان کی کسی کتاب کا نام بتاؤ تو میں نے کہا تھا کہ ''کسی بڑی کتاب کو چھوڑو مجھ کو دیکھ لو کہ میں ان کی ایک چھوٹی سی کتاب ہوں۔''

حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ نے آپ پر خصوصی توجہ کی۔ حافظ احسان الٰہی کی اقبال مندی کو زیرک استاد نے بھانپ لیا۔ ایک روز حافظ محمد گوندلوی گھر آئے اور اپنی اہلیہ محترمہ سے کہنے لگے:

''میرا شاگرد احسان الٰہی جب چلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس کے گناہ جھڑ

1 ترجمان الحدیث، ص:۱۲۶۔

رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اتنی کم عمری میں اس طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے کہ آج تک ایسے نہیں دیکھا۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ آفتاب کی مانند ایک روز دنیا میں بلند اور روشن ہوگا۔"

پھر جامعہ سلفیہ میں مولانا شریف اللہ خان رحمہ اللہ بھی موجود تھے جو معقولات اور منقولات میں اپنے دور کے امام تھے۔ میرے والد مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ بھی ان سے فیض یاب تھے۔

سیالکوٹ واپسی

جامعہ سلفیہ میں علامہ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکے اور واپس چلے آئے۔ بظاہر تعلیم مکمل ہوگئی۔ حاجی ظہور الٰہی نے جو وعدہ اللہ تعالیٰ سے کیا تھا، دونوں صورتوں میں مکمل کر دیا۔ بیٹا قرآن کا بہترین حافظ تھا اور عالم دین بھی بن گیا تھا۔ احسان الٰہی سیالکوٹ واپس آ گئے۔ فرصت کے دن تھے لیکن زندگی کا دوراہا آن پہنچا تھا۔

کچھ روز دکان داری میں

جب حافظ احسان الٰہی جامعہ سلفیہ سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد سیالکوٹ واپس آئے تو ان دنوں ان کے دادا احمد دین کی مرکزی بازار میں کپڑے کی دکان تھی۔ جب کہ ان کے والد حاجی ظہور الٰہی کی علیحدہ دکان تھی، جو مرکزی بازار سے ذرا ہٹ کر بازار زرگراں میں واقع تھی۔ حافظ احسان الٰہی نے چند روزہ فرصت کے ان دنوں کو بھی غنیمت سمجھا اور دکان پر جانا شروع کر دیا۔ ذہین تو بلا کے تھے ہی کاروباری شیخ خاندان بھی تھا۔ علم کی دولت بھی آ چکی تھی۔ اس فن سہ آتشہ نے کاروبار میں نظر تو آنا تھا۔ لوگوں کی زبان پر آنے لگا کہ حاجی ظہور الٰہی کے بیٹے کے پاس آیا گاہک واپس نہیں جاتا مگر یہ دکان داری راستے کی ایک سرائے تو تھی، آپ کی منزل نہ تھی۔

دن بدلنے کو تھے

دن بھر کی دکان داری سے فرصت پاتے تو دوستوں میں آ بیٹھتے۔ دیر تک اخبار دیکھتے۔ لیڈروں کی تصاویر دیر تک تکتے رہتے کہ جیسے اس میں سے کچھ نکالنا ہے۔ جون ایلیا نے کہا ہے:

آسمان کو تکتے رہتے ہو
آسمان میں کوئی رہتا ہے کیا

ایک روز (پروفیسر) مشتاق احمد اکتا کے بولے ''یار یہ تم کیا ہر وقت ان تصاویر اور خبروں میں الجھے رہتے ہو۔'' حافظ احسان الٰہی کی نظریں دور آسمان پر تھیں۔ کہنے لگے:

''یار میرا دل چاہتا ہے کہ ساری دنیا اہل حدیث ہو جائے۔''

اور پھر؟ دوست نے پوچھا:

''پھر کیا؟''

''پھر میں ان کا بادشاہ بن جاؤں''

یہ محض بچپن کی خواہش نہ تھی کہ ایک روز بات منہ سے نکل گئی، بلکہ ان کو بڑا آدمی بننے کا شوق تھا۔ دار العلوم شہابیہ کے مولانا محمد علی کاندھلوی کہتے تھے کہ ''بڑا بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ بندے کو ایسا بننے کی خواہش بھی ہو اور میں دیکھتا ہوں کہ اس لڑکے میں یہ خواہش بدرجہا اتم موجود ہے۔'' [1] یہ خواہش حافظ احسان الٰہی کو آگے لیے جا رہی تھی۔ اب ان کے دوست بھی ساتھ دینے کو تیار تھے۔ حافظ احسان الٰہی ہر نوع کے افراد سے تعلقات بناتے جا رہے تھے۔ کبھی اس پریس پر جا بیٹھتے جہاں ان دنوں حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتب شائع ہوتیں اور کبھی اس دور کے نیوز ایجنسی کے مالک ملک امتیاز سے یارانہ لگا لیا۔ آخر کو ایک روز حافظ احسان الٰہی اور ان کے دوستوں کے ذہن میں ''آئیڈیا''

[1] علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ جاوید جمال ڈسکہ۔

آیا کہ کوئی تنظیم ہونی چاہیے۔ روشنی کا کوندا تھا جو لپکا اور احسان الٰہی لیڈری کے راستے پر چل نکلے۔ ایک ایسا راستہ جس کی آخری منزل شہادت تھی لیکن وہ اس سے بے خبر تھے۔

وفاق العلماء سیالکوٹ

جی ہاں آئیڈیا یہ تھا کہ تمام مکاتب فکر کے علماء کو اکٹھا کر کے ایک تنظیم بنائی جائے جس کا نام ''وفاق العلماء سیالکوٹ'' رکھا جائے۔ علماء سے رابطے شروع کر دیئے گئے۔ ایک روز سارے علماء اکٹھے ہوئے اور اغراض و مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد انتخاب کا مرحلہ آیا۔ صدر کا انتخاب پہلے ہونا تھا اور صدارت مقصود و مطلوب مومن نہیں تھی۔ سو ایک صاحب خود سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور حنفی مسلک کے اسی دور کے سیالکوٹ کی سطح کے معروف عالم (مولانا) محمد یوسف کا نام پیش کر دیا۔ کسی نے اختلاف نہ کیا اور وہ منتخب ہو گئے۔ اب دوسرا عہدہ سیکرٹری جنرل کا تھا۔ اس کے انتخاب کی آواز آئی تو پروفیسر مشتاق احمد تیزی سے کھڑے ہو کر بولے ''میں اس کے لیے'' حافظ احسان الٰہی ظہیر'' کا نام پیش کرتا ہوں۔'' اختلاف کس نے کرنا تھا کہ تنظیم کا ''آئیڈیا'' پیش کرنے والے آپ لوگ ہی تھے۔ اس روز لوگوں کو پتہ چل گیا کہ حاجی ظہور الٰہی کا بیٹا حافظ احسان الٰہی اب حافظ احسان الٰہی ''ظہیر'' ہے۔ یہ حافظ احسان الٰہی ظہیر کی سیاست کا نکتہ آغاز تھا۔

اخبار کی پہلی خبر

اب فکر ہوئی کہ اس تنظیم کے قیام کی خبر اخبار میں بھی آنی چاہیے۔ خبر بنائی گئی اور دوست مل کر ملک امتیاز کے پاس چلے گئے۔ جو ان دنوں سیالکوٹ میں بعض اخبارات کے نمائندے بھی تھے۔ خبر ریلیز کر دی گئی۔ اگلے روز وہ احسان الٰہی جو دیر تک اخبارات کے مطالعے میں غرق رہتے، ان کی چھوٹی سی خبر بھی اخبار میں موجود تھی۔ بس جی اب حاجی ظہور الٰہی کے بیٹے حافظ احسان الٰہی اخباری لیڈر بھی بن گئے تھے۔ دیکھئے وقت وقت کی بات ہے۔ جب علامہ احسان الٰہی ظہیر کا سانحہ شہادت رونما ہوا تو تمام اخبارات

کا پہلا صفحہ انہی کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر

خبر تو شائع ہوگئی پر مزہ نہ آیا۔ حافظ احسان الٰہی کو تو شاید آیا ہو لیکن پروفیسر مشتاق کو نہ آیا۔ کہنے لگے "یار کوئی سابقہ لاحقہ تو ہونا چاہیے نا" پھر خود ہی اگلی خبر بنائی جس پر اضافہ تھا "علامہ احسان الٰہی ظہیر نے یوں کہا۔" اسی طرح ایک دوست کے ہاتھوں سب سے پہلے علامہ کہلائے۔ اور پھر بات یہاں تک پہنچی کہ پاکستان کے صف اول کے صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی کے بقول کم از کم "پنجاب میں جب یوں کہا جاتا کہ علامہ صاحب تو اس سے مراد احسان الٰہی ظہیر ہی ہوتے۔"

اگلی خبر بھی جاری کر دی گئی لیکن اخباری نمائندے ملک امتیاز نے ایک اضافہ اپنی طرف سے بھی کر دیا۔ جب اگلی خبر اخبار میں شائع ہوئی تو عنوان یوں تھا "ممتاز عالم دین علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کہا......۔" اب اخبار تھامے سارے دوست "انجوائے" کر رہے تھے اور لفظ "ممتاز عالم دین" پر تبصرے جاری تھے۔

اب آخر میں نکتے کی بات کہوں کہ یہ سارا کچھ جب ہو رہا تھا علامہ کی عمر محض بیس برس تھی اور وہ ایک عام کاروباری آدمی کے بیٹے تھے۔ تعلیم و تعلم کا خاندانی پس منظر تھا نہ ہی سیاسی۔

علامہ کی پٹائی ہوگئی

پھوپھو حمیدہ بتاتی ہیں کہ غضب تو اس روز ہوا جب ایک اخبار میں علامہ باتصویر مسکرا رہے تھے اور کسی ستم ظریف نے حاجی ظہور الٰہی صاحب کے حضور وہ اخبار بمعہ مرچ مسالہ بلکہ بارہ مسالوں کے ساتھ پیش کر دی۔ یہ تو بہت بڑی جسارت تھی اور سراسر حاجی صاحب کے نظریات کے خلاف تھی۔ اس خبر پر علامہ کی پٹائی ہوگئی۔ لیکن غالب نے کہا: ؏

رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

سب کچھ کر جانے کی تمنا

ان دنوں حافظ صاحب شعروشاعری سے بھی شغف کر رہے تھے جیسے کہ بہت جلد بہت کچھ کر جانے کی تمنا رہی ہو۔ پروفیسر مشتاق ان دنوں کا ایک شعر جو علامہ نے کہا، سنا رہے تھے۔

ہم نے تو دن شباب کے یونہی گنوا دیئے
جیسے کہ چند حرف غلط تھے، مٹا دیئے

جب میں یہ سطور لکھنے بیٹھا تو میرے مکتبہ پر قاضی مقبول احمد تشریف لائے جو علامہ کے ساتھی تھے، میں نے انہیں یہ شعر سنایا تو انہوں نے بے ساختہ کہا ”شباب میں ہی تو چلے گئے تھے۔“

فاضل اردو، عربی، فارسی کی ڈگریاں

جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں حصولِ تعلیم کے دوران بھی اور فراغت سے فوراً بعد علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے تعلیمی میدان میں چند اور معرکے بھی سر کیے۔ آپ نے 1960ء میں فاضل فارسی کا امتحان دیا اور ڈگری حاصل کی اور اس وجہ سے مولانا شمشاد سلفی کہتے ہیں کہ جامعہ اسلامیہ کے دنوں میں ہی علامہ کی فارسی زبان بہت عمدہ تھی۔ بر سبیل تذکرہ بتاتا چلوں کہ علامہ شہید کی اہلیہ مرحومہ کی بھی فارسی زبان پر عمدہ گرفت تھی اور کبھی کبھی ضرورتاً میاں بیوی آپس میں فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں ایسے موقعوں پر میاں بیوی بے چارے اشاروں میں بات کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ 1961ء میں علامہ شہید نے فاضل اردو کا امتحان پاس کیا۔ جب کہ 1962ء میں فاضل عربی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اسی طرح 1962ء کے اختتام کے ساتھ ہی علامہ اکیس سال کی عمر میں درس نظامی سے فراغت کے ساتھ ساتھ ہی مذکورہ بالا تین اہم امتحانات پاس کر چکے تھے اور اب آگے کی سوچ رہے تھے۔

جس کا اندر تاریک ہو دنیا کا کوئی دیا اس کے باطن کو روشن نہیں بنا سکتا اور جس کا اندر روشن ہو اس کو تمہارے ٹمٹماتے ہوئے دیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔[حرمین کانفرنس]

مدینہ یونیورسٹی میں

مزہ نہیں آ رہا تھا۔ یہاں پاکستان میں رہتے ہوئے جو ہو سکتا تھا وہ تو حافظ احسان الٰہی ظہیر نے کر لیا تھا۔ کچھ مزید ہونا چاہیے، کہیں آگے کی جستجو تھی۔ ان دنوں بہت ہی محدود تعداد میں طالب علم مدینہ یونیورسٹی جانے لگے تھے۔ لیکن کوئی ایسا شور نہیں اٹھا تھا۔ البتہ مدارس کے طالب علموں میں اس کا شہرہ ہو رہا تھا۔ جامعہ سلفیہ اور ایک آدھ مدرسے کا مدینہ یونیورسٹی سے معادلہ طے پا چکا تھا اور باقاعدہ طالب علم جانا شروع ہو چکے تھے۔ 1962ء میں جامعہ سلفیہ سے جو طالب علم چنے گئے اور ان کا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوا ان میں میرے والد مکرم مولانا عبدالخالق قدوسی بھی شامل تھے۔ لیکن ان کے استاد محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ان کے گوجرانوالہ آنے پر اصرار کیا اور وہ اس حکم کو ٹال نہ سکے اور مدینہ یونیورسٹی جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ 1963ء میں مدینہ یونیورسٹی کے لیے جن طالب علموں نے پاکستان سے جانا تھا، جا چکے تھے۔ داخلے کا عمل مکمل ہو چکا تھا کہ حافظ احسان الٰہی ظہیر نے مدینہ یونیورسٹی داخلے کی ٹھان لی۔ ویزا لگوایا اور براستہ سڑک ہی سعودی عرب کے لیے چل نکلے۔ ایران اور شام سے ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچ گئے۔

حافظ احسان الٰہی ظہیر مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور اس فکر میں تھے کہ کیسے داخلہ ملے کیونکہ سیشن شروع ہو چکا تھا اور داخلے بند ہو گئے تھے۔ایک صاحب نے امید دلائی تھی مگر یہ امید بر نہ آئی الٹا ان کا رویہ حوصلہ شکن تھا۔ جب کہ پاکستان آمد پر انہوں نے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ ذرا مایوسی کا عالم تھا مگر احسان الٰہی مایوس نہ تھے۔کسی صورت شیخ ابن باز رحمہ اللہ سے ملنے کی سبیل نکالی۔ پہلی ہی ملاقات میں دل موہ لیا۔شیخ اس پاکستانی نوجوان سے متاثر ہوئے اور ان کو داخلے کا اہل قرار دے دیا اور یوں حافظ احسان الٰہی ظہیر کا مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔

حافظ محمد سلفی حفظہ اللہ جو یونیورسٹی میں پہلے سے زیر تعلیم تھے اور آج کل جامعہ ستاریہ کراچی کے پرنسپل ہیں اور شیخ الحدیث مولانا عبدالستار صاحب دہلوی امیر جماعت غرباء اہل حدیث کے پوتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ ”ایک بات عجیب ہے کہ اس وقت بھی علامہ احسان الٰہی ظہیر بہت عمدہ اور مضبوط لہجے میں عربی بولتے تھے۔جبکہ یہ ان کی سعودی عرب پہلی آمد تھی۔“

شیخ بن باز رحمہ اللہ نے علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے داخلے کا کیس ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ اس سے آگے کی کارروائی جامعہ لاہور الاسلامیہ کے مدیر جناب عبدالرحمن مدنی نے بیان کی۔ انہوں نے اپریل 1997ء میں جناح ہال لاہور میں تقریر کرتے ہوئے علامہ کے متعلق کہا کہ:

”میں جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) سعودی عرب میں پڑھ رہا تھا جب حافظ احسان الٰہی ظہیر مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے آئے۔ وہاں کسی پاکستانی کو A سیکشن میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ بلکہ D یا C سیکشن میں ہی داخلہ ملتا تھا۔ان دنوں مدینہ یونیورسٹی کا پوری دنیا میں نام تھا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر کو بھی انتظامیہ نے B گروپ میں داخلہ دیا لیکن علامہ نے

کہا کہ میں B گروپ میں داخلہ نہیں لوں گا کیونکہ اس سے "پاکستانیت" کی توہین ہوتی ہے کہ وہاں ٹیلنٹ نہیں۔ چنانچہ علامہ صاحب نے کہا "میرا انٹرویو کیا جائے اگر میں انٹرویو میں کامیاب ہو گیا تو مجھے A سیکشن میں داخلہ دے دیا جائے ورنہ میں یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لوں گا۔ ان دنوں مدینہ یونیورسٹی کا معیار بہت بلند تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کا بورڈ تشکیل دیا گیا۔ انٹرویو کے بعد علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کو اپنی علمی قابلیت اور لیاقت کی بنا پر A سیکشن میں داخلہ دیا گیا۔ وہ واحد اور پہلے پاکستانی تھے۔ جن کو ان کی قابلیت کی بنا پر A گروپ میں داخلہ دیا گیا۔"[1]

اس طرح حافظ احسان الٰہی ظہیر کے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کا عمل مکمل ہوا۔ یہ سارا واقعہ 1963ء کا ہے۔

مدینہ یونیورسٹی میں علامہ کے اساتذہ

مدینہ یونیورسٹی میں ان دنوں تعلیم کا نہایت اعلیٰ اور ارفع ماحول تھا اور کیوں نہ ہوتا طالب علموں پر نظر کریں تو کتنے بلند بلند نام نظر آتے ہیں اور اساتذہ پر نگاہ دوڑائیں تو وہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک۔

۱۔ شیخ محمد امین شنقیطی
۲۔ شیخ ناصر الدین البانی
۳۔ شیخ محمد عبد الوہاب البنا
۴۔ شیخ عطیہ محمد سالم
۵۔ شیخ ابوبکر جابر الجزائری
۶۔ شیخ عبد اللہ بن عبد العزیز بن باز

[1] الاخوۃ، لاہور۔ مقالہ از عبد القیوم ظہیر۔

یہ نامور شیوخ علامہ کی مدینہ یونیورسٹی میں استاد تھے۔ان بزرگان کا تفصیل تعارف آپ آگے اساتذہ کے باب میں پڑھیں گے۔

تعلیم کا آغاز

ان نامور اساتذہ کی راہنمائی میں حافظ احسان الٰہی ظہیر کی نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔آپ گوجرانوالہ اور فیصل آباد کے تعلیمی ماحول سے نکل کر ایک بالکل مختلف ماحول میں آ چکے تھے۔ جہاں دنیا بھر کے ذہین افراد کا اجتماع تھا۔ایسے میں احسان الٰہی ظہیر کو اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے کا اور دکھانے کا شاندار موقع میسر آیا۔حافظ محمد سلفی صاحبکراچی سے لاہور تشریف لائے تو میں نے ان سے ملاقات کا وقت لیا۔ان سے ان دنوں کی یادیں تازہ کرنے کی فرمائش کی۔وہ بہت خوش ہوئے اور ماضی کے دریچوں کو وا کرنے لگے۔حافظ محمد سلفی بیان کرتے ہیں کہ

"ان دنوں میں سینئر ہونے کے ناطے غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے طلباء کا گروپ لیڈر تھا اور طلباء کی شیوخ سے ملاقاتیں، پکنک، سیر و تفریح، مطالعاتی دورے وغیرہ کے پروگرام میں ہی طے کرتا تھا۔"

"خدمت کرتے نہیں تھے البتہ خدمت لیتے ضرور تھے۔" حافظ صاحب نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ پیدائشی لیڈر تھے۔" میں نے گرہ لگائی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حافظ احسان الٰہی ظہیر نے بعد میں دن دیکھا نہ رات، اپنی جماعت کی اور کارکنوں کی ایسی خدمت کی کہ جان تک دے دی۔ حافظ محمد سلفی فرما رہے تھے کہ

"جس دن برتن دھونے کی ان کی باری ہوتی وہ دن احسان کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ چپکے سے غائب ہو جاتے۔لیکن اتنے وضع دار ضرور تھے، اس روز کھانا بھی نہ کھاتے۔"

آپ بتا رہے تھے کہ علامہ صاحب ان دنوں بھی بہت چاق و چوبند، چست و چالاک اور صحت مند تھے۔ کھانے پینے کے شوقین اور جرأت والے تھے۔ ان کے اندر ذرا بھی جھجک نہ ہوتی۔ عمدہ عربی بولتے۔ گاہے غلطی بھی کر جاتے کہ ابتدائی دور تھا لیکن ان کو اس کی مطلق پروا نہ ہوتی۔ ڈر کے اور دب کے بات نہ کرتے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ علامہ جب سعودی عرب جاتے تو عرب استاد ان کے لیکچر یہ کہتے ہوئے سنتے کہ ''استاذ احسان کی زبان ایسی عمدہ اور فصیح و بلیغ ہے کہ ہم اس کو سن کر اپنی اصلاح کرتے ہیں۔''

مدینہ یونیورسٹی کا ایک یادگار محاضرہ

دنیا بھر کی جامعات اپنے ہاں اہل علم کو مدعو کرتی رہتی ہیں تاکہ طالب علم ان کے لیکچرز سن کر اپنے علم کی پیاس بجھائیں اور ان کی فکر و دانش سے اپنے اذہان کو منور کریں۔ مدینہ یونیورسٹی میں بھی اہل علم کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس دور میں ڈاکٹر حمید اللہ، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر علماء آتے رہتے تھے۔ ایک بار دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب مدینہ یونیورسٹی تشریف لائے۔ قاری صاحب نے سعودیہ جا کر نسبتاً مختلف طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کی اور توحید اور اہل توحید سے محبت اور قربت کے تذکرے فرمائے۔ حالانکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ مشہور واقعہ گزر چکا تھا، جب دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم اہل حدیث طلبہ کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ قصہ اس قضیے کا یوں تھا کہ صرف اہل حدیث ہونے کے ''جرم'' میں دارالعلوم سے ان طلبہ کو خارج کر دیا گیا اور ان کے تعلیمی سال برباد کر کے رکھ دیئے گئے۔ چونکہ نظم و ضبط یا اصول وضوابط کے حوالے یہ قدم نہیں اٹھایا گیا تھا بلکہ اس کے پس منظر میں صرف مسلکی تعصب روا تھا، اس لیے پاک و ہند کے طول و عرض میں اس پر احتجاج ہوا تھا۔ غیر اہل حدیث بھی اس پر احتجاج کناں تھے۔ رئیس احمد جعفری جو کتنی ہی کتب کے مترجم

تھے اور مشہور حنفی عالم مولانا حیدر حسن ٹونکی کے شاگرد تھے، نے ایک مضمون اس واقعے کے خلاف لکھا اور ارباب دیوبند سے سوال کیا کہ ''جب ایک اہل حدیث عالم ابوالکلام آزاد بحیثیت وزیر تعلیم آپ کے ہاں تشریف لائے تب تو آپ نے ان کی عزت وتوقیر کی حد کر دی لیکن جب اس اہل حدیث فکر کے غریب طالب علم آپ کے ہاں پڑھنے کے لیے آئے تو آپ نے ان پر ظلم کی انتہا کر دی۔''

اس سارے پس منظر میں جب قاری طیب صاحب نے اپنا ''محبت بھرا'' لیکچر ختم کیا اور سوالات کا وقفہ شروع ہوا تو نوجوان احسان الٰہی ظہیر کھڑا ہو گیا اور مکمل حوالوں اور دلائل کے ساتھ قاری صاحب کے سامنے اس دوعملی کی تصویر رکھی۔ اب قاری صاحب کے پاس نہ جائے قرار تھا نہ جائے فرار۔ اگرچہ یونیورسٹی میں موجود حنفی طلبہ نے ان کی اعانت کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

ہندوستان کے معروف عالم جناب مولانا عبدالحمید رحمانی رحمہ اللہ جو علامہ شہید کے ساتھ مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، اگرچہ ان کا ابتدائی سال تھا اور علامہ کا آخری سال، انہوں نے آپ کی شہادت کے بعد ایک طویل مضمون لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''بھائی احِسان کی یاد میں'' ''النوعیہ'' دہلی میں یہ مضمون شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ترجمان الحدیث کے ''شہداء اہل حدیث نمبر'' میں بھی شائع ہوا۔ اس میں علامہ کے آخری سال اور امتحان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مسلک وعقیدہ کے لیے غیرت اور اپنی تاریخ پر افتخار اور اعتزاز اور شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ سے بے پناہ عقیدت ایسی مشترکہ اقدار تھیں جنہوں نے ہمیں چند ہی مہینوں کی مدت میں ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا کہ جب امتحان کا زمانہ آیا جوان کا ڈگری کا امتحان تھا اور وہ پورے سال اپنی مشہور کتاب ''القادیانیہ دراسات وتحلیل'' کی تصنیف و

ترتیب وتبویب میں مصروف رہنے کی وجہ سے اسباق میں پوری محنت نہیں کر سکتے تھے تو میں روز وشب ان کو ملامت کرتا تھا اور ان کے لیے دعائیں بھی کرتا تھا اور انہیں امتحان کی تیاری پر آمادہ بھی کرتا تھا۔

''میں ان کے ممتاز آنے کے لیے جو اصرار کر رہا تھا اس کا ایک پس منظر تھا۔ کچھ ہی دن پہلے ایک پٹھان طالب علم حسن جان [1] نام کے جو اپنی تقلیدی عصبیت میں اس قدر آگے بڑھے ہوئے تھے کہ جامعہ اسلامیہ کا سلفی ماحول بھی انہیں نرم نہیں کر سکا تھا۔ بلکہ ان کے حنفی تعصب میں مزید شدت آ گئی۔ وہ آخری سال ''ممتاز'' ڈویژن میں پاس ہو چکے تھے اور اب اپنی اور دوسروں کی نظریں احسان پر تھیں کہ فائنل امتحان میں یونیورسٹی کے سب سے نمایاں طالب علم ''علامہ'' احسان کا انجام کیا ہونا ہے اور اغیار تو چاہتے بھی تھے کہ وہ ناکام رہیں، کچھ اپنے بھی اس بھول میں مبتلا تھے۔ آخری ہماری دعائیں اللہ کی توفیق سے قبول ہوئیں، احسان ممتاز آئے۔''

یہ اقتباس تھا جناب مولانا عبدالحمید رحمانی کے مضمون کا جس میں انہوں نے علامہ کے آخری امتحان کا ذکر کیا اور اس میں بھی علامہ کے حاسدین کا تذکرہ ہے کہ کچھ اپنے بھی ان کی ناکامی کے خواہش مند تھے چاہے اس کی قیمت مسلک کی آبرو بھی کیوں نہ ہو۔ اس مضمون کا مزید دل چسپ اور حیران کن اقتباس پڑھیے اور سر دھنیے۔ مولانا رحمانی لکھتے ہیں:

''اس موقع پر ان کی کامیابی کی مبارک باد کے سلسلے میں میں نے ایک

---

[1] یہ (مولانا) حسن جان چارسدہ والے تھے جو بعد میں خاصے معروف ہوئے۔ صف اول کے علماء دیوبند میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے جمعیت علمائے اسلام کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا اور اے این پی کے راہبر اور قومی سطح کے لیڈر خان عبدالولی خان کو شکست دی اور ایک قاتلانہ حملے میں جاں بحق ہو گئے۔

مضمون لکھا جو الاعتصام میں شائع ہوا۔ ❶ کسی دوست کے سلسلے میں میرا یہ پہلا مضمون تھا جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ہو۔ جس پس منظر میں میں نے یہ مضمون لکھا تھا مضمون کا ایک ایک لفظ اس کا غماز تھا۔ اس کا مقصد صرف نوجوانان اہل حدیث کے مورال کو بلند کرنا اور یہ بتانا تھا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود جماعت اہلحدیث اپنے دامن میں بہت سے ہیرے رکھتی ہے۔ مگر اس مضمون سے کچھ بزرگوں کو تکلیف پہنچی اور فراغت کے بعد جب احسان آئے اور پاکستان اور جماعت اہلحدیث پاکستان کے داخلی سیاست میں انہوں نے دلچسپی لینی شروع کی (اور اس سلسلے میں میرے نقطہ نظر سے بھی ان سے غلطیاں ہوئیں)۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔ میرے اس مضمون سے بعض بزرگوں نے یہ اثر لیا کہ میں ان کے جماعتی موقف کو بھی مکمل طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ مجبوراً مجھے زندگی کا اب تک کا سب سے بڑا تفصیلی خط اپنے ایک بزرگ کو لکھنا پڑا جس میں میں نے اپنے مضمون کا پس منظر بتایا۔'' ❶

آپ نے ملاحظہ کیا! مولانا عبدالحمید رحمانی نے علامہ کی تعریف میں اس وقت مضمون لکھا جب وہ ابھی مدینہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ لیکن بعض بزرگوں سے برداشت نہ ہو سکا۔ اب اس بات کی وضاحت انہوں نے نہیں کی کہ وہ کون سے بزرگ تھے کہ ایک ایسا طالب علم جو روایتی علماء کے خاندان کا بھی نہیں، نہ پاکستان میں موجود ہے، نہ اس کے آنے کا پتہ ہے اور نہ ہی اس کے عزائم کا، پھر کیا مسئلہ تھا کہ ایک ہندوستانی عالم بلکہ طالب علم کو ''حضرت صاحب'' کے حضور صفائیاں پیش کرنی پڑیں۔

❶ یہ مضمون نما خط تھا جو آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔

❷ ترجمان الحدیث، احسان بھائی کی یاد میں، مارچ: 1988ء۔

حضرت علامہ نے ہی ایک جگہ خطاب کے دوران فرمایا تھا کہ میں نے جتنا حسد طبقہ علماء میں دیکھا ہے، اتنا کسی اور طبقہ میں نہیں دیکھا۔ یہ ان کا ذاتی تجربہ تھا جو انہوں نے بیان کیا۔ زمانہ طالب علمی سے انہیں جس حسد و رقابت کا سامنا کرنا پڑا، اس کا سلسلہ بدقسمتی سے ان کی وفات کے بعد بھی برسوں جاری رہا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ جو بھی بزرگ تھے، خاصے فہیم اور مردم شناس تھے کہ آنے والے والے طوفان کی بھی خبر تھی اور اس بات کا اندازہ بھی کہ سیادت کے دن اب بدلنے کو ہیں۔ خیر یہ ہمارا موضوع نہیں البتہ یہ بتانا مقصود تھا کہ علامہ ابھی پاکستان نہیں آئے تھے کہ ان کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی اور کچھ لوگوں کے کان کھڑے ہو چکے تھے اور وہ اپنے لیے نادیدہ خطرات کی بو سونگھ رہے تھے۔

پہلی کتاب

مدینہ یونیورسٹی میں زمانہ طالب علمی میں علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ عربی زبان و ادب پر انہیں مکمل عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے مضامین عرب کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگے تھے۔ جیسے ان کی پہلی کتاب ''القادیانیہ'' جس کے بارے میں تفصیل سے تو ہم ان کی تالیفات کے باب میں لکھیں گے لیکن اس کتاب کا پس منظر یہ تھا کہ یہ علامہ کے دور طالب علمی کے مقالات کا مجموعہ تھی۔ یہ مقالے دمشق سے نکلنے والے مجلّے ''حضارۃ الاسلام'' میں شائع ہوتے تھے۔ بعد میں یہ مقالے کتابی شکل میں ''القادیانیہ دراسات و تحلیل'' کے نام سے شائع ہوئے جو مکہ کے مشہور مطبع سلطان نے شائع کی تھی۔ جب اس کتاب کے طبع ہونے کا مرحلہ آیا تو ناشر نے علامہ کو کہا آپ تو ابھی طالب علم ہیں اگر متعلم کا لفظ دیا جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب کی اشاعت پہ اثر پڑے۔ آپ وائس چانسلر سے اجازت لیں کہ آپ کو فاضل مدینہ یونیورسٹی لکھ دیا جائے۔ آپ اپنے وائس چانسلر شیخ بن باز رحمہ اللہ کے پاس آئے اور مدعا بیان کیا۔ شیخ نے بکمال شفقت اجازت دے دی۔ علامہ ہنستے ہوئے کہنے لگے ''اگر

میں فیل ہو گیا'' تو اس فاضل مدینہ یونیورسٹی کا کیا بنے گا۔ شیخ نے بھی ویسا ہی شاندار جواب دیا کہ ''اگر احسان الٰہی ظہیر فیل ہو گیا تو ہم مدینہ یونیورسٹی ہی بند کر دیں گے۔''

پھر اس واقعہ سے بھی جو علامہ نے خود بیان کیا، آپ کے مضامین کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ اسرائیل عرب جنگ کے کسی روز کا ذکر کرتے ہیں، جب علامہ نے حرم نبوی میں ایک یادگار تقریر کی جس کے بعد نامور عرب دانشور اور آتش نوا خطیب ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے جو مجمع میں موجود تھے، علامہ کی بہت تعریف کی۔ علامہ لکھتے ہیں:

> ''باتوں باتوں میں انہیں یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ ان کے پرچے ''حضارة الاسلام'' میں جس کے چھپے ہوئے ایک ادبی مضمون ''لیلة مع المتنبی'' نے دھوم مچا رکھی ہے، وہ میں ہی ہوں تو انہوں نے اور زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا ''میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ ''لیلة مع المتنبی'' لکھنے والا اتنا کم عمر ہو گا۔''[1]

کاش کوئی طالب علم حضرت علامہ کے اس دور کے مضامین تلاش کرے جو یقیناً ایک تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی کہ علامہ دور طالب علمی میں ہی عالم عرب کے علمی اور ادبی حلقوں میں اپنا مقام طے کرا چکے تھے۔ ان مضامین کی تلاش مشکل نہیں، بس تھوڑا سا محنت طلب کام ہے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کی شادی

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کی شادی 1965ء میں مدینہ یونیورسٹی کے طالب علمی کے زمانے میں ہو گئی تھی۔ علامہ شہید کو مدینہ یونیورسٹی گئے ہوئے دو سال ہونے کو تھے کہ علامہ کی شادی طے پائی۔ آپ کا رشتہ آپ کے استاد، حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی بیٹی کے ساتھ طے پایا۔

---

[1] سفر نامہ حجاز۔

8 اگست 1965ء کو علامہ شہید کا نکاح، مسلم مسجد نوشہرہ روڈ میں طے پایا۔ آپ کا نکاح آپ کے خسر محترم حافظ محمد گوندلوی نے خود ہی پڑھایا اور یوں علامہ کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ آپ کی اہلیہ چند روز پاکستان میں آپ کے ساتھ قیام کے بعد آپ کے ہمراہ سعودی عرب تشریف لے گئیں۔ مدینہ یونیورسٹی کے قیام کے آخری دو سال ان کے ساتھ وہیں مقیم رہیں اور اگست 1967ء میں علامہ کے ساتھ ہی واپس تشریف لائیں۔ علامہ شہید ان ہی خوبصورت دنوں کا ذکر اپنی کتاب ''سفر حجاز'' میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اک خوبصورت یاد

''پھر اچانک مجھے ماضی کی ایک یاد آئی کہ آج سے چھ برس پیشتر رات کے پچھلے پہر حجر اسود کے عین مقابل اور چاہ زمزم کے پڑوس میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دیر تک بیٹھا اپنے رب کے ساتھ مناجات کرتا رہا تھا اور اس خیال کے آتے ہی آج پھر اسی مقام پر پہنچا اور دیر تک اس کی صحت، سلامتی اور مسرت کی دعا مانگتا رہا۔'' (سفر حجاز)

اپنے سفر نامہ حجاز میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ مدینہ یونیورسٹی کے دور طالب علمی میں اپنی بیماری کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ یہ 1964ء کی بات ہے۔ آیئے ان کے اپنے الفاظ میں ہی پڑھتے ہیں:

''پھر مجھے اس سے بھی ایک سال پرانی وہ رات بھی یاد آ گئی کہ جب مدینہ یونیورسٹی میں ایک دن اچانک کلاس سے نکلتے ہوئے مجھے درد گردہ کی شکایت ہوئی۔ دوست احباب جلدی سے اٹھا کر یونیورسٹی ہسپتال کی طرف لے گئے۔ وہاں سے ڈاکٹر کی ہدایت پر شہر کے بڑے مستشفیٰ (کہ عربی میں ہسپتال کو مستشفیٰ کہتے ہیں) مستشفیٰ الملك لے

گئے۔ وہاں انجکشن وغیرہ دیئے گئے اور ایکسرے رپورٹ سے پتہ چلا کہ گردے میں پتھری بن گئی ہے۔ خدا کی قدرت کہ ان دنوں ہسپتال کے بڑے سرجن اور ڈاکٹر چھٹی پر تھے۔ آٹھ دن تک میں ہسپتال میں ایڑیاں رگڑتا رہا۔ آخر نویں دن فیصلہ ہوا کہ پتھری کا آپریشن کر دیا جائے۔ آپریشن کا نام سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے اور اس وجہ سے بھی کہ بغیر آپریشن ہی یہ ٹیکوں کی لمبی لمبی سوئیوں سے مارے دیتے ہیں۔ اگر آپریشن ہوا تو خدا جانے کیا ہو۔

''عصر کے بعد میں نڈھال پڑا ہوا تھا کہ حسب معمول یونیورسٹی کے دوست آ گئے۔ دیر تک پرسش احوال ہوتی رہی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ صبح آپریشن کی ٹھانی گئی ہے تو سب نے مخالفت کی اور ان میں سے چند مدیر مستشفیٰ کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ اگر اپریشن ضروری ہے تو مریض کو پاکستان بھیج دیا جائے۔ مدیر نے کہا کہ عالم نقاہت میں سفر مناسب نہیں۔ دوست بڑے گھبرائے اور آپریشن ہی کو ملتوی کرنے کی سفارش کی۔ مدیر نے چارٹ دیکھنے کے بعد التواء جراحت سے بھی انکار کر دیا اور میں نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر بھانپ لیا کہ حال اچھا نہیں اور پھر عین اسی وقت ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ میں نے ایک ساتھی صلاح الدین کو کہا دوست تم جاؤ اور مکہ مکرمہ کے لیے ٹیکسی لے آؤ۔ تم اور ایک اور ساتھی میرے ساتھ چلو گے۔

''لیکن اس عالم میں سفر کیسے ہو گا؟

''جیسے بھی ہو۔ میں نے پرعزم لہجے میں جواب دیا۔ لیکن ہسپتال سے رخصت؟ یاد رہے کہ سعودی ہسپتالوں میں تمام علاج قطعی طور پر مفت ہوتا

ہے۔اس لیے مریض پر کچھ پابندیاں بھی نسبتاً زیادہ ہیں۔
''میں نے کہا کہ بغیر اجازت چلیں گے اور اگر زندگی رہی تو جو بھی ہو گا نمٹ لیا جائے گا۔
''چنانچہ ہسپتال کے ایک پہلو سے دیوار پھاند کر مجھے نکالا گیا اور ٹیکسی مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوگئی اور جب رات گئے حرم کعبہ کے سامنے رکی تو شدت نقاہت سے میرے ہوش حواس تک گم تھے۔ دونوں ساتھیوں نے سہارا دے کر نیچے اتارا، باہر ہی وضو کیا اور دونوں دوست تھام کر باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہوئے۔ اسی عالم میں طواف کیا اور ملتزم سے جو چمٹا تو دل کھول کر رکھ دیا۔ الٰہی! موت ہی آنی ہے تو تیرے در پر کیوں نہ آئے۔ پردیسی مسافر اور بیمار، وطن سے دور، گھر والوں سے دور، مولیٰ تیرے سوا تو کوئی پرسان حال بھی نہیں اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ابھی میں ملتزم سے نہ ہٹا تھا کہ پیاس اور نقاہت نے بے حال کر دیا۔ ساتھیوں نے مجھے ہٹانا چاہا لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے وہیں پانی مانگا۔ وہ جلدی سے بھاگے۔ زمزم کا شربہ (صراحی) بھر لائے۔ اتنی دیر میں، میں گر چکا تھا۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر پانی پلایا۔ کچھ ہوش درست ہوئے ...... تو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ جلدی سے حرم سے باہر آئے۔ طہارت گاہ میں پہنچ کر پیشاب جو کیا تو آدھ انچ لمبی اور دو سوتر موٹی پتھری نکل کر باہر آ پڑی اور ساتھ ہی محسوس ہوا کہ مرض کبھی پاس پھٹکا ہی نہیں اور جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو ساتھی میری رنگت اور حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔
''میں نے انہیں بتلایا رب کعبہ نے کعبہ میں مانگی ہوئی اپنے بندے کی فریاد سن لی اور پھر سپیدہ سحر کے نمودار ہونے تک رب کعبہ کا شکریہ ادا کرتا

رہا اور جب مدینہ طیبہ واپسی ہوئی اور ہسپتال کے وارنٹ پہنچے اور مدیر مستشفیٰ کے سامنے پیش ہوا تو وہ دنگ رہ گیا کہ بیماری کہاں گئی اور جب میں نے اسے ماجرا سنایا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔''

''مدینے سے سیالکوٹ تک''

مدینہ یونیورسٹی میں پہلا تعلیمی سال مکمل ہونے پر علامہ شہید پاکستان تشریف لائے۔ کیونکہ یونیورسٹی میں سالانہ چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ واپسی کے اس یادگار سفر پر آپ نے ایک مضمون لکھا جو ''مدینے سے سیالکوٹ تک'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ آیئے علامہ کی یادوں میں ہم بھی شریک ہوتے ہیں:

''اس دن موسم بڑا ہی خوش گوار تھا۔ رات دیر تک جاگتے رہنے سے صبح اس وقت آنکھ کھلی جب گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ جلدی جلدی اٹھ کر نماز ادا کی۔ ہولڈال اور اٹیچی سنبھالا اور بڑی حسرت و یاس سے کمرے کو مقفل کیا۔ وہ کمرہ جس میں تنہائی کا ایک سال بسر کیا تھا اور جس کی تنہائی سے ایک الفت ہو گئی تھی۔ چابی مراقب کے حوالے کی اور خود آنکھوں میں آنسو لیے باہر نکل آیا۔ آسمان پر چاروں طرف شفق پھیلی ہوئی تھی اور باد نسیم احد وسلع کو چومتی ہوئی بیتے ہوئے وقت کے گیت گا رہی تھی۔ میں نے رومال نکال کر آنسو خشک کیے اور بڑی محبت سے جس میں ہزاروں تمنائیں پوشیدہ تھیں، جبل احد کو دیکھا۔ وہی جبل احد جس پر ایک دفعہ سرور عالم ﷺ اور آپ کے ساتھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ چڑھے تھے اور اس نے لرزنا شروع کر دیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا ''احد تمہیں معلوم نہیں کہ تم پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں'' اور جس کے متعلق آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم احد سے محبت کرتے ہیں۔ وہی احد جس کو میں ہر صبح اٹھ کر بڑے پیار سے دیکھا کرتا تھا کیونکہ میرے آقا ﷺ کو اس سے محبت تھی۔ آج

اس احد کو میں الوداع کہہ رہا تھا۔ قدرتی طور پر یونیورسٹی ہوسٹل میں مجھے جو کمرہ ملا تھا، اس کا دروازہ بالکل احد کی سمت کھلتا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے سب سے پہلے جس پر نظر پڑتی تھی، وہ احد پہاڑ ہوتا۔ میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیئے یا اللہ میری یہ جدائی عارضی جدائی ہو۔ یا اللہ میں اس احد سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ یہ میرے مولا سے محبت کرتا تھا۔ مجھے مدینہ کا ذرہ ذرہ عزیز ہے۔ کیونکہ ان ذروں پر انسانیت کے سب سے بڑے محسن کے نقش قدم ثبت ہیں۔ اتنی دیر میں ساتھی گاڑی پر بیٹھ گئے اور میں بھی دعا کو مختصر کرتا ہوا بھاری بھاری قدم اٹھاتا سوار ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی اور چند منٹوں کے بعد وہ یونیورسٹی پھاٹک سے نکلتی ہوئی وادی عتیق عبور کر رہی تھی۔ سامنے مسجد نبوی ﷺ کے پر شکوہ مینار اپنی پوری عظمت کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ سب کی ٹکٹکیاں لگی ہوئی تھیں اور اس وقت تک آنکھ نہ جھپکی جب تک آنکھوں پر آنسوؤں کے دبیز پردے نہ پڑ گئے۔ شہر سے نکل کر ناشتہ کیا اور پھر گاڑی پوری برق رفتاری سے چلنے لگی اور راستے میں وہ وادی بھی آ گئی جسے ''وادی روحاء'' کہتے ہیں۔ صاحب وفاء الوفاء لکھتے ہیں کہ اس وادی مقدس میں ستر ہزار انبیاء نے نماز ادا کی اور ایک روایت میں ہے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وادی جنت کی وادیوں میں سے ہے۔ اس کا ہر موڑ اور ہر ٹیلہ اپنے اندر ایک تاریخ لیے ہوئے ہے۔ ان ہی ٹیلوں پر کھڑے ہو کر کبھی صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما اپنے لشکروں کو خود وداع کیا کرتے تھے اور ان موڑوں پر کھڑے ہو کر مائیں اپنے غازیوں کا انتظار کیا کرتی تھیں اور کسی ایسی ہی وادی میں کھڑے ہو کر ایک مجاہدہ نے سنا تھا کہ اس کا خاوند، بھائی، باپ اور بیٹا جنگ میں شہادت پا چکے ہیں تو اس نے بڑے صبر و استقلال سے جواب دیا تھا ''میں تو یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ خواجہ کونین ﷺ کا کیا حال ہے'' اور جب جواب دینے والے نے جواب دیا کہ وہ بالکل خیریت سے ہیں تو اس نے مسرت سے چلاتے ہوئے کہا

''پھر میرے عزیزوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے سرتاج، سہارے اور آسرے نے اپنے خون سے میرے مقتدا کی حفاظت کی ہے۔'' کتنے مقدس تھے وہ لوگ اور کتنی خوش بخت ہے یہ سرزمین۔

''اس زمین کو یہ شرف حاصل کیوں ہوا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس میں وہ پاکیزہ ہستیاں چلا پھرا کرتی تھیں جنہیں حضور اکرم ﷺ کی اتباع کا فخر حاصل تھا۔ آج کیا وجہ ہے کہ آپ کے ماننے والے، آپ کا کلمہ پڑھنے والے، زبانی محبت جمع خرچ کرنے والے، آپ کے فرامین سے اس قدر بیگانے ہو چکے ہیں۔ اس وقت جبکہ ہماری تعداد کم تھی، ہم کمزور و ناتواں تھے، ہم انہی ریگستانوں سے اٹھے اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں پر چھا گئے۔

ہم آج ریت کے ذروں سے بڑھ کر ہیں، ہمارے پاس خوبصورت اور سرسبز باغات ہیں، دولت کی بھی کمی نہیں، ہم دنیا کی دوسری بڑی قوم ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارا اپنا وجود خطرے میں ہے۔

اس وقت ہم بھوکے سویا کرتے تھے تو روم اور یونان ہماری ہیبت سے لرزا کرتے تھے اور آج ہم سیر ہیں پھر بھی کبھی کمیونزم کا ہوا ہمیں ڈراتا ہے اور کبھی سرمایہ داری کا بھوت۔

اس وقت ہم بادل بن کر اٹھے اور پوری دنیا کو سیراب کیا، آج ہم خود تشنہ ہیں۔

انہی خیالات میں ہم بدر پہنچ گئے۔ بدر جو ہماری جوانمردی کا شاہد ہے جس کا ذرہ ذرہ ہماری شجاعت کا معترف ہے، جس کے ٹیلے ابھی تک شہیدوں کے خون کی لالی لیے ہوئے ہیں۔

یہاں رک کر تھوڑا سا آرام کیا اور پھر آگے کو روانہ ہوئے اور ظہر ہونے سے پہلے پہلے ہم جدہ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ جدہ کی سربفلک عمارتیں دور دور سے نظر آتی ہیں۔

جدہ میں داخل ہو کر آدمی یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ ریگستان عرب میں ہے۔ بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ کشادہ سڑکیں اور ان کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے بلند و بالا پول دو رویہ انگریزی طرز کی بنی ہوئی عمارتیں یہ جدہ کی خصوصیات ہیں۔ ہم سیدھے بغدادیہ میں یونیورسٹی کی بنی ہوئی بلڈنگ میں اترے۔ وہاں نماز ظہر ادا کی اور نہا دھو کر سو رہے۔ عصر کے وقت اٹھ کر محلّہ کی مسجد میں ہی نماز پڑھی اور جدہ دیکھنے کے لیے چل پڑے۔ عصر کے بعد جدہ کی رونق اپنے جوبن پر ہوتی ہے، بازاروں میں کھوے سے کھوا اچھلتا ہے اور ہر رنگ و نسل کے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ چونکہ غیر ملکی سفارت خانے جدہ میں ہیں۔ اس لیے اس کا ماحول پورے حجاز سے الگ تھلگ ہے، عام لباس بھی غیر ملکیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

ایک اور عجیب بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ یورپ نے جس قدر اثر عورتوں پر ڈالا ہے، اس قدر مردوں پر نہیں۔ ہم نے ایک بھی مرد ایسا نہیں دیکھا جس نے انگریزی لباس پہن رکھا ہو۔ برخلاف اس کے بہت کم عورتیں ایسی ہوں گی جنہوں نے عربی لباس پہن رکھا ہو۔ وہ سب یورپی لباس میں ملبوس اور اوپر صرف برقع لیے وہ بھی نیم سا۔

بہرحال ہم مارکیٹ میں گئے دیکھا۔ کہ ایک ایک دکان ہمارے ہاں کی پوری پوری مارکیٹ ہے۔ آدمی جس دکان میں چلا جائے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا کی ورائٹی جمع کر دی گئی ہے۔ خواہ وہ کپڑے کی دکان ہو، چینی کی ہو، سامان کی آرائش ہو یا اسباب تعیش۔ بازاروں میں گاڑیاں دیکھیں جو شاید ہمارے ہاں نوابوں کے پاس بھی نہ ہوں۔ پورے قیام میں ایک یا دو گاڑیاں ایسی دیکھی ہوں گی جو پرانی ہوں یا بیس بائیس فٹ سے کم ہوں۔ یہی حالت ٹیکسیوں کی تھی۔

مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو بازاروں میں سپاہی گھومنے لگے۔ صلوۃ صلوۃ (نماز

نماز)، مغرب ادا کر کے کھانے کے لیے حرمین ہوٹل کی طرف چل نکلے۔ کھانا سعودی عرب میں ویسے ہی خاصا مہنگا ہوتا ہے۔ خصوصاً بڑے ہوٹلوں میں تو گرانی ہوش ربا ہوتی ہے۔ کھانا کھا کر جدہ کی مشہور شخصیت شیخ محمد نصیف سے ملنے چلے گئے۔ شیخ نصیف اپنی علم دوستی اور عظیم کتب خانہ کی وجہ سے مشرق میں ہی نہیں بلکہ یورپ میں بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مستشرقین ان سے آ کر استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت اسی سال سے تجاوز ہے لیکن جوانوں سے زیادہ صحت مند ہیں اور حافظہ بھی بلا کا ہے۔ میں جب ان کے پاس گیا تو میرے ساتھ ایک اور دوست بھی تھے۔ اطلاع دی تو فوراً بلوایا اور بڑے تپاک سے ملے۔ عربی قہوے اور اس کے بعد مینگو جوس سے تواضع کی اور پھر دھیمے دھیمے گفتگو کرنے لگے۔

یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے تک طول کھینچ گئی اور کوئی ہی ایسا موضوع ہوگا جس پر گفتگو نہ ہوئی ہو۔ موسیقی، شعر و شاعری، ادب، حدیث، تفسیر، رجال سے ہوتے ہوئے کتابوں تک بات چیت ہوئی کہ کون سی کتاب کہاں چھپ رہی ہے۔ واقعی شیخ نصیف بہت بڑے صاحب علم ہیں۔ جب وقت کافی گزر گیا تو اجازت لی اور دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔

صبح صبح عمرہ کے لیے جانا تھا۔ اس لیے اذان ہوتے ہی نہا کر احرام باندھا اور نماز ادا کر کے بیت الحرام کو ہو لیے۔ اس سال اللہ کے فضل سے بیت اللہ کی طرف یہ چوتھا سفر تھا۔ پہلا جب ہم سعودی عرب آئے تھے، دوسری مرتبہ رمضان المبارک میں، تیسری مرتبہ حج کے موقع پر اور چوتھی مرتبہ اب وطن لوٹتے ہوئے وداعی سفر۔

''بیت اللہ کی طرف جاتے ہوئے انسان کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ زبان پر تکبیر و تلبیہ، دل میں اللہ کے گھر کا جلال و دبدبہ اور سینکڑوں آرزوئیں۔ پون گھنٹہ بعد ہم حدود حرم میں داخل ہو چکے تھے۔ مکۃ المکرمہ کی مقدس زمین شروع ہو چکی تھی۔ وہ زمین جس

میں اللہ کی عبادت کے لیے سب سے پہلا گھر بنایا گیا ہے اور جس کی تعمیر کا شرف ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کو حاصل ہے اور وہ زمین جہاں خاتم الانبیاء علیہ السلام کی ولادت گاہ ہے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچپن، جوانی اور کہولت کے ایام بسر کیے ہیں۔ جہاں یتیم مکہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر نبوت کا تاج رکھا گیا ہے۔ ہماری گاڑی باب السعود کے سامنے جا کر رکی۔ نیچے اتر کر احرام درست کیا اور بصد ادب و احترام نظریں جھکائے مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی زبان پر آ گیا: اَللّٰھُمَّ زِدْ بَیْتَكَ ھٰذَا تَعْظِیْمًا وَ تَشْرِیْفًا وَ مَھَابَةً۔

''طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد سعی وغیرہ سے فارغ ہوئے تو سر منڈایا اور نہا کر احرام کھولا۔ لباس تبدیل کیا اور پھر مسجد میں آ گئے۔ وہ سارا دن بیت اللہ کو دیکھنے میں کٹا۔ صرف کھانے کے لیے باہر نکلے۔ رات ہوئی تو تھوڑا سا بازار میں گھومے اور اس کے بعد بادیدہ تر جدہ کو واپس ہو گئے۔

''دوسرے دن صبح جہاز چلنا تھا۔ میرا زندگی میں پہلا سمندری سفر تھا۔ دوستوں نے بہت ڈرایا کہ طبیعت بہت خراب ہو جاتی ہے۔ بہر حال اللہ پر توکل کیا۔ رات کٹی۔ صبح صبح بندرگاہ کا رخ کیا۔ سفینہ حجاج ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک وسیع و عریض شہر ہے جو سطح سمندر پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔

''ظہر کے بعد جہاز نے لنگر اٹھا دیئے اور جہاز سمندر کی لہروں سے کھیلنے لگا۔ دوسرے دن جہاز چودہ گھنٹے کے لیے عدن رکا۔ اس بہانے عدن دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ عدن ساحل سمندر پر ایک خوبصورت شہر ہے جو انگریزی استبداد سے جنگ آزادی کے لیے اپنے بیٹوں کے خون سے اپنے پہاڑوں کو رنگین کر رہا ہے۔ یہاں انگریز بھی کافی تعداد میں آباد ہیں، لیکن عرب آبادی دلی طور پر ان سے نفرت کرتی ہے۔ عدن میں تقریباً آٹھ دس گھنٹے گزار کر ہم واپس جہاز میں آ گئے۔

"رات بھر جہاز عدن کی پورٹ پر ٹھہرا رہا اور صبح کو وہاں سے چل پڑا۔ عدن سے نکلنے کے بعد محیط ہندی شروع ہوا۔ محیط ہندی یا بحیرہ ہند پوری طرح بپھرا ہوا تھا۔ اس کی سرکش موجیں جب جہاز سے ٹکراتیں تو جہاز ایک ننھے سے کھلونے کی طرح ادھر سے ادھر جھولنا شروع کر دیتا۔ جولائی اور اگست میں جوار بھاٹا اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ لوگ ادھر ادھر لڑھک رہے تھے لیکن پہلا سفر ہونے کے باوجود مجھ پر ڈھولنے کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔ بلکہ ہم پورے اطمینان سے حاجیوں کی خدمت میں مشغول تھے۔ حاجیوں کے گمشدہ سامان کے اعلانات، سفری ہدایات اور کھانے کی تفتیش، پورے جہاز کا راؤنڈ، یہ میرے ذمہ ہے۔ انہی اشغال میں کراچی کے روشنی کے مینار نظر آنے لگے۔ وہ مینار جو میرے وطن کی سرحدوں کے امین ہیں، جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتے ہیں۔

جب ہم کراچی میں داخل ہوئے تو بارش پورے زوروں پر تھی۔ آہستہ آہستہ جہاز کراچی سے قریب تر ہونے لگا اور جب گودی پر پہنچا تو دیکھا بے شمار لوگ اپنے اپنے عزیزوں کے انتظار میں کھڑے بھیگ رہے تھے اور انہوں نے نعرہ ہائے تکبیر سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ پٹری لگی اور لوگ ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ خوشی کے آنسو سب کی آنکھوں میں لہریں لے رہے تھے۔ میں نے بھی سامان قلی کو اٹھوایا اور نیچے اترا۔ کسٹم ہاؤس میں والد صاحب، چھوٹا بھائی اور دوسرے عزیز منتظر کھڑے تھے اور ایک دوسرے کے بعد گلے لپٹے۔ سسکیوں میں دعائیں مانگی جا رہی تھیں اور ایک سال کی جدائی کے بعد ملاقات اور کتنے مقدس مقام سے واپسی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو کسٹم سے نکل کر سیدھے ہوٹل کا رخ کیا۔

وہی مانوس راستے، دیکھے بھالے لوگ، اپنی زبان، اپنا ملک، وطن عزیز کی محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، یہاں سے گئے ابھی چند ہی دن گزرے ہیں۔ کراچی بارش میں ڈوبا ہوا تھا۔ پروگرام مختصر کر کے دوسرے دن تیز رو پر بیٹھ گئے۔

لہلہاتے ہوئے کھیت ہنس ہنس کر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہ سبزہ دیکھے کتنی مدت گزر چکی تھی۔ گاڑی اپنی عادت کے مطابق چلتی رہی۔ گوجرانوالہ اسٹیشن پر احباب وغیرہ کا ہجوم تھا۔ سب سے پہلے جس پر نظر پڑی وہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاب امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی ذات گرامی تھی۔ آپ کے ساتھ گوجرانوالہ کے اور بھی کئی احباب تھے۔ سیالکوٹ جمعیۃ کے امیر، ناظم اور ضلع کے امیر اور دیگر رشتہ دار اور دوست بھی باوجود بارش اور ناخوش گوار موسم کے تشریف لائے ہوئے تھے۔

پتا نہیں، یہ مجھ سے محبت تھی یا اس مقدس ترین سرزمین سے جہاں رہنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ عصر کی نماز میں اس شہر میں ادا کر رہا تھا جہاں کے چپہ چپہ کے ساتھ میری یادیں وابستہ ہیں، جہاں میں نے بچپن کی بادشاہی کا زمانہ بسر کیا ہے، جو علامہ اقبال رحمہ اللہ کا شہر ہے، جس میں مولانا محمد ابراہیم میر رحمہ اللہ کے خطبوں اور درسوں کی گونج ہے، جس میں علامہ عبدالحکیم رحمہ اللہ کا مرقد ہے اور جس نے شاہ ولی اللہ کے استاذ ملا افضل کاشمیری کو جنم دیا ہے۔

نماز عصر محلہ کی جامع مسجد میں ادا کی۔ جب فارغ ہوا تو اردگرد ایک ہجوم اُمڈا چلا آ رہا تھا اور بے اختیار میرے ہاتھ اٹھ گئے۔ یا اللہ! دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی عارضی جدائی ہو یا اللہ! ایک دفعہ پھر...... اور الفاظ میری ہچکیوں میں دب گئے۔ [1]

مدینہ یونیورسٹی میں علمی وادبی سرگرمیاں

مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران علامہ شہید عربی زبان و ادب سے اپنے گہرے شغف کے سبب مختلف ادبی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ دمشق سے تعلق رکھنے والے عالم عرب کے معروف ادیب ڈاکٹر محمد مصطفیٰ سباعی کے مجلّے ''حضارۃ الاسلام'' میں آپ کے مقالات شائع ہونے لگے۔ اسی طرح سعودی عرب کے جریدے

[1] سفرِ حجاز، اگست ۱۹۶۴ء۔

"المنحل" اور لبنان کے مشہور و معروف مجلّے "المجتمع" میں بھی آپ کے مقالات شائع ہونے لگے۔ 1965ء میں بیروت کی عرب اکیڈمی سے عربی ادب کا سب سے بڑا ایوارڈ جیتا۔ 1966ء میں عرب یونیورسٹیوں کے بین الجامعاتی تقریری مقابلوں میں پہلا انعام حاصل کیا۔

اسی طرح آپ گذشتہ صفحات میں علامہ صاحب کے دورِ طالب علمی میں لکھا ہوا خط ملاحظہ کر چکے ہیں کہ مدینے میں بیٹھ کر ہفت روزہ "الاعتصام" [1] اور ہفت روزہ "چٹان" میں بھی اپنے مضامین شائع ہونے کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔

طالب علمی کے اس دور میں "الاعتصام" کے علاوہ دیگر ملکی مذہبی و سیاسی جرائد میں بھی علامہ کے مضامین شائع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ اس وقت میرے سامنے 1963ء کا ہفت روزہ چٹان ہے جو اس وقت پاکستان کا صف اوّل کا سیاسی پرچہ تھا۔ اس میں مشہور عرب شاعر، ابو تمام پر علامہ کا خالص علمی مضمون شائع ہوا ہے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ بطور مصنف علامہ کا نام کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے "احسان الٰہی ظہیر سیالکوٹی" اس کے بعد 7 دسمبر 1964ء کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جس میں "سیالکوٹی" کا لاحقہ ختم ہو چکا ہے اور "حافظ احسان الٰہی ظہیر" اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ لکھا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "سعودی عرب کا انقلاب اور اس کا پس منظر" زمانہ طالب علمی میں ہی علامہ کی نشو و نما تھی۔ اس مضمون میں علامہ رحمہ اللہ نے شاہ سعود کی سبکدوشی اور شاہ فیصل کے اقتدار میں آنے کی تمام کہانی مکمل ہے جو اسی سال وقوع پذیر ہوئی تھی اور عالم اسلام میں تجسس بھی تھا اور اضطراب بھی۔ خاصا طویل مضمون ہے اور بہت سادہ اور صاف ستھری اردو میں لکھا گیا ہے۔

---

[1] آغا شورش کاشمیری مرحوم کے زیر ادارت شائع ہونے والا پرچہ تھا جس نے حریت فکر کی ایک تاریخ مرتب کی۔

پھر اس کے بعد جولائی 1965ء کے چٹان میں ''انقلاب الجزائر'' کے متعلق ایک طویل مضمون بھی مجھے ملا۔ اس میں علامہ کی تصویر شامل نہیں تھی جبکہ پہلے دو مضامین میں علامہ کی تصاویر بھی ساتھ لگائی گئی تھیں۔ انقلاب الجزائر اقتدار کی طاقت سے منتقلی کی کہانی ہے اور اتنے دلچسپ پیرایہ اور طرز تحریر میں مکمل لکھی گئی ہے کہ کسی ناول کا گمان ہوتا ہے۔ علامہ شہید نے لکھنے کے لیے عربی زبان کا میدان منتخب کیا۔ اردو میں ان کی تحریریں کم ملتی ہیں۔ پھر بھی ان کو جمع کر دیا جائے تو مفید ہوسکتا ہے۔

مئی 1966ء کے چٹان کے شمارے میں ''چند لمحے اقبال کے ساتھ'' شائع ہوا۔ یہ بھی طویل مضمون ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آغا شورش کاشمیری بھی علامہ احسان الٰہی ظہیر کی نثر کو پسند کرتے تھے کہ ان کے مضامین کو اپنے پرچے میں دل سے جگہ دیتے تھے۔ جا بجا اقبال کے اشعار سے مزین یہ مضمون اقبال کی شاعری کے مختلف جملوں کا احاطہ کرتا ہے۔ چند سطور آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

اگر میں کہوں کہ عربی میں متنبی و ابوتمام اور فارسی میں حافظ و رومی کی حکمت و دانائی مسلم۔ لیکن دو باتیں اقبال کے سوا کسی شاعر کو نصیب نہ ہوسکیں تو بے جا نہ ہو گا اور وہ ہیں اقبال کی آفاقیت اور اس کی فصاحت و بلاغت۔

''چار دن بغداد میں'' کے عنوان سے ''حافظ احسان الٰہی ظہیر کا ایک سفر نامہ چٹان کی گیارہ جولائی کی اشاعت میں شامل ہوا۔ وہی دلچسپ اسلوب بیان لیے۔ یہ چند مضامین تھے جو مجھے دستیاب ہو سکے یہ سب علامہ نے مدینہ یونیورسٹی سے بھجوائے تھے اور آغا صاحب مرحوم نے شامل اشاعت کیے۔

(مولانا) عبدالحمید رحمانی رحمہ اللہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہندوستان کے امیر رہے تھے۔ جب علامہ شہید 1967ء میں مدینہ یونیورسٹی سے آخری امتحان میں فقید المثال کامیابی حاصل کر چکے تو آپ کی اس کامیابی پر مولانا عبدالحمید رحمانی نے ایک

مضمون لکھا جو 1967ء کے ''الاعتصام'' میں شائع ہوا اور اس مضمون کے شائع ہونے کے چند ماہ بعد ہی علامہ بھی ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ یہ حسن اتفاق تھا۔ اب مولانا رحمانی کا خط ملاحظہ کریں۔

جماعت اہل حدیث کے ایک قابلِ فخر فرزند کی عظیم الشان کامیابی

حافظ احسان الٰہی ظہیر کا نام پہلے پہل میری نظر سے مؤقر جریدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایک مضمون نگار کی حیثیت سے گزرا اور چونکہ موصوف کا پہلا مقالہ جو میں نے پڑھا وہ تحریک اہل حدیث سے متعلق تھا۔ بنا بریں فطری طور پر ان سے ایک گہری قلبی انسیت پیدا ہوگئی۔

پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے وطن پہونچنے والے احباب سے ان کے کچھ حالات بھی معلوم ہوئے جن سے ان کی محبت کا نقش اور گہرا ہوگیا۔

ادھر اللہ کی بے پایاں رحمت و نوازش کہ جماعت اہل حدیث بنارس اور اراکینِ مرکزی دار العلوم کی مخلصانہ کوششوں سے مجھے بھی جامعہ اسلامیہ میں آنے کا موقع مل گیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد ہم ذوقی کے باعث حافظ صاحب سے بار بار ملنے اور ساتھ اٹھنے، بیٹھنے نیز گھل (مل) کر گفتگو کرنے کے مواقع ملتے رہے۔

اس اثناء میں ان کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی تحریک اہل حدیث پر کامل فدائیت، علماء اہلحدیث کی بے پایاں عقیدت اور ہر موقع پر انتہائی بے باکی، دلیری اور قوت ایمانی کے ساتھ اپنے مسلک کی حقانیت کا برملا اظہار و اعلان تھی۔ کسی کی کیا مجال (خواہ وہ کتنا ہی قریبی دوست کیوں نہ ہو) کہ وہ حافظ صاحب کے سامنے تحریک اہلحدیث یا علماء اہلحدیث کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ دے اور حافظ صاحب کی گرفت سے بچ کر نکل جائے۔

یہ چند کلمات ابتداء میں اس لیے لکھ دیئے گئے ہیں کہ بحمد اللہ اس ''علمی انحطاط''

مرعوبیت، مداہنت اور کتمانِ حق کے دور میں بھی جماعت اہلحدیث کے دامن میں پروان چڑھنے والی نئی پود کا ایک غیور طبقہ جماعت کے روشن مستقبل کا مکمل آئینہ دار ہے۔

رہی اصل خوش خبری جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ساٹھ سے زیادہ ممالک کی نمائندہ یونیورسٹی جامعہ اسلامیہ میں اپنی تعلیم کے آخری اور فراغت کے سال میں میرے محترم دوست اور جماعت اہل حدیث کے غیور فرزند حافظ احسان الٰہی ظہیر سب سے اچھی پوزیشن میں ۹۳ فیصد نمبر لے کر امتیازی شان سے اولیت کے درجہ پر فائز ہوئے اور انہوں نے گیارہ پرچوں میں ۴۴۰ نمبرات میں سے ۴۱۰ نمبرات حاصل کر کے دوسرے طلباء کے لیے اپنی ذکاوت، فطانت اور محنت کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

واضح رہے کہ یہ کامیابی ان کے لیے کوئی غیر متوقع نہیں کیونکہ ان کی روایت جامعہ میں شروع ہی سے اسی نوعیت کی رہی ہے۔

اصل خصوصیت اس کامیابی کی دو جہتوں سے بڑھ جاتی ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اب تک جامعہ کے امتحانات صرف ''مقرّر'' حصہ میں ہوا کرتے تھے، یعنی پورے منہج، پورے نصاب میں امتحانات نہیں ہوتے تھے، بلکہ صرف اتنے حصہ میں امتحانات ہوتے تھے جو طالب استاذ سے درساً پڑھ جائے، لیکن اس سال سے مقرر نصاب، پورے کورس میں امتحانات ہو رہے ہیں خواہ درساً وہ ختم ہوئے ہوں یا نہ!

اور دوسری سب سے اہم وجہ جو حافظ صاحب کی اس کامیابی کو چار چاند لگا دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے قریب قریب اپنا پورا تعلیمی سال چند انتہائی اہم اور ضروری لیکن درس سے خارج علمی مشغولیات میں گزارا اور اس کے باوجود یہ امتیازی نشان بھی حاصل کر لیا، حالات یہ کی صورت ان کی کامیابی کو نہایت اہمیت کا حامل بنا دیتی ہے اور واقعی ان کی ان مشغولیات کا تصور کر کے تعجب ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اس امتیازی نشان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حافظ صاحب پاکستانی جرائد و اخبارات میں تو اچھی طرح متعارف ہیں ہی، مگر کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عالم عرب کے معیاری رسائل و جرائد میں بھی ایک فاضل مقالہ نگار کی حیثیت سے قابل رشک حد تک مقبول ہیں۔ کل چار سال کی مدت انہوں نے جامعہ میں گزاری ہے لیکن اس اثنا میں ان کے علمی مقالے عرب کے چوٹی کے جرائد میں بھی ایک فاضل مقالہ نگار کی حیثیت سے اشاعت پذیر ہونے لگے ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کے مشہور جریدہ ''حضارۃ الاسلام'' جس کی علمی و ادبی انفرادیت محتاج تعارف نہیں، اس جریدہ میں مرحوم سباعی کی زندگی ہی میں حافظ صاحب کے مقالے ان کی طلب پر چھپنا شروع ہو گئے تھے اور اب تک چھپتے رہتے ہیں۔

سعودی عرب کا ''المنحل'' اور لبنان کا اسلامیت اور حریت افکار کا شاہکار پندرہ روزہ ''المجتمع'' مرحوم بھی حافظ صاحب کے مقالات سے مزین ہوتے رہے۔

لیکن سب سے اہم اور وقت کا ایک انتہائی اہم فریضہ اور اسلام و جماعت اہل حدیث کی ایک عظیم خدمت جو حافظ صاحب نے اس سال انجام دی، وہ ان کی دو شاہکار کتابیں ''القادیانیہ، دراسات و تحلیل'' اور ''البھائیہ'' ہیں۔ اول اذکر کتاب انہوں نے جامعہ کے اساتذہ و مشائخ، فضیلۃ الشیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد، شیخ عطیہ محمد سالم، شیخ ابراہیم شقرہ، شیخ حماد محمد انصاری، ڈاکٹر ادیب صالح چیف ایڈیٹر ماہنامہ ''حضارۃ الاسلام'' دمشق وغیرہم کی حوصلہ افزائی و اصرار پر دس مقالوں پر مشتمل تین سو سے زائد بڑی تقطیع کے صفحات میں مرتب کی، جو شام سے چھپ کر بازار میں آ چکی ہے۔ جس پر عالم اسلام کے عظیم مصنف، مفکر اور رابطۂ عالم اسلامی کے رکن، جامعہ دمشق کے شعبہ علوم القرآن والحدیث کے سابق صدر اور جامعہ الرباط کے فقہ مالکی اور حضارۃ اسلامیہ کے قابل فخر سابق استاذ، نیز جامعہ اسلامیہ میں کلیۃ الدعوۃ و اصول الدین اور کلیۃ

الشریعۃ میں حدیث وفقہ کے استاذ علامہ سید محمد منتصر کتانی نے تقدیم اور فضیلۃ الشیخ عطیہ محمد سالم جامعہ کے استاذ فقہ وادب نے تصدیر لکھی ہے اور نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں حافظ صاحب کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور عربی زبان میں اس کتاب کو اپنے موضوع پر ایک بے نظیر کتاب قرار دیا ہے۔ اور دوسری کتاب ''البھائیۃ'' لبنان میں زیر طبع ہے جو جلد ہی انشاء اللہ بازار میں آ جائے گی۔

ان کتابوں کی تصنیف کے سلسلہ میں جامعہ اسلامیہ کے وائس چانسلر اور عالم اسلام کی مانی ہوئی عظیم شخصیت فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز ابن باز حفظہ اللہ کی طرف سے حافظ صاحب کی برابر حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ ساتھ ہی حافظ صاحب پر اعتماد کر کے جامعہ نے انہیں فراغت اور امتحان سے پہلے ہی اپنی کتاب کے ٹائٹل پر جامعہ کا فارغ شدہ اور سند یافتہ لکھنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

یہی فخر ان کے لیے کیا کم تھا کہ ایک عالمی اور ساٹھ سے زیادہ ممالک کی نمائندہ اپنے طرز کی واحد اسلامی یونیورسٹی انہیں فراغت اور امتحان سے پہلے ہی اعزازی سند سے نواز دے کہ مزید برآں اللہ کی رحمت کاملہ نے انہیں اتنی عظیم الشان کامیابی سے بھی نواز دیا۔ فللّٰہ الحمد

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز نے ان کے اب کی سال کے اس امتیاز کو ایک خاص اہمیت عطا کر دی ہے وہ ان کا سال بھر مقالات اور دو اہم کتابوں کی تصنیف وتالیف کے باوجود یہ امتیاز حاصل کرنا ہے۔ وہ اور احباب اس پر اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ اللہ کی توفیق ہی سے سب کچھ ہے۔

اب اخیر میں مجھے اپنے محترم دوست حافظ احسان اور اپنی قابل فخر جماعت اہل حدیث سے ایک بات عرض کرنی ہے۔

حافظ صاحب سے تو یہ عرض کرنا ہے کہ آپ سے یہ بات مخفی نہ ہو گی کہ حضرت

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کی حریت فکر کی خاطر قلمی کاوشوں، حضرت علامہ فاخر زائر الہ آبادی رحمہ اللہ (م ۱۱۴۴ھ) کی علمی جرأتوں، بطل جلیل حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی رسوم و بدعات کے خلاف علمی و عملی جدوجہد اور جذبہ سرفروشی نیز عملی جہاد اور مجدد عصر شیخ الاسلام شیخ الکل فی الکل حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کی انتھک ساٹھ سالہ تدریسی و تبلیغی تجدیدی مساعی نیز نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ (م ۱۳۰۷ھ) کی تصنیفی، تالیفی اور علوم و معارف اسلام کی نشر و اشاعت سے پیدا شدہ روح حریت فکر کی روشنی میں نشو ونما پائی ہو جماعت اہلحدیث نے نہایت اخلاص کے ساتھ پروپیگنڈہ اور تشہیر سے بے پروا فکری، علمی، تبلیغی، سیاسی اور عملی خدمات کا جو ڈیڑھ سو سالہ تاریخی اور عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے اور اس سلسلہ میں جتنی جانی و مالی قربانیاں اس جماعت نے پیش کی ہیں، کوئی دوسری جماعت اس کا عشر عشیر بھی نہیں پیش کر سکتی۔

ہندو پاک کی کوئی بھی دینی علمی، قومی یا سیاسی تحریک ان کے مؤثر کردار سے خالی نہیں! یہ حقیقت ہے جس کا اعتراف منصف مزاج مورخین مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ محمد اکرام آئی سی ایس مولانا غلام رسول مہر وغیرہ سب نے کیا ہے۔

تحریک مجاہدین تو خیر انہیں کی تھی! لیکن تحریک جمعیۃ العلماء کے اول محرکین و موسسین میں کیا جماعت اہلحدیث کے اکابر نہ تھے؟ احرار کن کے دم قدم سے آباد تھی؟ تحریک خلافت، کانگریس، تحریک ندوۃ العلماء اور مسلم لیگ میں سے کون ہے جو اس جماعت کے احسان اور علمی، عملی، فکری، تعاون سے انکار کر سکے۔

ان تمام تحریکات میں بحمد اللہ جماعت اپنے مسلک کو قربان کیے بغیر موثر کردار ادا کرتی رہی۔

کیا تحریک خلافت اور کانگریس سے مولانا عبدالقادر قصوری رحمہ اللہ، مولانا ابوالکلام

مرحوم، مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ، مولانا محمد ابوالقاسم سیف بنارسی رحمہ اللہ، خواجہ عبدالمجید اور مولانا محمد اسمٰعیل سلفی حفظہ اللہ وغیرہم کے نام محو کیے جا سکتے ہیں؟

اور کیا ندوۃ العلماء کی تاریخ شیخ الاسلام علامہ امرتسری رحمہ اللہ جنید وقت علامہ محمد ابراہیم آروی رحمہ اللہ، مولانا عبدالجبار عمرپوری اور علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ، نیز دوسری منزل میں شمس المحدثین امام وقت، علامہ شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ، مصلح وقت علامہ ابوسعید محمد حسین بٹالوی اور مولانا سید داؤد غزنوی، نیز علمی حیثیت سے فخر المتاخرین مولانا حفیظ اللہ صاحب اعظمی شارح تصریح رحمہ اللہ علامہ تقی الدین ہلالی، حضرت نواب سید صدیق حسن خان کے خاندان، آپ کے فرزند نواب علی حسن خان رحمہ اللہ مہتمم ندوۃ العلماء اور آپ کے عظیم کتب خانہ کا نام لیے بغیر مکمل ہو جائے گی؟

اور کیا مسلم لیگ کی تاریخ سے مولانا محمد ابراہیم میری سیالکوٹی رحمہ اللہ اور ڈاکٹر محمد فرید وغیرہ کے نام کھرچے جا سکتے ہیں؟

اور یہ تو چند نام ہیں، ان کے علاوہ سینکڑوں علماء ہیں جو خود مستقل تاریخ ہیں۔

رہا اسلامی دفاع تو یہ تو الحمد للہ اسلام کی ابتدائی تاریخ سے اب تک اسی غریب جماعت کا وظیفہ رہا ہے۔ قادیانیت ہو، یا آریت، بہائیت ہو یا شیعیت، انکار حدیث ہو یا انکار قرآن، عیسائیت ہو یا سناتن دھرم! ان سب کا دفاع کس نے کیا، یہ مولانا سید سلیمان ندوی سے پوچھیے یا شیخ اکرام سے پوچھیے!

لیکن صورت حال کا رخ انتہائی دردناک ہے یعنی چند حضرات کو مستثنیٰ کر کے اس وقت تک ہمارے سامنے جو حضرات بھی مورخ کے روپ میں آئے ہیں، انہوں نے بجائے تاریخ نگاری کے، تاریخ سازی کی ہے اور جماعت اہلحدیث کا نام تاریخ سے کھرچنے کی خاطر ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا ہے۔

''یقین نہ آئے تو مولانا محمد میاں فاروقی کی، علماء ہند کا شاندار ماضی دیکھ لی

جائے اور کسی حد تک اس ڈگر پر محترم منشی محمد ایوب صاحب قادری بھی چل نکلے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ ''تواریخ عجیب'' اور تعجب ہے کہ مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی کی کتاب ہندوستانی مسلمان، ان کے والد کا سفر نامہ ''ارمغان احباب'' بھی اس طرف غمازی کرتے ہیں پھر ان کے بھانجے محمد ثانی کی ترتیب دادہ ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری'' پڑھیے، جس میں شاید موصوف خانقاہی ذہنیت کے تحت تاریخ کو مسخ کرنے کے درپے ہو گئے ہیں۔ ایسے ہی اور لوگ ہیں جو محقق انصاف پسندی کا لبادہ اوڑھ کر وہ کچھ کر رہے ہیں جس کی جرات متعصب سے متعصب کو نہ ہو سکی تھی جس کی مثال میں مولانا عبید اللہ سندھی ہو سکتے ہیں۔

حیرت تو اس پر ہے کہ جس دار العلوم کا پلیٹ فارم اس کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے خمیر میں جماعت اہل حدیث کی بھی پوری مخلصانہ عملی و علمی مساعی واضح شکل میں شامل ہیں۔ فانا لله و انا اليه راجعون

ہاں! تو حافظ صاحب اور جماعت کی پوری نئی پود اور اپنے بھائی طلباء سے یہ عرض کرنا ہے کہ اپنے اسلاف کی اس بے نظیر اور عظیم الشان تاریخ سے ہند و پاک کے مسلمانوں کو واقف کرانے کی ذمہ داری ہمیں آپ پر عائد ہوتی ہے، اور ہر چہار جانب سے پھیلائے ہوئے اس زہر کا تریاق ہمیں آپ کو فراہم کرنا ہے۔

امید ہے کہ آپ کی غیور اور حق پسند طبیعت اس فریضہ سے غفلت نہ برتے گی اور مثبت انداز میں حالات و ظروف کے مطابق ملت کی خدمت کے ساتھ ساتھ ثانوی درجہ میں اس تلافی مافات کی بھی آپ کوشش فرمائیں گے!

اور جماعت سے عرض کرنا ہے کہ کوئی بھی فکری، علمی یا اصلاحی و تبلیغی تحریک نئے خون، نئے عزم و حوصلہ سے بھرپور نوجوانوں کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔

بحمد اللہ ایک اچھی خاصی تعداد اپنے اسلاف کے بعض علمی اختلافات کو بالائے

طاق رکھ کر نئے ولولوں سے معمور میدان میں آ رہی ہے، جو دوسری جماعتوں کے نوجوانوں سے علم وعمل، تحقیق وتفتیش وغیرہ میں بحمد اللہ کسی بھی طرح کم نہیں ہے!

کیا جماعت اس موقع پر اپنا فرض سوچ سکے گی اور ان کے عزائم اور ولولوں کے لیے میدان عمل فراہم کر سکے گی؟

اللہ ہمیں اخلاص اور حق کی توفیق دے۔ آمین!'' [1]

مدینہ یونیورسٹی سے علامہ شہید کا ایک خط

الاعتصام کے شمارے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کا یہ خط شائع ہوا۔ جب آپ مدینہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اس میں آپ کے مضمون، جو اہل حدیث تاریخ سے متعلق ہے، کا تذکرہ ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے اس کو بھی شامل کر دیا ہے۔

گرامی قدر!...... زید مجدکم، السلام علیکم و رحمة الله و برکاته.

الاعتصام میں لکھنے کو دل ہمیشہ ہی چاہتا رہا، لیکن پچھلے سال سے الاعتصام کی حالت دیکھ کر ترک تعلق کر بیٹھا۔ دوستوں نے لکھا بھی کہ اب ''وہ'' الاعتصام نہیں رہا بلکہ مولانا محی الدین نے اس میں بڑی تیزی سے نکھار پیدا کر دیا ہے لیکن طبیعت مائل نہ ہوئی اور پھر واقعی ایک دن ''الاعتصام'' آ دھمکا۔ مجھے خیال نہ تھا کہ وہ اس خوبصورتی اور عمدگی سے مرتب ہوگا۔ دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اب نئے سرے سے تعلقات استوار کرنے چاہئیں اور اس بہانے ''آپ'' سے تعارف بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ حاضر ہوں ''اہل حدیث کا ماضی حال اور مستقبل'' لیے ہوئے۔ اگر ممکن ہوا تو اپنی رائے سے آگاہ کر دیجیے گا۔

حضرت الامیر [2] کے مکتوب اور تازہ الاعتصام سے معلوم ہوا کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں۔ خداوند انہیں صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ آپ اس وقت جماعت کا بہت قیمتی

---

[1] ایک مکتوب از مولانا عبدالحمید رحمانی، الاعتصام 1967ء۔

[2] مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ مراد ہیں۔

سرمایہ ہیں۔ امید ہے انشاء اللہ اس کے بعد گاہے گاہے حاضر ہوتا رہوں گا، جماعت کے متعلق یہاں لبنان اور شام کے متعدد پرچوں میں میرے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ایک دوست کو جو جامعہ سلفیہ ہی کے فارغ ہیں، دیئے ہیں کہ وہ ان کو آج ہی الاعتصام میں ارسال کر دے۔ ایک مضمون نواب صدیق حسن رحمہ اللہ پر ہے دوسرا حضرت العلام حافظ محمد [1] صاحب پر اور دو جماعت کی تاریخ و تعارف پر۔

امید ہے آپ بمعہ احباب و اقارب خیریت سے ہوں گے۔ محترم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف و دیگر احبابِ جماعت کو سلام کہہ دیں۔

والسلام!

(حافظ) احسان الٰہی

نوٹ:...... الاعتصام جامعہ کے بجائے۔ ص.ب 185 المدینۃ المنورہ کے پتہ پر ارسال فرمایا کریں۔

مدینہ یونیورسٹی سے فراغت

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ یونیورسٹی سے فارغ ہو گئے آپ اس بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

"۱۹۶۷ء میں میں مدینہ یونیورسٹی سے اس اعزاز کے ساتھ فارغ ہوا کہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ۹۲ ممالک کے طالب علموں میں سے میری پہلی پوزیشن تھی۔ میں نے ساڑھے ترانوے فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔ کسی عرب یونیورسٹی سے اس امتیاز کے ساتھ ٹاپ کرنا اور وہ بھی کسی عجمی کا، یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا اور یہ کارنامہ سرانجام دینے کی سعادت میرے حصے میں آئی تھی۔" [2]

---

[1] افسوس قحط الرجال کا یہ عالم ہو گیا کہ نہ آج علامہ احسان الٰہی ظہیر جیسے لکھنے والے رہے کہ جن کے مضامین عالم عرب کے مجلے میں شائع ہوں اور نہ ہی حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ جیسی شخصیات کہ جن پر لکھا جا سکے۔

[2] علامہ شہید کے انٹرویوز، ص: 31۔

علامہ شہیدؒ کے اساتذہ کرام

ہم شروع میں علامہ شہید کے حفظ قرآن اور تجوید کے اساتذہ کرام ذکر کر چکے ہیں اب جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تک علامہ کے جن اساتذہ کرام کے حالات مل سکے، ان کا اختصار سے تذکرہ پیش خدمت ہے۔

(۱) امام المحدث حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

حافظ محمد ابراہیم بن فضل الدین، گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں گوندلانوالہ میں ۴ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ بمطابق ۲۷ جنوری ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے۔ [1] اس نسبت سے گوندلوی آپ کے نام کا حصہ بنا۔ جب کہ آپ کو حلقہ تلامذہ میں ''بڑے حافظ صاحب'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ آپ کی ذہانت اور حافظے کی مثالیں زبانِ زدِ عام و خاص تھیں۔ حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ نے تقریباً ستر سال بخاری شریف پڑھائی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ آج پنجاب میں بالخصوص اور پاکستان میں بالعموم شاید ہی کوئی اہل حدیث عالم ہو جو حضرت حافظ صاحب کا براہ راست یا بالواسطہ شاگرد نہ ہو۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ سے پہلے جامعہ سلفیہ میں استفادہ کیا اور

[1] تذکرہ حافظ محمد گوندلوی، ص: ۲۸۔ طبع مکتبہ قدوسیہ، لاہور

پھر کچھ دن مدینہ یونیورسٹی میں بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی شادی بھی حافظ محمد صاحب کی دختر محترمہ سے ہوئی۔ علامہ کو حافظ محمد صاحب سے پیار بھی بہت تھا اور عقیدت بھی بے پناہ۔ اسی طرح حافظ صاحب بھی علامہ سے بہت محبت رکھتے تھے۔

حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور طبیہ کالج دہلی سے حکیم محمد اجمل خان سے گولڈ میڈل حاصل کیا۔

(۲) الشیخ ابو البرکات احمد بن اسماعیل

جب علامہ احسان الٰہی ظہیر جامعہ اسلامیہ میں داخل ہوئے تب مولانا ابو البرکات احمد بخاری شریف پڑھاتے تھے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے آپ سے بھی صحیح بخاری پڑھی مولانا ابو البرکات احمد ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق جنوبی ہندوستان کے علاقے مدراس سے تھا۔ آپ تعلیم کے لیے دہلی تشریف لائے اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے حادثات کے سبب پنجاب آ گئے۔ پھر ایسے حالات پیدا ہوئے کہ باوجود کوشش کے مدراس واپس نہ جا سکے۔ حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی تحریک اور فرمائش پر ۱۹۵۱ء میں جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ میں پڑھانا شروع کیا۔ آپ گوجرانوالہ میں اگرچہ غریب الدیار تھے مگر ۱۹۵۷ میں آپ کے اعلیٰ کردار اور علمیت کے سبب گوجرانوالہ ہی کے ایک بزرگ مولانا نور الدین نے اپنی دختر نیک اختر کا نکاح آپ سے کر دیا۔

بہت سے معروف علماء آپ کے شاگردوں میں شامل رہے۔ مثلاً علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید، مولانا محمود احمد میرپوری، مولانا محمد علی جانباز، حافظ عبدالسلام بھٹوی، مولانا محمد اعظم، مولانا محمد شمشاد احمد سلفی ودیگر۔

آپ نے ۲۹ جولائی ۱۹۹۱ کو گوجرانوالہ میں وفات پائی۔

(۳) مولانا محمد شریف اللہ

علامہ احسان الٰہی ظہیر جامعہ اسلامیہ سے فارغ ہو کر جامعہ سلفیہ تشریف لے گئے تو وہاں آپ نے مولانا شریف اللہ سے استفادہ کیا۔ مولانا شریف اللہ مسلکاً حنفی تھے۔ میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ نے بھی جامعہ سلفیہ میں ان سے پڑھا تھا۔ علامہ احسان الٰہی شہید نے بھی مولانا سے علوم عقلیہ، فلسفہ اور منطق میں استفادہ کیا۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ اس زمانے میں مولانا شریف سے بڑا عالم ان علوم میں پاکستان میں کوئی نہ تھا۔ علامہ کے مدینہ یونیورسٹی کے استاد شیخ محمد علیہ سالم فرماتے ہیں کہ ''احسان الٰہی ظہیر منطق میں بہت زیادہ مضبوط تھے۔''

مدینہ یونیورسٹی میں آپ رحمہ اللہ کے اساتذہ

اب ہم مختصراً جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کے محترم و مکرم استادان گرامی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

شیخ بن باز عالم اسلام کا مشہور و معروف نام۔ جب علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو شیخ بن باز یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں ریاض میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا۔ ابتدائی عمر میں ہی علم حاصل کیا اور قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل بھی کی۔ ابھی آپ کم سن تھے کہ آنکھوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور بینائی چلی گئی۔ آپ علم کی دنیا میں ترقی کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ سعودی عرب کے مفتی اعظم کے درجے تک پہنچے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ نے چھوٹی بڑی کئی کتب بھی لکھیں۔ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ تیرہ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ شیخ بن باز ستائیس محرم الحرم کو ۱۴۲۰ھ میں فوت ہوئے اور مکہ مکرمہ میں دفن کیے گئے۔

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد لقمان سلفی جو خود بھی بڑے عالم ہیں اور شیخ کے سیکریٹری تھے بیان کرتے ہیں کہ علامہ اپنے استاد شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا بہت احترام کرتے تھے اور جب ملاقات کو آتے تو آپ کی اپنے استاذ کے پاؤں کی طرف احتراماً بیٹھتے اور شیخ ابن باز بھی اپنے اس شاگرد کی اور ان کی کتب کی اور دینی جدوجہد کی تعریف کیا کرتے اور بہت محبت کرتے تھے۔

(۲) الشیخ عبدالمحسن بن حمد العباد البدر رحمہ اللہ

آپ کا شمار مدینہ منورہ کے کبار علماء میں ہوتا تھا اور آپ مدینہ یونیورسٹی کے ”نائب رئیس“ تھے۔ یوں کہہ لیں کہ وائس پرنسپل تھے۔ ان کا مسجد نبوی میں وسیع حلقہ درس تھا۔ آپ کے سامنے علامہ نے مدینہ یونیورسٹی میں زانوے تلمذ طے کیا تھا۔ الشیخ عبدالمحسن علامہ شہید کے بارے میں ہمیشہ تعریفی کلمات کہتے۔ خاص طور پر آپ کی بدعت اور اہل بدعت کے ردّ میں کی جانے والی کاوشوں کی تعریف کرتے۔

(۳) الشیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ

شیخ البانی کے نام سے آج حدیث سے معمولی سا شغف رکھنے والا بھی واقف ہے۔ شیخ البانی اپنے وقت کے عظیم محدث یورپ کے ملک البانیہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد محترم کے ہم راہ دمشق کی جانب ہجرت کی اور مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ آپ کے علمی مقام کی بلندی کے سبب سعودی حکومت نے آپ سے جامعہ اسلامیہ میں تدریس کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ یہاں پڑھاتے رہے۔ آپ کی کتنی ہی کتب ہیں جو مشہور اور مقبول ہیں۔ جس میں ”سلسلة الاحاديث الصحيحة“ اور ”سلسلة الاحاديث الضعيفة“ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید نے آپ سے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ استاد شاگرد میں بہت محبت

تھی۔ علامہ بھی آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر علی بن موسیٰ ظہرانی لکھتے ہیں کہ ادب اور احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے شیخ احسان اور شیخ البانی کے بعض موضوعات پر مناظرے بھی ہوئے۔ ایک بار دونوں استاد اور شاگرد نے لندن اکٹھے سفر بھی کیا۔ راستے میں علامہ شہید شیخ البانی رحمہ اللہ کو دباتے رہے۔ شیخ البانی اس کا ذکر بہت محبت سے کیا کرتے کہ کیسے اس سفر میں علامہ نے ایک شاگرد ہونے کے ناطے ان کی خدمت کی۔

(۴) الشیخ ڈاکٹر امین الاشقہ

آپ بھی علامہ احسان الٰہی ظہیر کے مدینہ یونیورسٹی میں استاد تھے۔ آپ کئی کتب کے مصنف ہیں۔

(۵) الشیخ محمد شقرا

آپ کا تعلق اردن سے تھے۔ کئی کتب کے مصنف اور ادیب تھے۔ مسجد صلاح الدین اردن کے خطیب تھے۔ مدینہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تو علامہ شہید نے ان سے تعلیم حاصل کی۔

(۶) مولانا عبدالغفار حسن

پاکستان کے بڑے شیوخ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی بھی ان کے شاگرد تھے۔ مولانا عبدالغفار حسن مدینہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تو انہی دنوں علامہ شہید نے ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے بیٹے ڈاکٹر صہیب حسن ہیں جو برطانیہ میں قیام پذیر ہیں اور امیر جمعیت اہل حدیث برطانیہ بھی رہے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر سہیل حسن ہیں جو علمی دنیا میں ایک معتبر نام ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن علامہ سے بہت محبت رکھتے تھے میرے دوست حافظ وسیم اختر بیان کرتے ہیں کہ ایک بار مولانا عبدالغفار حسن نے علامہ کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ان کو

بتایا کہ علامہ بہت مودب اور احترام کرنے والے شاگرد تھے۔ علمی طور پر بہت مضبوط تھے۔ ایک روز مولانا عبدالغفار حسن سے کسی علمی مسئلے میں علامہ کی بحث ہوگئی اور علامہ بلند آہنگ تو پہلے سے تھے۔ بحث ومباحثہ میں آواز اور انداز ضرورت سے زیادہ تیز ہو گئے۔ گھر واپس آئے تو احساس ہوا کہ شاید استاد کی شان میں گستاخی ہوگئی۔ اپنی اہلیہ کو جو ان دنوں علامہ کے ساتھ مدینہ میں ہی قیام پذیر تھیں، ساتھ لیا اور اپنے استاد گرامی قدر کے گھر تشریف لے گئے اور جا کر اپنی بلند آواز کی معذرت طلب کی۔ استاد کا دل ایسا صاف ہوا کہ ان کی شہادت کے بعد بھی ان کی اس محبت اور سعادت مندی کا ذکر دعاؤں کے ساتھ کیا کرتے۔

(۷) الشیخ عبدالقادر شیبہ الحمد

آپ کا تعلق مصر سے تھا اور جامعہ الازہر سے فارغ تھے۔ پہلے مصر میں پڑھاتے رہے اور پھر سعودی عرب تشریف لے آئے۔ یہاں مختلف اداروں میں تدریس کی اور آخر میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں آ گئے۔ یہاں آپ بھی علامہ کے استاد تھے۔ آپ کئی کتب کے مصنف تھے۔

(۸) الشیخ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ

آپ موریطانیہ سے تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۶۷ھ میں حج کرنے سعودی عرب آئے پھر ادھر ہی ٹھہر گئے اور مدینہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے آپ مسجد نبوی میں درس بھی دیتے تھے اور حاضرین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ آپ کی کئی تالیفات ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت قرآن کریم کی ''تفسیر اضواء البیان'' کو حاصل ہوئی۔ آپ علامہ شہید کے تفسیر کے ہی استاد تھے۔ مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور شیخ ابن باز نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

(۹) شیخ عطیہ بن محمد بن سالم

آپ کا تعلق مصر سے تھا۔ ۱۳۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ عطیہ نے اپنی تعلیم بھی مدینہ میں حاصل کی اور پھر مدینہ یونیورسٹی میں ہی استاد مقرر ہوئے۔ علامہ شہید نے آپ سے بدایة المجتهد اور فقہ کی چند دیگر کتب پڑھیں۔ آپ علامہ سے بہت محبت کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ علامہ شہید کی کتاب بریلویت پر آپ نے تقریظ بھی لکھی تھی۔ ❶

❶ مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ کا یہ تعارف اختصار کے ساتھ میں نے ڈاکٹر علی ابن موسیٰ الظہرانی کی کتاب سے اخذ کیا ہے۔

یا اللہ! میری جدائی عارضی ہو۔ یا اللہ! میں اس پہاڑ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ تیرا رسول ﷺ بھی اس سے محبت کرتا تھا، مجھے مدینہ کا ذرّہ ذرّہ عزیز ہے۔ کیونکہ اس پر انسانیت کے سب سے بڑے محسن کے نقشِ قدم ثبت ہیں۔ (مدینہ یونیورسٹی سے پہلی واپسی پر)

پاکستان واپسی

1967ء کے وسط میں علامہ مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو گئے اور وطن واپس چلے آئے۔ کچھ روز اپنے گھر والوں کے ساتھ گوجرانوالہ قیام کیا۔ ان دنوں کا ایک دل چسپ واقعہ حاجی ظہور الٰہی صاحب کے کارخاص صوفی نذیر احمد صاحب نے مجھے سنایا جو علامہ کی اٹھان اور حاجی صاحب مرحوم کے مزاج کا عکاس ہے۔ علامہ واپس آتے ہی معاشرتی رابطوں میں مصروف ہو گئے۔ اخبارات میں کوئی نہ کوئی خبر لگ جاتی تھی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ مجلسی زندگی کا آغاز تو دوران طالب علمی ہو چلا تھا۔ حاجی صاحب کو یہ سب سخت ناپسند تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اب فارغ ہو گئے ہیں۔ اس لیے کسی مدرسے میں تدریس سنبھالیں مگر علامہ کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ ایک روز حاجی صاحب دکان پر بیٹھے تھے کہ دو افراد آئے اور آ کر نسبتاً ادب سے پوچھا کہ ''جی ہمیں احسان الٰہی ظہیر صاحب سے ملنا ہے۔'' اب حاجی صاحب سمجھ تو گئے لیکن ذرا بھولے بن کر اور استفہامیہ لہجے میں پوچھنے لگے:

احسان الٰہی ظہیر......؟؟

اب ظہیر پر زور تھا، اس صوتی کیفیت کو الفاظ میں شاید یوں لکھا جا سکتا ہے

"ظھیییییـــــر" اجنبیت اور لاعلمی کا اشارہ تھا۔ آنکھیں نیم وا کر تجاہل عارفانہ سے کے کہا "یار نذیر! یہ کس کا پوچھ رہے ہیں؟" ...... اب نذیر احمد کو بولنے کا موقع ملا۔ ہولے سے کہا "جی یہ اپنے احسان الٰہی کا پوچھ رہے ہیں۔"

"اچھا سانا سانا سانا۔

جاؤ یار! ان کو لے جاؤ! فلاں جگہ بیٹھا ہے۔"

اصل میں حاجی صاحب کو علامہ کی یہ "سیاست بازیاں" پسند نہیں آ رہی تھیں۔ ان کو لفظ ظہیر پر بھی اعتراض تھا۔ چاہتے تھے سیدھا سیدھا "احسان الٰہی" رہے۔ جیسے میں ساری عمر سیدھا سادہ ظہور الٰہی رہا ہوں۔ مگر ان کو معلوم نہ تھا احسان الٰہی تو کسی اگلی منزلوں کے مسافر ہیں۔ ایک مدرسے میں استاد بن کر ساری زندگی چند افراد کی تربیت ان کی منزل نہیں تھی۔ یہاں تو پوری قوم کا مستقبل اور فکر اور سوچ کی تبدیلی کا سامان ہو رہا ہے۔

علامہ نے اپنے لیے میدان عمل طالب علمی کے دور میں ہی چن لیا تھا۔ اور وہ تھا دین کی خدمت علم کے ذریعے نہ کہ کاروباری خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے محض ایک کاروباری آدمی بن کر رہ جانا اور کسی مدرسے میں چند ایک اسباق پڑھا لینا۔

یار وہ تو بولنے بھی نہیں دیتے

جب علامہ شہیدؒ پاکستان واپس آئے تو سب کے لیے حیران کن واقعہ تھا کیونکہ علامہ کو یونیورسٹی انتظامیہ نے وہیں پر تدریس کی پیش کش کی تھی اور کسی طالب علم کے لیے یہ اس دور میں تو کجا آج بھی ایک بڑی خوش قسمتی کی بات سمجھی جائے گی۔ لیکن علامہؒ اس پیشکش کو ٹھکرا کر وطن واپس چلے آئے۔ جب آپ واپس آ گئے تو ایک روز ان کے دوست نے پوچھا "آپ واپس کیوں آ گئے ہو؟ بھلا ایسے موقعے بھی کوئی چھوڑتا ہے۔"

احسان الٰہی ظہیرؒ نے جواب دیا:

''یار وہ تو بولنے بھی نہیں دیتے۔''

اندازہ کیجیے علامہؒ کی سوچ کا کہ وہ اپنی گفتار پہ پابندی کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بظاہر یہ ایک جملہ ہے کہ ''یار وہ تو بولنے بھی نہیں دیتے'' لیکن اپنے اندر سوچ اور معانی کا اک جہان سموئے ہوئے ہے اور اس کا صحیح مطلب اگر سمجھنا ہے تو علامہ کی مدینہ طیبہ سے واپسی کے ٹھیک بیس سال بعد لارنس روڈ پر ہونے والے مجلس شوریٰ کے اجلاس سے آپ کے خطاب کو سننا پڑے گا۔ جہاں آپ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا:

''میں اس ملک میں آزادی اظہار کے لیے لڑ رہا ہوں''

''اگر آپ لوگ میری اس جدوجہد میں شریک نہیں ہو سکتے تو کسی اور کو منتخب کر لیں، میں نہیں چل سکتا۔''

سوچنے کا مقام ہے وہ اپنے زمانہ طالب علمی سے شہادت تک اظہار کی آزادی پر سمجھوتہ نہ کر سکے اور ان کے بعد ان کی جماعت میں سب سے پہلے قدغن اسی بات پر لگائی گئی۔

انگلستان کے لیے سعودی پیش کش

مدینہ یونیورسٹی سے فراغت پر سعودی حکومت کی طرف سے علامہ کو برطانیہ میں دعوت و تبلیغ کے لیے ملازمت کی پیش کش بھی کی گئی جس کا ذکر علامہ نے ہفت روزہ ''چٹان'' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ میں کیا ہے: [1]

''اب بات زبان قلم پر آ ہی گئی ہے تو کہہ دوں کہ اس مقام پر میں دولت مندی کے سہارے نہیں، فقر کے آسرے سے پہنچا ہوں وگرنہ مجھے مدینہ

[1] ہفت روزہ چٹان: 26 فروری 1968ء۔ لاہور۔

یونیورسٹی نے جہاں سے کہ میں نے یونیورسٹی بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مجھے بہت بڑی تنخواہ پر انگلستان بھیجنے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن میں نے جمعیت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے الاعتصام کی ادارت اور چینیانوالی کی خطابت قبول کی تھی کہ میں انگلینڈ میں غنا پر پاکستان ترجیح دوں گا۔

مسافر کا نیا بسیرا، لاہور

شیخ محمد اشرف اپنے دور کے کتابوں کے بہت بڑے تاجر تھے۔ عموماً انگریزی زبان کی کتب کی تجارت اور نشر و اشاعت ان کا میدان تھا۔ گاہے اردو کتب بھی شائع کرتے، جس کے لیے اہل حدیث اکادمی کی بنا ڈالی۔ جب کہ انگریزی کتب کی دنیا بھر میں فراہمی کا وسیع کاروبار تھا۔ طباعت کی دنیا سے تعلق کے سبب مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی اشاعت کا انتظام و انصرام بھی شیخ صاحب کے ذمے تھا۔ اس طرح مسجد چینیانوالی کی انتظامیہ میں شیخ محمد اشرف سیکرٹری جنرل کے عہدے پر متمکن تھے۔

حدیث منزل ایبک روڈ کے ایک کمرے میں سفید براق چست پاجامے میں ملبوس نسبتاً بڑھی ہوئی داڑھی والے اس نوجوان لڑکے کا بازو تھام کے جب مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے شیخ اشرف کی طرف بڑھایا۔ ''لیجیے آپ کے لیے خطیب کا انتظام کر دیا ہے۔'' تو زمانے کے سرد و گرم چشیدہ شیخ محمد اشرف کے ماتھے پر شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔ سید داؤد غزنوی کے بعد مسجد چینیانوالی کا منبر کسی بھی بڑی شخصیت کے وجود سے ناآشنا تھا۔ تاریخی حیثیت کی حامل اس مسجد کا ہمیشہ سے اپنا الگ ہی مقام رہا ہے۔ شیخ صاحب کچھ عرصے سے اس مسئلے کی وجہ سے پریشان تھے۔ مولانا اسحاق رحمانی کے آنے

سے حالات بہتر تو ہو چلے تھے لیکن وہ سرگودھا چلے گئے۔ چھ ماہ کے لگ بھگ خطبات میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی نے ارشاد فرمائے کہ اس مسجد میں قائم مدرسے کے استاد تھے لیکن خطابت کی دنیا کے آدمی نہ تھے۔ آج جب مولانا سلفی نے ایک ۲۶ سالہ نوجوان لڑکے کا بازو پکڑ کر یہ جملہ کہا کہ ''لیں جی شیخ صاحب! آپ کے لیے خطیب کا انتظام ہو گیا ہے'' تو شیخ صاحب مولانا سلفی کے احترام میں کچھ نہ بولے البتہ اتنا ضرور منہ سے نکل گیا ''چلیں دو چار جمعے پڑھوا کر دیکھ لیتے ہیں۔'' مایوسی شیخ صاحب کے لہجے میں نمایاں تھی۔

مسجد چینیانوالی میں پہلا جمعہ

اگست کا مہینہ، 1967 کا سن ہے۔ مسجد چینیانوالی کے نئے خطیب تشریف لے آئے۔ حافظ احسان الٰہی ظہیر نے آج پہلا خطبہ دینا ہے، سفید کرتا، تنگ پاجامہ پہنے منبر پر کھڑے ہوئے، نمازیوں کی صرف دو صفیں ...... جو مدت مدید سے مسجد کا معمول تھا، آج بھی ہیں۔ شیخ اشرف دوسری صف میں ہیں اور سوچوں میں غلطاں کہ دیکھیے ''کیسا'' رہتا ہے؟ خطیب نے سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے گفتگو شروع کی کہ خطیب کو نبی کریم ﷺ سے غیر معمولی پیار جو تھا۔ ان کے برادر مکرم پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی نے ایک روز مجھے کہا کہ ''بھائی جان کو شاید میری نسبت نبی مکرم ﷺ سے کئی گنا زیادہ پیار تھا۔''

اکہرے بدن کے ساتھ بھاری بھرکم آواز میل تو نہ کھا رہی تھی مگر دکھائی پڑتا تھا کہ ''لڑکا'' پختہ عالم ہے۔ خطبہ ختم ہوا اور شیخ صاحب کچھ مطمئن سے نظر آئے۔ یہ منظر کشی میرے والد محترم کے شاگرد اور اس مدرسے کے طالب علم محمد عثمانی نے کی، جن کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اور علامہ کے اس پہلے جمعے میں شریک تھے اور ۲۰ برس بعد مارچ 1987ء کے آخری خطبہ جمعہ میں بھی موجود تھے۔

خطبہ جمعہ کے بعد مسجد کے مستقل نمازی مل بیٹھے۔ کسیرا بازار کے تاجر حاجی غلام رسول نے ایک دم کتنے ہی اعتراض کر دیئے، اس اعتراف کے ساتھ ''خطیب تو

عمدہ ہے لیکن بچہ ہے۔ یہ منصب تو بہت بڑی شخصیات کا ہے، اس نے ٹیڈی پاجامہ پہنا ہے، داڑھی بھی چھوٹی ہے اوپر سے ''شیخ پتر'' ہے جانے چلتا بھی ہے یا نہیں۔'' پاس بیٹھے صوفی نذیر الدین بولے ''چلنے دو ابھی، دیکھیں تو سہی۔ اور جو خطبہ اس نے بیان کیا ہے، کیا اس میں کمزوری ہے؟'' انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ ''مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آیا ہے، یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔'' شیخ محمد اشرف تو پہلے ہی آپ کے خطبے سے متاثر ہوئے بیٹھے تھے۔ یہ ہی فیصلہ ہوا کہ ان کو خطبہ جمعہ جاری رکھنے دیا جائے۔ دو سو پچاسی روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ پھر بہت جلد وہ وقت بھی آیا کہ علامہ نے تنخواہ تو چھوڑ دی اور پھر عمر بھر مدرسے اور مسجد کا بیشتر خرچ اپنی جیب سے ادا کیا۔ یوں جو تنخواہ مسجد سے وصول کی، اس سے کئی سو گنا واپس لوٹا دی۔

جہاں تک نمازیوں کی تعداد کا تعلق ہے تو محمد عثمانی بتاتے ہیں کہ سید داؤد غزنوی کے دور میں بھی مسجد کے اندرونی ہال میں عموماً دو یا کبھی تین صفیں نمازیوں کی ہوتی تھیں اور سردیوں میں سید صاحب رحمہ اللہ منبر اٹھوا کر باہر صحن میں رکھوا دیتے کہ دھوپ میں نماز ادا کی جائے۔

پھر ''حافظ'' احسان الٰہی کے خطیب بننے کے کچھ ہفتوں بعد ہی معاملات یہاں تک پہنچ گئے کہ قاضی مقبول احمد کہتے ہیں کہ ''ایک روز شیخ محمد اشرف نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے گئے۔ سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے کہ یار عجیب ہی معاملہ ہو گیا ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں بھی دو تین سے زیادہ صفیں نہیں ہوتی تھیں لیکن اب تو عجیب ہی منظر ہے کہ سارا ہال صحن مدرسہ اور ساتھ سکول کے کمرے بھی بھر جاتے ہیں اس کے باوجود بھی جگہ کم پڑ جاتی ہے۔''

ہم تو آخری چند سالوں کے نمازی تھے۔ ہم نے تو اس سے بھی بڑھ کر مناظر دیکھے ہیں۔

”علامہ“

آپ لاہور کی سیاسی اور معاشرتی زندگی سے صرف متعارف ہی نہیں ہو رہے تھے بلکہ بہت تیزی سے برسوں کا سفر ہفتوں میں نہیں، دنوں میں! جی ہاں دنوں میں طے کر رہے تھے۔ ان ہی دنوں کی یاد مجیب الرحمان شامی تازہ کرتے ہیں۔

”احسان الٰہی ظہیر سے میری پہلی ملاقات موچی دروازے کی جلسہ گاہ میں ہوئی تھی ...... وہاں وہ تقریر کرنے نہیں سننے آیا تھا ...... یعنی اس وقت وہ تقریریں کرنے نہیں، سننے بھی جلسوں میں جاتا تھا ...... ایک دم نوجوان تھا دبلا پتلا نہ ہو، تو موٹا بھی نہ تھا ...... مجھ سے بس چند ہی برس بڑا ...... ایسے چند برس جو بڑے کو بڑا نہیں بننے دیتے، اور چھوٹے کو چھوٹا نہیں رہتے دیتے ...... بڑا اپنے آپ کو لاکھ بڑا سمجھے، وہ بڑا بن نہیں پاتا۔ چھوٹے اس کے برابر کھڑے رہتے ہیں ......اور، اس کو اپنے برابر کا بنا کر چھوڑتے ہیں۔ وہ اس وقت سیدھا علامہ نہیں، حافظ تھا۔ حافظ احسان الٰہی ظہیر، اہل حدیثوں کے آسمان پر اڑنے کی کوشش میں مصروف ......تقریر کرنے کا شوق اس کو اس وقت بھی تھا ......شہرت کے پر اس کو لگتے جا رہے تھے ...... کئی دوست کہتے تھے، مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر ایک نوجوان آیا ہے ...... اس میں کچھ ہے، کچھ بننے کی آرزو ہے اور کچھ کرنے کی تمنا ......اپنے آپ کو بہت کچھ نہ سہی، کچھ سمجھتا ضرور ہے۔“

تھوڑے پہ کوئی سمجھوتہ نہیں

علامہ رحمہ اللہ کے ارادے شروع سے ہی ہر میدان میں بلند رہے۔ محمد عثمانی نے ایک دل چسپ واقعہ ان دنوں کا سنایا۔

”ایک روز علامہ رحمہ اللہ جمعہ پڑھانے کے بعد باہر کسیرا بازار میں جا رہے تھے کہ

محمد عثمانی کہنے لگے "بھائی جان میرے ایک عزیز نے سکوٹر خریدا ہے، آپ بھی ایک سکوٹر لے لیں۔" اس پر علامہ رحمہ اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا "چھوڑو یار سکوٹر کیوں لینا ہے، کچھ روز ٹھہر جاؤ، گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوں گی۔" یہ 1969ء کا واقعہ ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ صرف دو سال بعد علامہ نے گاڑی خرید لی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ ٹھیک سترہ برس بعد 1986ء میں علامہ اور محمد عثمانی اسی جگہ سے گزر رہے تھے کہ محمد عثمانی کو وہ بات یاد آ گئی۔ آپ نے علامہ کو کہا "آج سے سترہ سال پہلے میں نے اسی جگہ سے گزرتے آپ سے یہ فرمائش کی تھی اور آپ کا یوں جواب تھا۔" علامہ کو یاد آیا اور بہت خوش ہوئے۔ اگلے روز مسجد آئے تو ایک طرف لے گئے اور چپکے سے تین ہزار روپے محمد کے ہاتھ میں دیئے اور کہا "یہ اپنی والدہ کے ہاتھ میں دینا اور باجی سے کہنا کہ دعائیں جاری رہنی چاہئیں۔" محمد عثمانی کے تمام خاندان کا علامہ سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔

ستمبر 1967ء

میں نے جب اس حوالے سے کھوج شروع کی کہ کب علامہ مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئے اور کب مسجد چینیانوالی کی خطابت سنبھالی اور کس عمر میں جماعت کے ترجمان مجلّے "الاعتصام" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو میرے لیے حیرت میں ڈوب جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جولیس سیزر نے اپنی فتوحات کی خبر بادشاہ کو ان الفاظ میں بھجوائی تھی:

I concored, I saw, I came "میں آیا، ...... میں نے دیکھا ...... میں نے فتح کر لیا۔"

یہاں بھی کچھ ایسا ہی سماں تھا۔ شیخ محمد اشرف نے دو تین جمعے پڑھانے کے لیے "ٹرائل" پر احسان الٰہی ظہیر کو رکھا تھا۔ اگست کے دو یا تین جمعے پڑھانے کے بعد ستمبر 1967ء کے "الاعتصام" کے پہلے ہفتے کے شمارے میں اشتہار شائع ہوا کہ "جامع اہل حدیث مسجد چینیانوالی میں مولانا حافظ احسان الٰہی ظہیر فاضل مدینہ یونیورسٹی یکم ستمبر

ایک لطیفہ

میاں فضل حق مرحوم اور علامہ شہید کے آپس میں اختلافات تھے اور آج دونوں بزرگ اس جہاں سے جا چکے ہیں۔ 23 مارچ کے حادثے تک یہ اختلافات ایک حقیقت تھے۔ آج جب ترجمان الحدیث کے نئے شمارے آتے ہیں تو ان پر لکھا ہوتا ہے بانی علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمۃ اللہ علیہ اور بیاد میاں فضل حق رحمہ اللہ۔ معلوم نہیں اس پہ کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ یہ خلاف واقعہ ہے میاں صاحب مرحوم کا اس مجلّے سے مخالفت کا تعلق تو ضرور تھا۔ محبت کا نہیں، تو بیاد میاں فضل حق لکھنا کیسے روا ہے؟

تصریحات کے نام سے مجلّے کا اداریہ کافی عرصہ علامہ خود لکھتے رہے۔ آپ ان کے پہلے اداریے سے چند سطور پڑھتے ہیں۔

"اس موقع پر جب کہ ہم ترجمان الحدیث کا پہلا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہم انہیں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ رب ذوالجلال کی مدد و حمایت سے "ترجمان" جب تک زندہ رہے گا، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمان اور کفر و الحاد کے راستے میں کوہ گراں بن کر زندہ رہے گا اور اس راہ میں نہ تو دنیا کی کوئی قوت و طاقت اسے تحریص و ترغیب سے خرید سکے گی اور نہ ہی تخویف و تہدید سے اسے کلمہ حق کہنے سے باز رکھ سکے گی اور ہم کمزور اور ناتواں بندے اس راہ کی کٹھنائیوں کو جانتے ہوئے اور اس راستے کی مشکلات کا علم رکھتے ہوئے اپنے مالک کے فضل و کرم سے اپنے اندر اس قدر حوصلہ رکھتے ہیں کہ اسلام کی عظمت، قرآن کی حرمت اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کے لیے اپنا سب کچھ مٹا دیں اور اپنی معاش، اپنے مستقبل، اپنی آبرو اپنے ناموس حتیٰ کہ اپنی زندگی کو بھی اس مقصود کے لیے قربان کر دیں گے اور اپنے پائے عزیمت میں لغزش نہ آنے دیں گے۔"

یہ تھا وہ عزم جس پہ علامہ ''ترجمان الحدیث'' کے اجرا کے پہلے دن کاربند ہوئے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عزم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا اور وہ دن بھی آ گیا کہ انہوں نے اپنے اس اداریے کی لاج رکھتے ہوئے اپنی جان اللہ کے حضور قربان کر دی مگر ''اپنے پائے عزیمت میں لغزش نہ آنے دی۔''

حق بات کہتے رہنا اور کسی مداہنت اور مصلحت کے بغیر حق بات لکھتے رہنا اور اس پر استقامت دکھانا حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر طرہ امتیاز تھا۔ ''الاعتصام'' کی ادارت کے بعد آپ نے اس روایت کو اپنے ذاتی پرچے میں اوج کمال تک پہنچا دیا۔ لا محالہ اس راستے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا سامنا آپ کو بھی کرنا پڑا ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزری ہے سو گزری

تنہا پس زنداں ، کبھی رسوا سر بازار

ان مشکلات کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جس کے راوی آپ کے رفیق مولانا عبدالصمد ریالوی ہیں جو ترجمان کے عملے کا حصہ تھے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ:

''بسا اوقات پریس کے مالک شیخ محمد اشرف مرحوم پرچہ چھاپنے سے انکار کر دیتے تھے جس کی وجہ حکومت وقت کے خلاف علامہ کے قلم کی تیزی ہوتی تھی۔ مگر علامہ کے تسلی دینے اور تمام معاملات کی ذمہ داری اپنے سر لینے کی یقین دہانی سے وہ پرچہ چھاپنے پر تیار ہو جاتے تھے۔'' [1]

تصریحات کے عنوان سے شائع ہونے والے اداریے ایک مستقل تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں نے ''الاعتصام، مجلہ اہل حدیث اور ترجمان الحدیث'' میں شائع ہونے والے آپ کے اداریے بھی مرتب کر دیئے ہیں۔ ان شاء اللہ جلد طبع

کرنے کا ارادہ ہے۔

علامہ شہید کے ایم-اے اور قانون کی ڈگری

آپ پڑھ چکے ہیں کہ علامہ 1967ء میں مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر پاکستان واپس آئے۔ پھر اُسی سال اگست 1967ء میں مسجد چینیانوالی میں خطیب مقرر ہوئے۔ ستمبر 1967ء میں مجلّہ ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور نومبر 1969ء میں اس سے الگ ہو کر ''ترجمان الحدیث'' کا اجراء کیا اور ساتھ ساتھ ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کی ادارت بھی چل رہی تھی۔ ان مصروف سالوں میں جب آتش جوان ہی نہ تھا، طبع میں پارہ صفت بھی تھا تاریخ و ادب میں فرسٹ ڈویژن میں ایم-اے کیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے فارسی، اردو، سیاسیات، عربی اور تاریخ میں ایم-اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور کراچی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔ [2]

علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کراچی یونیورسٹی سے قانون کا امتحان پاس کیا۔ اس طرح وہ وکیل بھی ہو گئے۔ علامہ اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ

''یہ ڈگریاں حاصل کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ ایک اسلامی طالب علم کو جو علوم حاصل کرنے چاہئیں وہ کیے جاسکیں۔''

علامہ شہید کے لائق فرزند حافظ ابتسام الٰہی ظہیر بھی اس معاملے میں ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے، ان کی ڈگریوں کی تعداد علامہؒ سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر نے پہلے پہل تو انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے مکینکل انجینئرنگ کی تکمیل کی اور اس کے بعد ایم ایس سی کمپیوٹر سائنس، ایم بی اے، ایم اے ماس کمیونیکیشن، ایم اے اردو، سیاسیات، تاریخ، انگلش کیے اور ایم فل بھی کر چکے ہیں۔

---

[1] ترجمان الحدیث مارچ ۱۹۸۸ء۔ [2] سقوط ڈھاکہ، ص: ۷۳۔

ادارہ ترجمان السنۃ

میرے والد محترم عبدالخالق قدوسی (شہید رحمہ اللہ) ۱۹۶۶ء میں مسجد چینیانوالی میں تدریس کے واسطے مسند نشین ہوئے۔ اس سے پہلے وہ جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ میں یہ فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی لاہور آمد کے اگلے ہی برس علامہ احسان الٰہی ظہیر بطور خطیب یہاں مقرر کیے گئے۔ میرا گمان ہے ان کے آپس کے تعلقات اور تعارف کا آغاز تب ہی ہوا تھا۔ میرے والد محترم ملازمت کے ساتھ ہی مکتبہ قدوسیہ کا قیام عمل میں لے آئے تھے۔ انہی دنوں ان دونوں بزرگوں نے، تب بزرگ نہیں نوجوان تھے، کاروباری شراکت داری کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کاروبار کا میدان ان کے طبعی میلان کے سبب کتب کی نشر و اشاعت ہی ٹھہرا۔ میرے والد محترم اور علامہ شہید کی مشترکہ پسند، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ تھے۔ سو ان کی کتب کی اشاعت سے ہی یہ کاروبار شروع کیا گیا۔ ادارے کا نام ''ادارہ ترجمان السنۃ'' رکھا گیا۔ سب سے پہلے مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر ثنائی تین جلدوں میں شائع کی گئی اور اس کے علاوہ مولانا کے حالات پر مشتمل کتاب ''نقوش ابوالوفا'' بھی شائع ہوئی۔ ان کتب کی اشاعت کا معیار اس دور کے مطابق بہت اعلیٰ تھا۔ میرے والد محترم اور علامہ شہید بہت دن تک ساتھ نہ چل سکے۔ میرے والد محترم کے آخری دنوں کا ذکر ہے کہ میں

نے ایک روز ان سے پوچھا آپ دونوں نے مل کر ادارہ ترجمان السنہ قائم کیا اور آپ آغاز میں ہی الگ ہو گئے، کوئی رنجش کوئی شکوہ تو ہوا ہو گا ایک دوسرے سے۔ آپ مسکرا دیئے...... فرمانے لگے:

"بالکل بھی نہیں اصل میں کچھ دنوں میں ہی ہم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کاروباری دنیا میں ہمارے مزاج یکسر جدا ہیں۔ علامہ بہت تیز رفتار تھے اور میں بہت سکون اور آرام سے کام کرنے کا عادی۔ تفسیر ثنائی ہم نے مل کر شائع کی تھی۔ ہم نے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور اپنے اپنے حصے کی کتاب تقسیم کی، ذرا بھی تلخی نہ ہوئی اور الگ ہو گئے اور دل چسپ معاملہ یہ تھا کہ علامہ اپنے حصے کی کتاب چند ہفتوں میں دکان داروں کو بیچ کر فارغ ہو گئے اور میں نے اپنے حصے کی کتاب بہت دیر میں فروخت کی۔"

تفسیر ثنائی کی کتابت مولانا اقبال کیلانی کے والد محترم مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ نے کی تھی۔ اس کتاب کی کتابت میں کمال یہ تھا کہ قرآنی آیات اور ان کے ترجمے وتفسیر کو ایک ہی صفحہ پر بہت شان دار طریقے سے تقسیم کیا گیا تھا۔ میں نے مکتبہ قدوسیہ کے زیر اہتمام جدید کمپوزنگ پر یہ کتاب شائع کی تو اس نسخے کو سامنے رکھا تب اندازہ ہوا کہ یہ کس قدر دماغ سوزی کا کام تھا۔ جو کوئی پختہ عالم و فاضل ہی انجام دے سکتا تھا اور مولانا محمد ادریس کیلانی کے علم اور تقویٰ کا تو شہرہ ہے۔ کتابت میں بھی ذہانت اس کتاب سے عیاں ہے۔

ادارہ ترجمان السنہ کے زیر اہتمام علامہ شہید نے اس کے بعد دو اور بہت قابل قدر کتب شائع کیں۔ ایک دو جلد پر مشتمل فتاوی ثنائیہ تھا۔ جو مولانا محمد داؤد راز [1] نے

[1] مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ کی آٹھ جلدوں پر مشتمل صحیح بخاری کی شرح الحمد للہ مکتبہ قدوسیہ نے بہت عمدہ معیار پر شائع کی ہے، جو بالکل نایاب ہو چکی تھی اور کسی کے پاس موجود بھی تھی تو خاصی خراب صورت میں۔ اس کو جدید انداز میں عصری تقاضوں کے مطابق شائع کیا گیا۔ تو مولانا داؤد راز کا نام جیسے دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اس کے بعد کئی اداروں نے اس کو سامنے رکھ کر شائع کیا۔

مرتب کیا تھا اور اس میں مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی رحمہ اللہ کے حواشی بھی تھے۔
اس کے ابتدائیے میں چند سطور جو علامہ نے لکھی جی چاہ رہا ہے آپ بھی پڑھیں:

”پچھلے برس یکم جون کو تفسیر ثنائی چھپواتے وقت میں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ جماعت اہلحدیث کی بے حسی اور اپنے اکابر و اسلام سے بے پروائی کے باوصف ہم اس کا تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ اپنے ان علمی ذخائر کو منظر عام پر لائیں۔ جو مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں اور جو اگر اب بھی بازار میں آ جائیں تو اس خلا کو بڑی حد تک پر کیا جا سکتا ہے جو اس وقت ہم میں پیدا ہو چکا ہے۔“ (ملخص)

احسان الٰہی ظہیر

مدیر ماہنامہ ”ترجمان الحدیث“ لاہور

ان دو بڑی کتب کے بعد ادارہ ترجمان السنہ نے تین جلدوں پر مشتمل فتاوی نذیریہ شائع کیا۔ یہ بھی ایک بڑا کام تھا اور اس دور میں موجود ذرائع طباعت کے مطابق نہایت معیاری بھی تھا۔

ان کتب کے علاوہ ادارہ ترجمان السنہ نے ”نقوش ابو الوفا“ ایک جلد میں شائع کی۔ یہ کتاب مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حالات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ تھا۔ جو مولانا امام خان نوشہرویؒ نے جمع کیا تھا۔ قریباً چار صد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں علامہ نے اس کا دوسرا حصہ جلد شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جو شائع نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ غنیمت ہے۔ اس وقت سیرت ثنائی از مولانا عبدالمجید سوہدروی اور نقوش ابو الوفا کے علاوہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حالات جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہمارے اہل حدیث حضرات کی اپنے بزرگوں کے حالات کے ضمن میں یہ لا پرواہی بہت افسوس ناک ہے...... مجھے وہ دن یاد ہے کہ جب جامعہ سلفیہ کے اشرف جاوید صاحب میرے پاس تشریف

لائے۔ آپ میرے والد کے ہم ذوق دوست تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ مولانا اسحاق بھٹی صاحب سے بات کریں اور ان کے مضامین شائع کریں جو انہوں نے شخصیات پر لکھے ہیں۔ میں نے اسی مجلس میں کہا کہ آیئے ان کی طرف چلتے ہیں۔ ان کو اسحاق بھٹی صاحب کے گھر کا پتا تھا۔ ہم چل دیئے۔ ہم اسحاق بھٹی صاحب کے گھر جا پہنچے۔ وہ بہت خوش ہو کر ملے۔ چائے پلائی اور آمد کا مدعا پوچھا۔ ہم نے اپنی عرض گزاری کہ آپ نے شخصیات پر جو مضامین لکھے ہیں ان کو شائع ہونا چاہیے۔ اسحاق بھٹی صاحب نے اتفاق کیا اور یوں اس سلسلے کی پہلی کتاب نقوش عظمت رفتہ شائع ہوئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے بھٹی صاحب کی درجن بھر سے زائد کتب شائع ہوئیں چند کتب دیگر اداروں نے بھی شائع کیں۔ صرف مکتبہ قدوسیہ نے نو (۹) کتب شائع کیں جو یہ ہیں:

(۱) نقوش عظمت رفتہ (۲) بزم ارجمنداں (۳) ہفت اقلیم (۴) برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن (۵) دبستان حدیث (۶) گلستان حدیث (۷) چمنستان حدیث (۸) مولانا احمد دین گکھڑوی (۹) قافلہ حدیث

ان کتب میں مجموعی طور پر ایک ہزار کے لگ بھگ اہل حدیث علماء کے حالات کا ذکر آ گیا ہے۔ یہ اسحاق بھٹی صاحب کی کمال درجے کی خدمت ہے اور ممکن ہے آپ میری یعنی ابوبکر قدوسی کی بھی خدمت شمار کریں جو اس مسلک کے لیے میں کر سکا۔ البتہ دل چسپ امر یہ ہے کہ جب بعض ''کوتاہ بین'' افراد نے چند سال قبل علامہ شہید کے بارے میں ایک پمفلٹ میں ہرزہ سرائی کی تو میں نے دکھی دل سے اس سلسلے کو موقوف کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس سوچ کے تحت کہ میں نے تو ہزار کے لگ بھگ اہل حدیث علماء کے حالات کو محفوظ کر لیا اور ہمارے اپنے بزرگ کی ان لوگوں کے ہاتھوں بعد از مرگ بھی عزت محفوظ نہیں اور آئندہ کسی مزید شخصیت پر کتاب شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس پر دوستوں نے مزاحمت کی اور یہ سلسلہ جاری رہا اور تا حال جاری ہے کہ

''چمنستان حدیث'' کہ جس میں ....شخصیات کا تذکرہ ہے۔ وہ ابھی طبع ہوئی ہے اور اس سے اگلا مرحلہ ''بوستانِ حدیث'' کمپوزنگ کے مرحلے میں ہے۔ نقوش ابو الوفا کے تذکرے میں چلتے چلتے یہ سطور نوک قلم پر آ گئیں۔ واپس چلتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ کی کتاب ''الوسیلۃ'' کا اردو ترجمہ بھی ادارہ ترجمان السنہ نے ان ہی دنوں شائع کیا۔ یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا ہے۔ سرورق پر ''اعداد وتقویم از احسان الٰہی ظہیر'' کے الفاظ سے یہ کتاب علامہ کے نام سے معنون ہوگئی۔

اس طرح ادارہ ترجمان السنہ کا ایک بڑا کام فتاوی نذیریہ کی اشاعت تھی۔ تین جلد پر مشتمل یہ فتاوی مولانا نذیر حسین محدث دہلوی اور ان کے بعض شاگردوں کے فتاوی جات پر مشتمل تھا۔ اسی کی تصویر لے کر چند سال قبل سرگودھا سے یہ دوبارہ شائع ہوا تھا۔

یہ تمام کتب ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک کے عرصے میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد علامہ بہت مصروف ہو گئے اور ادارہ ترجمان السنہ کے تحت صرف اپنی تصنیف شدہ کتب ہی شائع کر سکے جن کا تفصیلی تذکرہ باب ''کتابیں ہیں چمن اپنا'' میں آپ پڑھ سکیں گے۔ بہر حال اس دور میں جب کمپیوٹرز تو دور کی بات، ہاتھ کی کتابت کے علاوہ وسائل بھی محدود تھے علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید نے یکے بعد دیگرے یہ بڑی بڑی کتب شائع کر کے ایک کارنامہ انجام دیا۔

میرا عزم

مجھے حق گوئی و بے باکی سے کوئی چیز نہیں روک سکتی کیونکہ میں نے اپنی جان، جسم، مال اور عزت کو اپنے رب کی رضا اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے وقف کر رکھا ہے میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العلمین ہی کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اوّل فرماں بردار ہوں۔ میری جان، میری عزت، میرا مال اللہ تعالیٰ کے دین و شریعت اور سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد ﷺ کی سنت پر فدا ہے۔

((فَإِنَّ أَبِي وَوَالِدَتِي وَعِرْضِي لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُم وِقَاءِ التَّصَوف))

مسجد چینیانوالی میں

یہ عالی شان اور تاریخی مسجد مغل بادشاہ شاہ جہاں کے عہد میں گورنر لاہور سرفراز خان نے تعمیر کی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر کا قصہ بھی دل چسپ ہے۔ انقلاب زمانہ کے سبب جب اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو اقتدار سے معزول کر کے تاج وتخت پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان بھر میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ تو کسی نے اورنگ زیب کے کان بھر دیے کہ گورنر لاہور سرفراز خان، شہزادہ دارا شکوہ کا حامی ہے اونگ زیب نے حکم جاری کیا کہ اس کی جائیداد ضبط کر کے اس کو عہدے سے معزول کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ حکم سرفراز خان تک پہنچتا اس کو ذاتی ذرائع سے پہلے ہی خبر مل گئی۔ اس نے فوراً اپنی تمام تر جائیداد فی سبیل اللہ وقف کر کے اپنی حویلی کو گرانا شروع کر دیا اور یہاں تعمیر مسجد کا اعلان کر دیا۔ اورنگ زیب کو خبر ملی تو نہایت خوش ہوا اور گورنری کے عہدے پر بھی بحال رکھا اور تعریف کے ساتھ اس کو مزید جائیداد عطا کر دی۔

مسجد کے مشرق میں داخلی دروازہ تھا جس کی پیشانی پر یہ شعر درج تھا:

طرفہ معمار فرد تاریخ سال
گفت زیبا مسجد از افراز خان

اس کے مصرع ثانی سے تاریخ ۱۰۸۲ ہجری نکلتی ہے۔ جبکہ مسجد کے اندر محراب پر درج تاریخ ۱۰۸۰ ہے۔ یقیناً یہ دو سال کا عرصہ تعمیر کا ہوگا۔ ❶

اس مسجد کے تین گنبد تھے۔ جو مسجد وزیر خان کی طرز میں تعمیر کیے گئے تھے۔ اسی طرح مسجد میں تین محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ درمیان محراب جہاں خطیب کھڑا ہوتا تھا نسبتاً بڑی اور کشادگی لیے ہوئے تھی۔ اسی طرح اور یہ گنبد بھی اس ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں تقریباً آٹھ فٹ کے دو ستون نماز حصے تھے جو اوپری گنبدوں کے لیے بنیاد کا کام دے رہے تھے۔ جبکہ پچھلا حصہ شمالاً جنوباً بغیر کسی انقطاع کے دو صفوں پر مشتمل تھا اس سے آگے وسیع صحن تھا۔ صحن میں بھی مسجد کی پیشانی پر بنی محرابوں میں نہایت خوش رنگ اور عمدہ خطاطی میں قرآنی آیات اور فارسی اشعار تحریر ہیں۔ صحن کے اختتام بھی شمال کی دیوار میں ایک دروازہ نکالا گیا ہے۔ جب کہ مرکزی داخلی دروازہ مشرق میں ہی ہے۔ جس سے داخل ہوتے ہی دائیں طرف وضو خانے ہیں۔

تحقیقات چشتیہ کے مصنف نور محمد چشتی مسجد کے صحن میں ایک حوض کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جو کہ ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح مسجد کے صحن کے آخر میں اساتذہ کیکمرے اور سکول ہے جو کہ میرا گمان ہے کبھی مسجد کے صحن کا حصہ رہے ہوں گے اگر ان کو شامل کرلیا جائے تو صحن کی وسعت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب آیئے مسجد کے موجودہ دور کی طرف۔ ۱۹۸۷ء تک ہم اس مسجد میں مستقل جاتے رہے اور عمارت کی یہ شکل وصورت، کتبے اور خطاطی کے نمونے جن کا میں نے اختصار سے ذکر کیا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ نہایت مضبوط، شاندار اور تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ لیکن کچھ برس پہلے مسجد کی انتظامیہ نے اس تاریخی مسجد کی تعمیر نو کے واسطے اس کو منہدم کر دیا۔ جب سنا تو دل کو بے حد صدمہ ہوا۔ ممکن ہے تعمیر نو وقت کا تقاضا

❶ تاریخ لاہور از کنہیا لعل، ص: ۱۹۰، طبع مجلس ترقی ادب لاہور

رہا ہو۔ مگر کوئی صورت تو ہو ہی سکتی تھی اس تاریخی عمارت کے انہدام سے بچنے کی۔

مسجد چینیانوالی محض اپنی تاریخ عمارت کی وجہ سے ہی اہم نہیں رہی تھی بلکہ اس سے بہت سے مشہور اور قد آور اصحاب علم و فضل کا تعلق رہا ہے اور کتنی ہی بڑی شخصیات اس مسجد کے منبر و محراب سے متعلق رہیں۔ مثلاً مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا ابو القاسم، مولانا عبدالواحد غزنوی اور مولانا محمد حسین واحد رحمہ اللہ۔ یہ تمام بزرگ مختلف ادوار میں مسجد چینیانوالی کے خطیب رہے۔ جب کہ مولانا سید داؤد غزنوی نے اپنے عم محترم مولانا عبدالواحد غزنوی کی وفات ۱۹۳۰ء کے بعد اس مسجد کی خطابت سنبھالی۔ ❶ ان کی وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء ہے۔ ان کے بعد کچھ عرصے کے لیے مولانا محمد اسحاق رحمانی خطیب رہے۔ ان کے بعد میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی چھ ماہ خطیب رہے۔ تا آنکہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید ۱۹۶۷ء میں مسجد چینیانوالی کے خطیب مقرر ہوئے اور ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء تک تقریباً بیس برس خطابت کی۔

❶ نقوش عظمت رفتہ، از محمد اسحاق بھٹی، ص: ۸۰.

میں اپنے ایمان اور عقیدے میں سیاسی مصلحتوں کی آلودگی قبول کر کے اپنی سیاست کی دکان نہیں چمکا سکتا میں اس ملک میں قیامت تک اقتدار میں نہ آؤں مجھے کوئی غم نہیں ہوگا میں کلمۂ حق کہنے سے کبھی نہیں ہچکچاؤں گا۔

میدانِ سیاست میں

جب علامہ احسان الٰہی ظہیر مسجد چینیاں والی کی مسند خطابت پر فائز ہو گئے اور چند ماہ بعد ہی مرکزی جمعیت اہلحدیث کے ترجمان مجلّے ''الاعتصام'' کی ادارت بھی سنبھال لی تو یوں سمجھئے کہ اہل حدیث سیاست کے مرکزی دھارے میں شامل ہو گئے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کارکنان نیچے سے ترقی کرتے کرتے اوپر جاتے ہیں اور پھر اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر اپنا مقام طے کرواتے ہیں۔ یا پھر بڑے لیڈران کی اولاد ''ڈائریکٹ پرواز'' کرتے ہوئے سب کے سروں سے گزرتے ہوئے ''اوپر'' جا بیٹھتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف ثابت ہوا۔ علامہ احسان نہ تو کسی بڑے شیخ الحدیث کے بیٹے تھے نہ کسی بڑے سیاست دان کی اولاد، لیکن سیاست انہوں نے براہ راست مرکزی لیڈرشپ میں شامل ہو کر شروع کی۔ اس سے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''الاعتصام'' چونکہ مرکزی جمعیت کا ترجمان تھا۔ اس لیے اس کی ادارت کے ذریعے علامہ کا تعارف اہل حدیث حلقہ سے باہر بھی ہونا شروع ہو گیا۔ ''الاعتصام'' کی ادارت کے حوالے سے ہم لکھ چکے ہیں۔ تکرار سے بچتے ہوئے ہم اس باب کی مناسبت سے صرف سیاسیات تک رہیں گے۔ علامہ کی تحریر کی کاٹ اور ملکی معاملات پر آپ کے جاندار تجزیے سب کو احساس دلا رہے تھے کہ یہ نوجوان ذرا ''ہٹ'' کے ہے۔ ان دنوں

ایوب خان کے خلاف تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ مارشل لا کا خوف دم توڑ رہا تھا اور احتجاج کی تحریک ہر طرف پھیل رہی تھی۔ ایسے میں علامہ کے اداریے بہت جاندار تھے۔ کچھ نوجوانی کا جوش تھا اور کچھ فطری بہادری کہ علامہ کو حکومتی جبر و ستم کی پروا تک نہ ہوتی تھی۔

اسلام پسند اور کمیونسٹ تحریک

1960 کی دہائی کے اواخر میں اشتراکیت بھی پاکستان میں پنجے پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان دنوں روس کے پروردہ ''دیسی'' کمیونسٹ پاکستان میں اشتراکی حکومت بننے کے خواب دیکھتے تھے اور ان کا نعرہ ہوتا تھا کہ ''ایشیا سرخ ہے۔'' اس کے مقابل ''ایشیا سبز ہے'' کا نعرہ بلند کیا گیا۔ علامہ شہید نے اشتراکیت کے رد میں مجلّہ ''الاعتصام'' میں اور بعد ازاں مجلّہ ''اہل حدیث'' میں بھی قابل قدر اداریے لکھے۔ جون 1970ء میں لاہور میں اسلام پسند جماعتوں کا ایک اجلاس ہوا جس میں جماعت اہل حدیث کی نمائندگی ناظم اعلیٰ میاں فضل حق اور علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کی۔ تب بھی چٹان نے اپنے سرورق پر اس کی تصاویر شائع کیں۔ یوں علامہ اپنی سیاست کے ابتدائی سالوں میں ہی صفت اوّل میں چلے آئے۔ ویسے بھی 1968ء اور 1969ء میں الاعتصام کی دو سالہ ادارت نے علامہ کو سیاسی اشرافیہ میں پورے طور پر متعارف کرا دیا تھا اور آپ کسی بھی محفل میں جاتے تو اپنی سحر انگیز شخصیت کے سبب مرکز نگاہ تو بن ہی جاتے تھے۔

موچی دروازے میں

1967ء کے آخر میں مرکزی جمعیت اہلحدیث نے لاہور میں دو روزہ کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ اس کانفرنس کی تاریخی حیثیت کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب لوگ اپنے اپنے دائروں اور جماعتوں میں ذہنی طور پر قید نہ ہوتے تھے اور دوسروں کی خبر بھی رکھتے تھے اور اہل حدیث قیادت بھی آج کی نسبت وسیع سوچ اور شناخت رکھتی تھی۔ اس کانفرنس کی علامہ کی سیاسی اور جماعتی زندگی کے

اعتبار سے خاصی اہمیت ہے۔ علامہ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوئے محض دو یا تین ماہ ہوئے تھے۔ ہم لکھ چکے کہ آپ چینیانوالی مسجد میں جمعہ کی خطابت کے لیے آئے اور اگلے ماہ ہی آپ کو مدیر الاعتصام مقرر کر دیا گیا لیکن اس قدر ''جونیئر'' ہونے کے باوجود آپ کو غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ جب کانفرنس کا اشتہار شائع ہوا تو آپ کا خطاب دوسرے دن کے آخری سیشن میں رکھا گیا اور آپ جانتے ہیں کسی جلسے یا کانفرنس کا آخری مقرر یا سیشن ہی سب سے اہم ہوتا ہے۔ میں نے جب یہ اشتہار دیکھا تو میں بے حد حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالحق صدیقی، مولانا اسماعیل سلفی ایسے بڑوں ناموں کی موجودگی میں اٹھائیس سالہ یہ ''لڑکا'' کیسے اتنی اہمیت حاصل کر گیا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد خداداد صلاحیتوں کے سبب۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر خارزار سیاست میں

ایوب خان کے خلاف تحریک جب حد سے گزرنے لگی تو ایوب خان کو اندازہ ہو گیا کہ اب اس کی حکومت مزید نہیں چلے گی۔ اس نے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کیا اور چلتا بنا اور خود اپنے بنائے ہوئے آئین کی پاس داری بھی نہ کر سکا کہ استعفے کی صورت میں اقتدار سپیکر اسمبلی کے حوالے کیا جائے گا جو نئے انتخابات کا اہتمام کرے گا۔ ایوب خان کے خلاف علامہ احسان الٰہی ظہیر کے آتش بار قلم سے لکھے گئے اداریے اپنا وجود منوا رہے تھے۔ سو علامہ کو سبق سکھانے کے لیے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ آپ کسی کام سے اندرون شہر میں کہیں جا رہے تھے کہ آپ پر چند غنڈوں نے حملہ کر دیا لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت کی اور راہ گیر اکٹھے ہو گئے اور آپ محفوظ رہے۔ آپ کا حوصلہ کیا کم ہوتا، آپ مزید بے خوف ہو گئے اور جارحانہ انداز اختیار کرتے گئے۔ آپ پر اس حملے کے خلاف سب سے جان دار آواز ہفت روزہ چٹان میں آغا شورش کاشمیری نے بلند کی۔

لیکن علامہ کی باضابطہ سیاست کا آغاز 1968ء کی عید الفطر کے خطبہ سے ہوا جس

میں آپ کی خطابت نے آپ کا تعارف سیاسی حلقوں میں کروا دیا اور علامہ کی سیاست کی راہیں بھی متعین کر دیں۔ ان دنوں لاہور کی فضا سیاسی طور پر بے حد گرم تھی۔ ایسے ہی عید کے دن آ گئے۔ اس سے آگے کی داستان خود علامہ کی زبانی پڑھیے: [1]

یہ 1968ء کا واقعہ ہے میں چونکہ چینیاں والی مسجد کے منصب خطابت پر فائز تھا، ان دنوں فیلڈ مارشل ایوب خاں کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ اقبال پارک جسے منٹو پارک بھی کہا جاتا ہے وہاں نماز عید کی امامت مجھے چینیاں والی مسجد کے خطیب کی حیثیت میں وراثتاً ملی تھی۔ اقبال پارک میں نماز عید کا اجتماع مولانا داؤد غزنوی کے زمانے ہی سے لاہور میں عید آزادگان کا اجتماع کہلاتا تھا اور اس کا شمار لاہور میں نماز عید کے چند بڑے اجتماعات میں ہوتا تھا۔ 1968ء میں جب اس ملک کے عوام فیلڈ مارشل ایوب خاں سے انتہائی برگشتہ تھے اور ان کی حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور عید سے چند روز پہلے مولانا عبیداللہ انور مرحوم کے خلاف پولیس کی کارروائی کے باعث لاہور شہر میں حکومت کے خلاف شدید غیظ و غضب کا عالم تھا، ہیجان تھا۔ لوگ یہ توقع رکھتے تھے کہ عید آزادگان کے خطبہ میں ایوب خاں کی حکومت کو ہدف تنقید بنایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں میرے پاس عید سے پہلے ہی لوگوں کے وفود آنے شروع ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ میں چونکہ سیاسی آدمی نہیں ہوں اگر میں اجازت دوں تو اس مرتبہ وہ عید آزادگان کے خطبے کے لیے کسی ایسی شخصیت کو لے آئیں جو اس عید گاہ کے مقام و منصب کا حق ادا کر سکے۔ اس پر میں نے ان دوستوں سے کہا کہ وہ مطمئن رہیں مولانا داؤد غزنوی کی روایت کو قائم رکھا جائے گا۔ نماز عید کے خطبے میں میں نے جو تقریر کی اسے میری پہلی سیاسی تقریر بھی کہا جا سکتا ہے۔ میری اس تقریر کا تاثر اس قدر شدید اور گہرا تھا کہ بہت سے لوگوں نے شدت جذبات میں اپنے گریباں چاک کر لیے

[1] علامہ کے انٹرویوز، صفحہ: 66/67.

تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آغا شورش کاشمیری مرحوم بھی نماز عید کا خطبہ سننے والوں میں موجود تھے۔ نماز عید کے بعد وہ مجھے میاں عبدالعزیز مالواڈہ بار ایٹ لاء کی ہمراہی میں ملے اور کہنے لگے میں خود بھی فن خطابت میں بہت زیادہ دسترس رکھتا ہوں مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ احسان الٰہی اگر تم آئندہ سے خطابت چھوڑ دو تو تمہاری صرف اس ایک تقریر سے تمہیں برصغیر پاک و ہند کے چند بڑے خطیبوں میں شمار کیا جا سکے گا۔ آغا شورش کاشمیری کے یہ الفاظ میرے شوق کے لیے مہمیز بنے اور میری اس تقریر ہی نے مجھے ملک کے عام سیاسی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔''

''سقوط ڈھاکہ''

ایوبی آمریت کے خاتمے کے بعد بھی کاتب تقدیر نے پاکستان کے لیے کچھ اچھا نہیں لکھ رکھا تھا۔ جنرل یحیٰ خان صرف نالائق حکمران ہی نہ تھا بلکہ عیاش آدمی بھی تھا۔ راگ و رنگ کا رسیا یہ جرنیل متحدہ پاکستان کے تابوت کا آخری کیل ثابت ہوا کہ جس کی بنا بدقسمتی سے بانیٔ پاکستان محمد علی جناح نے ڈھاکہ میں 1948ء میں خود ہی رکھی تھی۔ جب جناح نے ڈھاکہ میں طالب علموں کے بنگالی زبان کو دوسری قومی زبان قرار دینے کے مطالبے کو دلیل سے رد کرنے کی بجائے ان کو ''شٹ اپ'' کروا دیا کاش بانی پاکستان اس قدر سختی سے ان نوجوانوں کو رد نہ کرتے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کی پہلی اینٹ جناح صاحب نے اس دن خود ہی رکھ دی اور محض یہ نہیں بلکہ بعد میں بنگلہ زبان کے لیے احتجاج کرنے والے طلبہ پر فائرنگ اور ان کو قتل کروا کر ان کی تحریک کی بنیادوں کی خون سے آبیاری بھی کر دی گئی۔ رہا یحیٰ خان! تو وہ تاریخ کا ایک معمولی کردار تھا کہ جس نے اس علیحدگی کی آخری اینٹ رکھی اور تاریخ کی اس کتاب کا ایک باب مکمل ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی، محبانِ وطن کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ حساس دل تڑپ کر رہ گئے اور قتل و خون میں ڈوبی علیحدگی،

فسادات، انسانی جانوں کا ضیاع اس پر مستزاد تھا۔ اس علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام پر اندرا گاندھی کا یہ تبصرہ کہ ''میں نے دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو دیا۔'' آج بھی قابل بحث ہے۔ آج بھی یہ بات غور طلب ہے کہ 1947ء سے پہلے اگر ہندوستان میں دو قومیں بستی تھیں، ایک ہندو اور دوسرے مسلمان، تو قیام پاکستان کے بعد ایک قوم یعنی مسلمان تو اس نظریے کی بنیاد پر الگ وطن لے کر شاد باد، منزل مراد ہوگئی اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے، وہ کون سی قوم تھے اور اب ان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اور ہزارہا ہم مذہب قاتل و مقتول جو 1971ء میں باہم دست و گریبان ہو کر الگ ہو گئے، وہ کون سی قوم تھی۔

چلیے چھوڑیے! یہ میرا ذاتی نقطہ نظر تھا اور تب لکھ رہا ہوں جب اس علیحدگی کو پینتالیس برس گزر چلے۔ تب ہم بھی ہوتے تو شاید اتنے ہی دکھی اور رنجیدہ ہوتے۔ بنگالی بہرحال ہمارے بھائی تھے، ہمارا حصہ تھے۔ ظلم تو بنانے والوں اور اس دیس کو چلانے والوں نے کیا تھا۔ وگرنہ اس جغرافیائی دوری، زبان کے فرق کی بنا پر یہ فیصلہ بھی کیا جا سکتا تھا کہ شروع میں ہی دو خودمختار ملک وجود میں آ جاتے۔ نہ اتنی قتل و غارت ہوتی نہ نفرتوں کی فصلیں پکتیں، نہ فیض کو یہ شعر کہنا پڑتا:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کتنی ہی کتب لکھی گئیں۔ اب یہ طے کرنا مشکل نہیں کہ علیحدگی کے مجرم کون تھے۔ جہاں تک میں نے سمجھا ہے کہ پاکستان کو بچایا جا سکتا تھا اگر یحیٰی خان اقتدار کی قربانی دے دیتا، بھٹو اپنی انا اور حرص اقتدار سے دست بردار ہو جاتا۔ جبکہ مجیب الرحمٰن بھی اس کا پورا ذمہ دار تھا۔ مگر دیانت داری سے اگر تجزیہ کیا جائے تو مغربی پاکستان کے سیاست دانوں اور فوجی حکمرانوں نے اس کے لیے کیا راستہ چھوڑا

تھا؟ پھر وہ وقت بھی آیا کہ مجیب الرحمٰن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جائز اور ناجائز حدوں سے دور چلا گیا اور ہندوستان کی کھلی مداخلت کے بعد علیحدگی کا سفر آسان ہو گیا۔ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستانی فوج نے باضابطہ ہتھیار ڈال دیئے۔

تقسیم وطن پر علامہ کا ردعمل فطری تھا۔ جو کسی بھی محبّ وطن کا ہو سکتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد جو پہلا خطبہ جمعہ آپ نے ارشاد فرمایا، وہ محض خطابت کا شاہ کار نہیں بلکہ کسی دکھی دل کی پکار بھی ہے۔ سارا خطبہ آہوں اور کراہوں میں لپٹا ہوا ہے۔ خطیب بھی رو رہا ہے اور مخاطب بھی نوحہ کناں ہیں۔ غم کا عالم ہے کہ...... کہ سسکیوں میں کہا جا رہا ہے:

"میرا ایک ہی بیٹا ہے
آج کٹ گیا ہوتا
مر گیا ہوتا تو میں
مجھ کو اتنا صدمہ نہ ہوتا
آج ہم کیوں زندہ ہیں۔ کاش آج سے پہلے ہم مر گئے ہوتے

اور حقیقت ہے کہ یہ جذبات ذرہ برابر بھی مبالغہ آمیز نہ تھے، نہ جوش خطابت، کہ اس روز خطابت کی کسے ہوش تھی۔ وہ تو دلِ سی پارہ اور جگر سوختہ کا دن تھا جو نوکِ زبان پر دل کے زخم چلے آ رہے تھے۔

آپ سسکیوں میں کہہ رہے تھے:

"کون ہے جو ہمارے غم کو جانے؟
کون ہے جو ہمارے درد کو بٹائے؟
کون ہے جو ہمارے احساسات کو سمجھے؟

آپ نے اپنے خطاب میں جنرل یحیٰی خان اور حکمران اشرافیہ کو مخاطب کرتے

ہوئے کہا:

"یہ کوئی مذاق ہے کہ آدمی آدھی رات کو شراب پیے اور ایک غیر عورت کو اپنے پہلو میں لے کر سوئے اور صبح اٹھے تو کہے اسلام زندہ باد، قرآن زندہ باد، اللہ اکبر کی کاری ضرب لگاؤ، ہم جنگ جیت جائیں گے۔"

علامہ کا سقوط ڈھاکہ پر خطبہ جمعہ سن کر ہی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت قوم کے جذبات کیا تھے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ آج چالیس سال بعد بھی وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے اور اللہ اکبر کی ضرب لگاؤ کے نعرے بلند کیے جا رہے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے دُور کا تعلق بھی نہیں اور دونوں طرف سے اللہ اکبر کے نعرے لگ رہے ہیں۔

سقوط ڈھاکہ سے پہلے اور بعد میں "مجلّہ ترجمان الحدیث" اور "اہل حدیث" میں علامہ نے زور دار اداریے لکھے اور اسی طرح قومی روزناموں میں مضامین بھی شائع ہوئے۔ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر نے "سقوط ڈھاکہ" کے عنوان سے اُسے کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا۔

اس میں سے صرف ایک اداریہ پڑھیے جس کا عنوان تھا "16 دسمبر 1971ء" علامہ لکھتے ہیں:

16 دسمبر 1971ء کا دن

16 دسمبر کا دن اسی طرح کا دن تھا جس طرح کے اور دن ہوتے ہیں لیکن طبیعت صبح سے بے چین، بے چین اور مضطرب، مضطرب تھی۔ دل دھڑک رہا تھا اور اعصاب چیخ رہے تھے۔ رات بی بی سی نے بڑی ڈراؤنی خبریں سنائی تھیں اور صبح ان سے بھی خوفناک، ہندوستانی ریڈیو سننے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر اپنے ریڈیو کی مہمل اور مبہم خبریں پریشانی میں لحہ بہ لحہ اضافہ کر رہی تھیں۔ اس لیے مجبوراً بی بی سی کو سننا پڑتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اول

دن سے اس کی روش پاکستان دشمنی پر مبنی تھی۔ لیکن خبروں کے معاملہ میں وہ بڑا چوکس اور تیز تھا اور پھر پانچ بجے ہمارے ریڈیو نے یکا یک ان اندیشوں کو ایک ہی نظر میں درست ثابت کر دیا۔ جو پچھلے تین دنوں سے بار بار ابھر رہے تھے اور ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا جیسے زمین پر زلزلہ آ گیا ہو۔ آسمان پھٹ کر نیچے آن گرا ہو۔ آنکھوں تلے اندھیرے چھا گئے اور دل ڈوب کر رہ گئے۔ جی چاہا کاش! آج کا دن دیکھنے سے پہلے مر گئے ہوتے۔ تا کہ اس ذلت اور رسوائی کو نہ دیکھنا نصیب ہوتا جو آج کے دن دیکھنی نصیب ہوئی۔

اور پھر یہ معلوم کر کے درد نے اور شدت اختیار کر لی کہ صرف ڈھاکہ میں ہندوستانی فوج داخل ہی نہیں ہوئی بلکہ پاکستان کی جیالی افواج کو ہتھیار ڈالنے کا بھی حکم دے دیا گیا ہے۔

اور جس سفاک و ظالم نے کم و بیش ایک لاکھ فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا ہے وہ رات قوم کے نام اپنے خطاب میں بغیر کسی شرم اور بغیر کسی ندامت اور دکھ کے یہی کہہ رہا تھا کہ ایک محاذ پر اگر شکست ہو گئی ہے تو کیا ہوا فتح ہماری ہی ہو گی۔

او بد بخت! اور خبیث انسان، تو ملک کے ایک بڑے حصے کو چھنوا کر بھی اسے ایک محاذ کی شکست کہتا ہے۔

کاش میرے ہاتھ اس بزدل اور غدار کے منہ تک پہنچ سکتے اور میں اس شرابی سے پوچھ سکتا ظالم! آج تو ہماری تاریخ کو داغ دار کرنے کے بعد کس بے رحمی سے صرف ایک محاذ پر شکست اور آخری فتح تک جنگ کے اعلان کرتا ہے۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دوسرے دن ہی مغربی محاذ پر بھی جنگ بند کرا دی گئی اور میرے کانوں میں مشرقی پاکستان کے بزرگ سیاستدان جناب نور الامین کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو انہوں نے جنگ سے چند روز پیشتر لاہور کے ایک جلسہ میں کہے تھے کہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی سازش تیار کی جا رہی ہے اور آج سازش بھی ہمارے سامنے تھی اور سازش کے کردار بھی۔

لیکن وائے افسوس کہ اس سازش نے اسلام کی روایات تک کو پامال کروا دیا۔

16 دسمبر ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اس روز ایک خائن نے پوری دنیا میں امت محمد علیہ السلام کو رسوا کر دیا اور مسلمانان عالم کے سر شرم سے جھکا دیئے۔

16 دسمبر ہمارے لیے کربلا سے کم نہیں! کہ کربلا میں تو 72 نفوس شہید ہوئے تھے اور اس روز بہتر کروڑ مسلمانوں کے دل کٹ کر رہ گئے۔

16 دسمبر پورے عالم اسلام کے لیے غم واندوہ کے وہ بادل لے کر آیا جو اس وقت تک نہیں چھٹ سکتے جب تک مشرقی پاکستان کا گوشہ گوشہ ہندو استعمار سے آزاد نہیں کروا لیا جاتا۔

ہم رنجیدہ ہیں، غم زدہ ہیں، دکھی ہیں اور زخمی اور یہ زخم اس دن مندمل ہوں گے جب مشرقی بازو کے بھائی اسی طرح آزادی کے سانس لیں گے جس طرح ان کے مغربی بازو کے بھائی لیتے ہیں۔

اور ان ٹیسوں میں اس وقت تک کمی نہیں آ سکتی جب تک اس سفاک کو جس کا نام یحییٰ خاں ہے اور اس کے ساتھیوں کو ان کی غداری اور خیانت کی پوری پوری سزا نہیں مل جاتی اور یقیناً رب کی پکڑ قریب ہے۔

یہاں پر علامہ شہید کا اداریہ ختم ہوا۔ اب دیکھیے اسے لکھے ہوئے آج چوالیس

سال بیت چلے۔ یہ ٹیسیں آج بھی تازہ ہیں۔ اتنی مدت میں ایک مجرم بھی ایسا نہیں کہ
کس کو اس سانحے میں ملوث ہونے کی بنا پر ایک روز! جی ہاں صرف ایک روز بھی پابند
سلاسل رہنا پڑا ہو۔

بنگلہ دیش نامنظور تحریک

مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ ہزار ہا مسلمانوں کے قتل عام کے بعد
مجیب الرحمان کو بنگلہ دیش کا اقتدار مل چکا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو بقیہ پاکستان کا ''بادشاہ
سلامت'' بن چکا تھا۔ محب وطن پاکستانی یہ سمجھتے تھے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اس
پر ہندوستان کی فوج کشی، یہ سب کچھ ایک سازش کا نتیجہ ہے اور پاکستانی قوم سازش کے
ان تمام عالمی چہروں سے نفرت کر رہی تھی۔

آغاز میں بھٹو نے بھی اس نفرت کو محسوس کر لیا اور اعلان کیا کہ جو ملک بھی بنگلہ
دیش کو تسلیم کرے گا، ہم اس سے سفارتی تعلقات ختم کر لیں گے۔ اس کا پہلا مرحلہ
دولت مشترکہ سے علیحدگی تھی کیونکہ پاکستانی عوام کا خیال تھا کہ برطانیہ بھی سقوط ڈھاکہ
میں شریک کار تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد بھٹو کو اندازہ ہو گیا کہ اس رویے سے پاکستان
عالمی تنہائی کا شکار ہو جائے گا اور وہ سوچنے لگا کہ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ بھٹو نے ہولے ہولے بنگلہ دیش کو منظور کرنے کی
باتیں شروع کر دیں۔ اب اس کے دلائل بدل چکے تھے۔ کہ بنگلہ دیش اب ایک
حقیقت ہے۔ وہ اگرچہ ہم سے الگ ہو گیا ہے لیکن ایک برادر اسلامی ملک ہے۔ دنیا
بھی اس کو تسلیم کر رہی ہے اس لیے ساری دنیا سے ٹکرانا اور لڑائی مول لیے رکھنا
ہمارے لیے آسان نہیں۔

دوسری طرف محبان پاکستان اور مذہبی جماعتیں اپنی رومان پسند طباع کی وجہ

سے امید میں تھے کہ ''شاید واپسی کی صورت ہو جائے اور یہ کہ بنگلہ دیش کو سازش کے تحت الگ کیا گیا ورنہ اصولی طور پر وہ آج بھی پاکستان حصہ ہے اور اس لیے اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔''

چنانچہ بھٹو کے ردِعمل میں پورے پاکستان میں بنگلہ دیش نامنظور تحریک کا آغاز ہوا۔ علامہ اس تحریک کے بنیادی قائدین میں سے تھے۔ لاہور کا محاذ انہوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ آغا شورش کاشمیری کے ہمراہ سارے پاکستان میں جلسے کیے۔

علامہ کی خطابت کیا ہوگی، اس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو علامہ شہید کو ان کی زندگی میں براہ راست سنتے رہے۔ کیسے ممکن تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسا منتقم مزاج علامہ کو نظر انداز کر دیتا۔ چنانچہ ملتان کے دورے میں علامہ کو دوسرے قائدین سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ جب گرفتاری ہوئی آپ روزے سے تھے۔ یہ رمضان آپ کا جیل میں ہی گزر گیا۔ جب آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ آپ کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لگا دی گئیں اور روزہ بھی افطار نہ کرنے دیا گیا۔ آپ کو اس وقت 104 درجے کا بخار تھا۔ جب بھی آپ کو اونگھ آ جاتی تو پہرے پر مامور سنتری زنجیروں کو زور سے ہلاتا اور آپ سو بھی نہ سکتے۔ شدید بخار اور نقاہت کا یہ سلسلہ دو دن چلا اور اڑتالیس گھنٹے بعد آپ کو روزہ افطار کرنے دیا گیا اور یہ سب کچھ بزدل گورنر غلام مصطفیٰ کھر کے ذاتی حکم سے ہو رہا تھا۔

علامہ جب کبھی اس تشدد کا ذکر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ ''اگر اللہ نے اس دن کے روزے کو قبول کر لیا تو مجھ کو یقین ہے کہ میری بخشش ہو جائے گی۔'' مہینے بھر کی اس قید بامشقت سے آخرکار علامہ کو رہائی ملی۔ علامہ اس قید و بند کے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں یوں بتاتے ہیں:

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں مجھے قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دو چار ہونا

پڑا۔ علمائے کرام اور سیاست دانوں میں سے میں نے بارش کے پہلے قطرے کا کردار ادا کیا تھا۔ مجھے جسمانی اذیتیں بھی دی گئی تھیں۔ میرے بعد بہت سے سیاست دانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان پر بہت سا تشدد ہوا مگر حکومت کی طرف سے اس مذموم کارروائی کا آغاز مجھ پر تشدد سے ہوا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب جو جیل میں بہت سی سہولتوں کے باوجود چیخ و پکار کر رہے ہیں، وہ گورنر پنجاب تھے اور انہوں نے ملتان میں باقاعدہ اپنی زیر نگرانی مجھ پر تشدد کرایا تھا۔

میں نے جیل کے حوالے سے ملک غلام مصطفیٰ کھر کی جیل یاترا کا تذکرہ محض برسبیل تذکرہ کر دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس حق میں نہیں ہوں کہ حکومت کھر کو فوجی عدالت کی طرف سے دی گئی سزا کے خلاف اپیل کا حق دیے بغیر جیل میں بند رکھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کو جیل میں کوئی تکلیف نہیں ہے، اگر وہ علیل ہیں تو وہ الگ بات ہے۔ حکومت کو انہیں جیل میں رکھ کر سیاسی ہیرو نہیں بنانا چاہیے کہ مجھے ایسے جن لوگوں نے ان کے اقتدار سے زخم کھائے ہوئے ہیں وہ ان کے سیاسی ہیرو بنائے جانے سے یقیناً متردد ہوں گے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کو یاد ہوگا مجھے رمضان شریف میں گرفتار کیا گیا تھا اور مجھے اڑتالیس گھنٹے تک روزہ افطار نہیں کرنے دیا گیا تھا۔ مجھے 104 ڈگری بخار ہو گیا تھا اور بخار کی اس حالت میں جب مجھے ہسپتال میں داخل کرایا گیا تو ملک غلام مصطفیٰ کھر کی ہدایت پر نہ صرف ہسپتال میں مجھ پر پولیس کا پہرہ رکھا گیا تھا بلکہ ہسپتال میں بھی میرے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ مجھے ایم پی او میں پکڑا گیا تھا۔ یہ بہت معمولی قسم کا کیس ہوتا ہے اور درجہ اوّل کا

کوئی بھی مجسٹریٹ اس کیس میں ملزم کی ضمانت لینے کا مجاز سمجھا جاتا تھا مگر میرے ساتھ یہ حادثہ بھی ہوا کہ میری ضمانت مجسٹریٹ نے نہیں لی، سیشن کورٹ سے مسترد ہوئی، ہائی کورٹ نے بھی مجھے ضمانت کا مستحق نہیں سمجھا اور مجھے عدالت عظمیٰ تک جانا پڑا۔ میں نے ملک غلام مصطفیٰ کھر کے تشدد سے اپنے عزم وحوصلہ میں کوئی لغزش نہیں آنے دی۔ [1]

علامہ شہید کی گرفتاری پر کافی احتجاج ہوا اور اخبارات میں آپ پر ہونے والے ظلم وتشدد کی داستانیں اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ آغا شورش کاشمیری کے چٹان کا 16 اکتوبر 1970ء کا اداریہ ملاحظہ کیجیے:

علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ملتان کی پولیس

''علامہ احسان الٰہی ظہیرؔ کی گرفتاری ہمارے نزدیک غیر متوقع نہ تھی۔ ہم بہت دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ علامہ صاحب چند دنوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔ کیونکہ علامہ صاحب کی سچائیاں حکومت کے لیے خطرناک تھیں۔

''ہر گرفتاری کا نتیجہ فوری طور پر سامنے نہیں آتا لیکن پنجاب کو یہ شرف فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اپوزیشن کے نام پر جو نمایاں لوگ پہلے پکڑے گئے وہ اپوزیشن کی کسی جماعت کے ممبر یا راہنما نہیں وہ صرف اپنے دل کے درد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آغا شورش، نواب زادہ شیر علی اور اب علامہ احسان الٰہی ظہیرؔ یا پھر مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ سیّد ابوذر بخاری۔ یا پھر حمزہ اور بشیر خاور جیسے جلے دل کے لوگ کہ وہ کلمۂ الحق کہنے سے رُک نہیں سکتے۔

''علامہ صاحب سے متعلق یہ جان کر انتہائی رنج ہوا کہ اُن کے ساتھ ملتان کی پولیس کا سلوک حد درجہ ناروا ہے۔ اُنہیں دل کا دورہ پڑا، نشتر

[1] علامہ شہید کے انٹرویوز، صفحہ: 69/68۔

ہسپتال لے گئے لیکن رات بھر اُن کے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور پاؤں بھی باندھے گئے۔ ایک مسلح کانسٹیبل اُن کے سر پہ سوار رہا۔

''ظاہر ہے کہ یہ صوبائی حکومت کے احکام نہیں ہوں گے۔ اس قسم کی موشگافیاں ضلعی انتظامیہ کرتی ہے۔ ہم اس ضلعی انتظامیہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ انہیں ہر دور میں برخاست ہونے والے افسروں کا انجام معلوم ہے؟ اُن کے منصب و مرتبہ کے بہت سے افسر آج جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ ہمیں علامہ صاحب کے ملاقاتیوں نے بتایا ہے کہ حضرت علامہ پر پولیس کے ہاتھوں جو بیتی اُس کے تنہا ذمہ دار ملتان کے ایس ایس پی واحد بخش ہیں۔ اگر یہ واحد بخش وہی صاحب ہیں جو لاہور میں انارکلی کے ڈی ایس پی تھے تو ہم اُن سے مختلف توقع نہیں کر سکتے۔ سب کچھ اُن کی فطرت کے مطابق ہے، لیکن انہیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ خدا نہ کرے لیکن وہ دَور بھی آ سکتا ہے کہ ان کی تقدیر کا آخری ورق انہی زنجیروں پر ختم ہو۔''

بنگلہ دیش نامنظور تحریک کے سلسلے میں ملک کے طول و عرض میں احتجاجی جلسے ہو رہے تھے اور علامہ کی خطابت کے چرچے چہار سو تھے۔ آغا شورش کاشمیری نے 11 ستمبر 1972ء کے چٹان کے سرورق پر علامہ کی پورے صفحے پر احاطہ کرتی تصویر اس عنوان کے تحت شائع :

''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان''

بلاشبہ علامہ کو اپنے دور کی ایک عظیم شخصیت کی طرف سے یہ بڑا خراج تحسین تھا اور اسی شمارے میں علامہ شہید کی ایک تقریر جو منڈی بہاؤ الدین کے ایک بہت ہی بڑے جلسے میں کی گئی تھی، کا اقتباس بھی دیا گیا تھا۔

منڈی بہاؤالدین کا جلسہ

زندہ دلان لاہور کے جلوس نکالنے کے بعد آمر صدر بھٹو کی نیند حرام ہو چکی ہے آغا شورش کاشمیری کا جرم صرف یہ ہے کہ اُس نے آمریت کو آئینہ دکھایا، ہم بنگلہ دیش کو مرتے دم تک تسلیم نہیں کریں گے۔

ان خیالات کا اظہار گزشتہ روز جناب علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کیا۔ وہ غلہ منڈی میں سرفروش تنظیم کے زیر اہتمام ایک فقید المثال جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ اس اجتماع میں تقریباً ایک لاکھ افراد شریک ہوئے۔ علامہ صاحب نے بتایا کہ اسلامی وزراء خارجہ کی گزشتہ کانفرنس میں جب پاکستانی قیدیوں کی واپسی کے سلسلہ میں ہندوستان کے خلاف قرار داد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت سب سے پہلے پاکستانی وفد کے نمائندے نے کی۔ جب صدر بھٹو سے اس بارے میں رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم اپنے دوست ملک یعنی ہندوستان سے تعلقات قطعی ختم نہیں کر سکتے بلکہ ہم امن چاہتے ہیں۔ آغا شورش کاشمیری، نواب زادہ شیر علی اور دوسرے رہنماؤں کا صرف یہی ایک جرم ہے کہ وہ موجودہ حکومت کو آئینہ دکھا رہے تھے۔ اگر تمہاری شکلیں ہی خراب ہوں تو آئینے کا کیا قصور ہے اور پھر آئینہ دکھانے والے کا کیا قصور؟ انہوں نے موجودہ حکومت کو چیلنج کیا کہ وہ سیاسی رہنماؤں کا جرم ثابت کرے ورنہ ہم حکومت کا جرم ثابت کرتے ہیں۔ حکومت ہمیں چارج شیٹ دے اور ہم حکومت کو چارج شیٹ دیتے ہیں اور عوام اس کا فیصلہ کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر شورش کاشمیری جیل میں ہے تو کیا ہوا یہ زنجیریں تو شاہینوں کو ہی پہنائی جاتی ہیں۔ یاد رکھو، شورش وہ نہیں، جس کا روح افزاء کی بوتل میں شراب کے بغیر گزارہ نہیں، وہ صرف ایک دیوانہ آدمی ہے، اس کو جیل بھی ایسی ہے ''جیسی دُلہن کی سہاگ رات'' انہوں نے واضح کیا کہ جیلیں کب تک بھرو گے۔ ایک شیر علی نہیں بلکہ ہزاروں شیر علی ابھی موجود ہیں۔ ایک شورش

نہیں بلکہ لاکھوں شورش ابھی موجود ہیں۔ آمر حکومت اپنا وقار کھو چکی ہے، جب انہوں نے منڈی بہاؤ الدین کے عوام سے پوچھا کہ کیا وہ ''بنگلہ دیش'' کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں؟ تو ایک لاکھ کے اجتماع نے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے کہا ''نہیں ہرگز نہیں'' ہم ''بنگلہ دیش'' کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ اس پر علامہ صاحب نے جوش میں آ کر کہا کہ سی۔ آئی۔ ڈی والو لکھو کہ منڈی بہاؤ الدین کے عوام نے ''بنگلہ دیش'' کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اب مجھے بھی جیل بھیج دو! کیونکہ آمر حکومت کا یہ دستور ہے کہ جو حق کہے اسے جیل بھیج دیتی ہے۔

تحریک چلتی رہی اور حکومت کو بنگلہ دیش منظور کرنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ ذوالفقار علی بھٹو کی تجویز پر اسلامی سربراہان کی کانفرنس پاکستان میں ہونا طے پائی۔ اس کانفرنس کے پردے میں مجیب الرحمان کو چند دوست ممالک کے سربراہان پاکستان لے آئے اور یوں ''بنگلہ دیش'' باضابطہ تسلیم کر لیا گیا اور عام پاکستانیوں پر پھر سے ایک کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔

آج اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کچھ غلط نہیں لگتا۔ بنگلہ دیش ایک حقیقت تھا اور ہم سے جدا ہو کر الگ وطن بن چکا تھا اور پلوں سے گزرا پانی کبھی واپس نہیں آتا۔

تحریک ختم نبوت

نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ شمالی علاقوں کے سیاحتی دورے سے واپس آ رہے تھے۔ ریل گاڑی ربوہ سٹیشن پر رکی۔ پرجوش طلبہ، بالی عمر، چند طلبہ نے پلیٹ فارم پر آواز لگا دی: ''قادیانیت مردہ باد، ختم نبوت زندہ باد۔''

مرزا طاہر کا دور تھا جو جارحانہ مزاج رکھتا تھا اور قادیانی نوجوانوں کو عسکری تربیت بھی دے رہا تھا۔ اگرچہ احمقانہ عمل تھا کہ جس ملک میں کروڑوں کی آبادی میں آپ

ہزاروں میں ہوں یا چند لاکھ، وہاں آپ مداہنت یا مصالحت سے تو رہ سکتے ہو مزاحمت سے نہیں۔ ادھر طلبہ نے نعرے لگائے، ادھر قادیانی غنڈے ان پر ٹوٹ پڑے۔ نہتے طلبہ بھلا مسلح افراد کا کیا مقابلہ کرتے، بری طرح مضروب ہوئے۔

بصد مشکل زخمی طلبہ کو ریلوے کے عملے نے سوار کیا اور لے کر فیصل آباد پہنچے اور تشویش ناک حالت میں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اگلے روز ملک بھر کے اخبارات اس واقعے سے بھرے پڑے تھے۔ پورے ملک میں طوفان برپا ہو گیا اور احتجاجی جلوس نکلنے لگے۔ حکومت قطعاً اس کے لیے تیار نہ تھی مگر بہت جلد یہ عوامی تحریک بن گئی کہ قادیانیوں کو باقاعدہ اور قانونی طور پر کافر قرار دیا جائے۔ اس سے پہلے قانونی طور پر قادیانی ایک مسلمان فرقہ ہی تسلیم ہوتے تھے۔ اس تحریک کو منظّم کرنے کے لیے باقاعدہ ایک مجلس عمل قائم کی گئی۔ جس کے صدر مولانا محمد یوسف بنوری تھے۔ آغا شورش کاشمیری، نوابزادہ نصراللہ خاں اور علامہ احسان الٰہی ظہیر نے پاکستان بھر کے دورے کیے اور اپنے خطابات کے ذریعے سارے ملک میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت نے مرزا ناصر احمد کو باقاعدہ اسمبلی میں طلب کر لیا اور اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا اور کئی روز کی کارروائی کے بعد باقاعدہ قانون سازی کی گئی اور قادیانیوں کو غیر مسلم اور کافر قرار دے دیا گیا اور یہ فیصلہ خالصتاً انصاف پر مبنی تھا اور یک طرفہ نہیں تھا۔ یقیناً یہ بھٹو کا ایک عمدہ کام تھا لیکن اس کا اصل سبب وہ دباؤ تھا جو تحریک کے قائدین اور کارکنان نے پیدا کر دیا تھا کہ حکومت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب یہ فیصلہ ناگزیر ہے۔

تحریک کامیاب ہو گئی۔ اظہار تشکر کے لیے تمام مذہبی جماعتوں نے بادشاہی مسجد میں مشترکہ جلسہ طے کیا۔ مگر وہاں عجیب واقعہ ہوا۔ وہی محدود فرقہ وارانہ سوچ کا شاخسانہ، مولانا مودودی تقریر کر رہے تھے کہ مفتی محمود احمد تشریف لے آئے۔ ہونا تو یہ

چاہیے تھا کہ مفتی صاحب کو سٹیج کے پہلو میں مقررین کے لیے مخصوص دروازے سے لے آیا جاتا۔ لیکن سیاست کے کچھ تقاضے بھی تو ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کو بادشاہی مسجد کے مرکزی دروازے سے لایا گیا۔ ان کی تنظیم کے کارکنان کا پر جوش ہجوم ساتھ تھا۔ اب یہ چھوٹا سا جلوس مجمعے کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مولانا مودودی کی تقریر اس ہنگامے کی نذر ہو گئی۔ اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی کے کارکنان اس پر مشتعل ہو گئے اور جمعیت علمائے اسلام کے کارکنان سے الجھنے لگے اور باہم دست و گریباں ہو گئے۔ میرے ہمسائے ملک ثناء اللہ جو اس جلسے میں موجود تھے، وہ روایت کرتے ہیں کہ ''جمعیت علمائے اسلام کے کارکنان کا پلہ بھاری پڑ رہا تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ جماعت اسلامی کے دبلے پتلے کارکنان کو اپنے ہاتھوں پر اوپر اٹھاتے اور نیچے دے مارتے۔''

ملک ثناء اللہ صاحب کو پتا ہو نہ ہو۔ مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ بھلا مدارس میں صدقے کے بکرے اور مساجد میں مرغن غذائیں کھانے والے ''پہلوانوں'' کا پنجاب یونیورسٹی کے میس کے کھانے (کہ جن سے پیٹ بھی نہ بھرے اور ''سپلی'' منگوانی پڑے) کھانے والوں کا کیا مقابلہ۔ ویسے اس اٹھا کر پھینکنے کو پنجابی میں ''بالا نکالنا'' کہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ ''بالے'' جلسہ ختم ہی کر دیتے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید سے کہا گیا کہ اب آپ ہی سنبھالیے۔ اب علامہ سب سے کم عمر، دوسری طرف سفید ریش بزرگ ملک بھر سے آئے ہوئے علماء کرام۔ علامہ مائیک پر آئے اور اس کے بعد سماں یوں تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جاوید جمال ڈسکوی لکھتے ہیں کہ:

> ''پھر اچانک علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب مائیک پہ آئے اور انہوں نے شیروں کی طرح گرج برس کر دو منٹ میں جلسہ کنٹرول کر لیا۔ میرے لیے یہ ناقابل یقین واقعہ تھا۔''

قتل کا مقدمہ

بھٹو دور میں علامہ پر ایک اور حادثہ بیتا۔ کہ علامہ خانیوال کے علاقے میں ایک جلسے سے خطاب کر کے واپس لاہور آ رہے تھے۔ نہر کے کنارے کنارے گاڑی چل رہی تھی کہ ڈرائیور کو اونگھ آ گئی اور گاڑی نہر میں جا گری۔ نہر خاصی گہری تھی۔ کنارے پر کچھ لوگ موجود تھے۔ خوش قسمتی کہ علامہ کی طرف والا دروازہ کھل گیا، انہیں باہر نکلنے کا موقع مل گیا اور علامہ کی جان بچ گئی، مگر بدقسمتی سے ڈرائیور باہر نہ نکل سکا اور جان کی بازی ہار گیا۔

گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر، علامہ شہید سے شدید بغض رکھتا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور علامہ شہید بیان کرتے ہیں:

> میں نے بورے والا میں تقریر کی اور ایک ٹیکسی کے ذریعے خانیوال کے لیے جا رہا تھا۔ میرے ہمراہ وہاں ایک وکیل اور ایک طالب علم لیڈر بھی تھے۔ ہم نہر کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی چلاتے وقت اونگھ آ گئی اور اس طرح ٹیکسی نہر میں گر گئی۔ یہ میرے اللہ کا احسان تھا کہ مجھے دوسرے ساتھیوں سے کم چوٹیں آئیں اور میں ہوش میں رہا۔ میں نے وکیل اور طالب علم لیڈر کو جدوجہد کر کے نہر سے نکالا مگر ٹیکسی ڈرائیور جاں بحق ہو گیا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر ان دنوں پنجاب کے گورنر تھے اور وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے، جب ٹیکسی ڈرائیور کے نہر میں ڈوب کر مرنے اور حادثے میں میرے زندہ بچ رہنے کی خبریں چھپیں تو کھر نے مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی ہلاکت کا ذمہ دار قرار دے کر جیل بھجوانے کا منصوبہ بنا لیا۔ پنجاب کے اس مردِ آہن نے خانیوال کے نزدیک پیش آنے والے اس واقعہ کے متعلق خود مدعی مقدمہ بن کر لاہور میں میرے خلاف ایف۔ آئی۔ آر درج

کرائی۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور پیپلز پارٹی کا کارکن تھا اور اس کی موت کا ذمہ دار میں تھا۔

پنجاب کی صدیوں پرانی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ خود پنجاب کے حکمران نے کسی شخص کے خلاف مدعی بن کر مقدمہ درج کیا تھا۔ وقوعہ کہیں کا تھا اور مقدمہ کہیں درج کرایا گیا۔ ہلکے پن کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ایسی ہر انتہا عبور کر چکی تھی۔ مقدمہ جھوٹا تھا۔ اس کا مقدر بھی وہی ہونا تھا جو جھوٹ کا ہوتا ہے۔

علامہ پر حکومتی مظالم اور اہل حدیث قیادت

بنگلہ دیش نامنظور تحریک اور تحریک ختم نبوت میں علامہ نے صف اول میں رہ کر دیکھ لیا۔ لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھتے تو خود کو تنہا پاتے۔ وہ اس طرح کہ جلسے اور جلوسوں میں تو اہل حدیث نوجوان کثیر تعداد میں شریک ہوتے لیکن اہل حدیث قیادت عملی طور پر ان سیاسی اور تحریکی معاملات میں شریک نہ ہوتی۔ کچھ روایتی مولویت اور کچھ تاجر حضرات کا جماعت پر قبضہ تھا اور تجار فطرتاً بزدل ہوتے ہیں اور جب ملتان میں علامہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تب تو حد ہی ہوگئی۔ جی ہاں کیا آپ یقین کریں گے کہ سارے پاکستان میں علامہ کی گرفتاری پر احتجاج ہو رہا تھا اور اہل حدیث قیادت لاتعلقی کے اعلان کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ علامہ اپنے ایک انٹرویو میں اس کے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث مجھے ملک غلام مصطفیٰ کھر کی انتقامی کارروائیوں کا ہدف بننا پڑا تھا۔ میرا فکری اور نظریاتی تعلق جمعیت اہلحدیث کے ساتھ تھا اور اس کی سربراہی ان دنوں ایسے خودغرض عناصر کے پاس تھی جنہیں قوم اور ملت کے مقابلے میں صرف اپنے مفادات عزیز

تھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر نے انہیں آنکھیں دکھائیں تو انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ میرا جمعیت اہلحدیث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنے جسم و جان پر تشدد برداشت کر کے جس جماعت کا نام روشن کیا اس جماعت کے نام نہاد اکابرین نے مجھے جمعیت اہلحدیث کا رکن تک ماننے سے انکار کر دیا۔ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ دنیا جہان کے اخبارات و جرائد میں میری نظر بندی کے خلاف آواز اٹھائی گئی اگر کسی جریدے نے میری نظر بندی پر احتجاج نہیں کیا تو وہ جمعیت اہلحدیث کا ترجمان جریدہ ''الاعتصام'' تھا جس کا میں خود مدیرِ اعلیٰ رہ چکا تھا۔''[1]

تحریک استقلال میں شمولیت

جب علامہ شہید کے مرکزی جمعیت سے اختلافات شدید ہو گئے تو علامہ شہید کی مرکزی جمعیت کی رکنیت ختم کر دی گئی۔ علامہ کا قصور یہ ہی تو تھا کہ وہ جمود کے خلاف تھے۔ ان کی ذات میں بے پناہ تحرک تھا، دوسری طرف کی تصویر کشی علامہ اقبال نے کئی برس پہلے کر دی تھی۔ ؎

طرز کہن پر اڑنا، آئین نو سے ڈرنا

تنظیم کی بنیادی رکنیت ختم کرنا ہمارے لیڈر حضرات کا پرانا ہتھیار ہے جس کو یہ غالباً ''ذوالفقار حیدری'' سمجھ کے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ علامہ شہید کسی بھی کارکن کی بنیادی رکنیت ختم کرنے کے سخت خلاف تھے اور یہ ہی وجہ ہے کہ علامہ شہید کے سات سالہ دور جماعت میں سے ایک بار بھی ہفت روزہ ''الاسلام'' میں کسی کی رکنیت ختم کرنے کا اعلان جاری نہیں کیا۔

علامہ شہید کے لیے ان دنوں کئی قانونی اور انتظامی مسائل کھڑے ہو گئے جس میں

[1] علامہ کے انٹرویوز، صفحہ: 70۔

سب سے بڑا مسئلہ بھٹو حکومت کے ان پر دائر کردہ مقدمات تھے۔ ایک بندہ، تن تنہا کس طرح حکومتی دہشت گردی کا سامنا کر سکتا تھا۔ چنانچہ علامہ نے اپنے مخلص احباب سے اس سلسلے میں مشاورت شروع کر دی۔ عبدالمجید شاکر کہتے ہیں کہ تحریک استقلال میں جانے کا حتمی فیصلہ بھی مکتبہ قدوسیہ پر بیٹھ کر ہوا۔

ان حالات میں علامہ کسی سیاسی جماعت میں باضابطہ طور پر شامل ہونے کا سوچنے لگے۔ اگرچہ نواب زادہ نصراللہ خان سے علامہ کا قلبی تعلق تھا اور علامہ نواب زادہ کا غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ لیکن ان کی جماعت میں شامل ہونا خود کو ایک محدود دنیا میں بند کرنے کے مترادف تھا کہ نواب زادہ کی ''پاکستان جمہوری پارٹی'' کبھی ایک بڑی پارٹی نہ رہی تھی۔ احباب کے ساتھ مشاورت جاری تھی۔ بھائی عبدالمجید شاکر بتاتے ہیں کہ ایسی ہی ایک مجلس مکتبہ قدوسیہ پر بھی ہوئی۔ میرے والد محترم کا مشورہ بھی تحریک استقلال میں شامل ہونے کا تھا۔ اس کے علاوہ میاں محمود علی قصوری بھی تحریک استقلال میں شامل تھے کہ جن سے علامہ کا بہت ذہنی قرب تھا۔ سو علامہ باضابطہ طور پر تحریک استقلال میں شامل ہو گئے۔

تو جناب! یہ تھا وہ پس منظر اور یہ تھے وہ حالات، جن کے سبب علامہ شہید نے تحریک استقلال میں جانے کا فیصلہ کیا۔ تحریک استقلال اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کی فاشسٹ حکومت کے خلاف سب سے بڑی عوامی جماعت تھی۔ علامہ کو اس بڑی پارٹی کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور قائم مقام صدر مقرر کر دیا گیا۔ اور یہ بہت بڑی بات تھی کہ جس تحریک استقلال کا سربراہ آج سے چالیس سال پہلے کراچی گیا جب کہ اس کی آبادی مشکل سے بیس لاکھ ہو گی۔ تب استقبالیہ جلوس کا اندازہ دس لاکھ لگایا گیا۔ اس کو کہتے ہیں کہ سارا شہر باہر نکل آیا۔ اس جماعت میں شمولیت پر علامہ شہید کو بیک وقت مرکزی قائم مقام صدر اور سیکرٹری اطلاعات کا عہدہ دینا علامہ شہید کی صلاحیتوں کا بہت بڑا اعتراف تھا۔

علامہ شہید اس شمولیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

> میں چونکہ شہر شہر تقریریں کر چکا تھا اس لیے تقریباً ہر شہر میں میرے خلاف مقدمات درج تھے۔ کسی جماعت کی سرپرستی کے بغیر کسی بھی سیاسی کارکن کے لیے ملک گیر محاذ پر لڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ مقدمات کی پیروی کے لیے ہر شہر میں وکلاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے سوچا مجھے کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ [1]

تحریک استقلال میں علامہ کی شمولیت ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں ہوئی۔ علامہ کو بہت عزت دی گئی اور ان کو مرکزی سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا اور اصغر خان کی غیر موجودگی میں قائم مقام چیرمین بھی مقرر کیا جاتا۔ اتنی چھوٹی عمر میں یہ علامہ کی بہت بڑی عزت افزائی تھی کہ پاکستان بھر کے تمام سیاسی لیڈران اس جماعت میں جمع ہو چکے تھے اور محض چھتیس سال کے ایک نوجوان کو پارٹی میں شمولیت کے ساتھ ہی مرکزی سطح پر بنیادی عہدہ دے دیا جاتا ہے۔ اور ان دنوں تحریک استقلال کی مقبولیت کا کیا عالم تھا وہ بھی پڑھتے جایئے کہ جب 20 فروری 1977ء کو اصغر خان نے کراچی میں اپنے حلقہ انتخاب برنس روڈ کا دورہ کیا تو ائیر پورٹ سے شہر تک انسانوں کا سمندر تھا جو اپنے قائد کا استقبال کرنے آیا تھا۔ ایک تاریخ رقم ہو گئی۔ آج تک اس جلوس کی مثال دی جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا کہ تقریباً دس لاکھ افراد اس استقبالی جلوس میں شامل ہوئے تھے۔ جبکہ بی بی سی ریڈیو کی رپورٹ سولہ لاکھ افراد کی تھی۔

چلتے چلتے ایک دل چسپ بات یہ بھی پڑھیے کہ وہ دن تحریک استقلال کے عروج کے دن تھے۔ ہر کوئی آ رہا تھا۔ اتفاق فاؤنڈری کے میاں شریف نے اپنے بیٹے نواز شریف کو میدان سیاست میں اتارنے کا فیصلہ کیا۔ موصوف بھی اسی سیلاب میں بہتے

---

[1] علامہ احسان الٰہی ظہیر کے انٹرویوز، صفحہ: 71۔

ہوئے تحریک استقلال کے ساحل پر آ رکے۔ اب یہ تو ظاہری بات ہے کہ پیسے کے زور پر آئے تھے اور مقصد اپنے مالی مفادات کا اقتدار کی قوت و طاقت سے تحفظ کرنا تھا۔ سیاسی پس منظر تو تھا نہیں اس لیے مواقع کے منتظر رہتے تھے۔ ایک صاحب بتا رہے تھے کہ میں نے ایک روز دیکھا کہ نواز شریف کتنی ہی دیر علامہ کے گھر کے باہر کھڑے رہے کہ علامہ باہر نکلیں تو ملاقات کا موقع مل سکے۔ انقلاباتِ زمانہ ہیں کہ وہی نواز شریف باوجود اپنی عدم صلاحیت کے تیسری بار ملک کے وزیر اعظم بن گئے۔

پاکستان قومی اتحاد

1976ء کے اواخر میں ذوالفقار علی بھٹو نے الیکشن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور پاکستان بھر میں دورے اور رابطہ عوام مہم شروع کر دی۔ 7 جنوری 1977ء کو بھٹو نے انتخابات کا باضابطہ اعلان کر دیا اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بالترتیب 7 اور 10 مارچ 1977ء کو ہونا ہونا طے ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے اعلان کے فوراً بعد پاکستان بھر کی سیاسی جماعتوں کا لاہور میں ایک اجلاس ہوا۔ UDF کے نام سے آٹھ سیاسی پارٹیوں کا اتحاد پہلے سے موجود تھا جبکہ تحریک استقلال اس میں شامل نہیں تھی۔ چنانچہ اس اجلاس میں پاکستان قومی اتحاد (P.N.A) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس طرح تحریک استقلال بھی اس اتحاد کا حصہ بن گئی اور بھٹو شاہی کا مل کر مقابلہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ تحریک استقلال اس اتحاد کی سب سے سینئر رکن تھی کہ اصغر خان کا ان دنوں طوطی بولتا تھا۔

نو جماعتوں پر مشتمل اس اتحاد کا جھنڈا سبز رنگ کا تھا جس پر نو ستارے بنے ہوئے تھے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث دعوت کے باوجود اس تاسیسی اجلاس میں شریک نہ ہوئی اور یوں اس اتحاد کا حصہ بننے سے محروم رہی۔

ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

جبکہ خاکسار تحریک جیسی چھوٹی سی جماعت جو افرادی قوت سے بھی محروم تھی وہ اس اتحاد کا حصہ بن چکی تھی اور نو میں سے ایک ستارہ تھی۔ یہ اہل حدیث قیادت کی حد درجہ نا اہلی تھی۔ مزید تکلیف دہ امر یہ تھا کہ جب تحریک شروع ہوئی تو اہل حدیث نوجوان سب سے سرگرم ہوتے اور بھٹو گردی کا مقابلہ کرنے میں، پولیس سے مار کھانے میں سب سے آگے ہوتے۔ سیاسی جماعتوں میں قیادت کی نا اہلی سے بڑا المیہ کوئی نہیں۔

الیکشن 1977ء

مارچ 1977ء آن پہنچا تھا۔ تجزیہ کار کہہ رہے تھے کہ الیکشن پیپلز پارٹی جیت جائے گی۔ اگرچہ قومی اتحاد اچھا مقابلہ کر رہا ہے اور مضبوط اپوزیشن تو بنائے گا مگر حکومت نہیں بنا سکے گا۔

الیکشن کے امیدواروں اور حلقوں کا انتخاب ہو چلا تھا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی قومی اسمبلی کی نشست کے لیے امیدوار تھے۔ لاہور سے اسی کلومیٹر دور پتوکی کا حلقہ آپ کو دیا گیا۔ اس حلقے میں اہل حدیث بڑی تعداد میں بستے تھے۔ لیکن اتنے بھی نہیں کہ الیکشن آسانی سے جیت لیا جاتا۔ علامہ کی زندگی کا پہلا الیکشن تھا اور وسائل لامحدود بہرحال نہ تھے۔ لیکن علامہ نے بستر اٹھایا اور پتوکی چل دیئے۔

ناز و نعم میں پلا ہوا احسان الٰہی، خوشبو میں ہر دم بسا رہنے والا، کپڑوں پر سلوٹیں نہ پڑنے دینے والا ایک خالص دیہاتی حلقے میں جا پہنچا۔ علامہ کا حق تھا کہ ان کو کسی شہری حلقے سے الیکشن کے لیے ٹکٹ دیا جاتا۔ لیکن جو بھی فیصلہ ہوا علامہ نے قبول کیا اور محنت شروع کر دی۔ حلقے کا اسی فیصد دیہاتی علاقے پر مشتمل تھا۔

علامہ کے مقابلے پر پیپلز پارٹی کے امیدوار راؤ شفاعت تھے۔ وہی روایتی جاگیر داری نظام کے پروردہ۔ یہ لوگ اپنے حلقے کو اپنی ذاتی جاگیر ہی نہیں سمجھتے، اس میں

بسنے والے انسانوں کو بھی اپنا غلام جانتے ہیں۔ سرداروں کے لیے حیران کن بات تھی کہ سینتیس سال کا ایک نوجوان جس کے خاندان کی کوئی سیاسی تاریخ بھی نہ تھی۔ جو بے انتہا رئیس بھی نہ تھا، جس کی اس حلقے میں ایک انچ زمین بھی نہ تھی، کیونکر ان کے مقابلے میں اتر آیا اور آخر قومی اتحاد نے اس ''مولوی'' کو کیا سوچ کر ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔

علامہ کی خطابت کا کمال تھا کہ برسوں کے بنے بت ٹوٹنے لگے۔ ''سرداروں کے مقابلے میں کوئی نہیں اتر سکتا'' اس جملے کا سحر ٹوٹنے لگا۔ سردار بھی اس بدلتے رنگ کو دیکھ رہے تھے اور فکر مند تھے۔ الیکشن کا دن آیا تو انہوں نے بدمعاشی اور غنڈہ گردی کی انتہا کر دی۔ علامہ کے پولنگ ایجنٹ اغوا کر لیے گئے۔ کہیں دھونس اور دھاندلی سے پولنگ رکوا دی گئی۔ جعلی بیلٹ باکس بھرے گئے اور انتخابات کا نتیجہ اپنی مرضی کا حاصل کر لیا گیا۔ دھاندلی سے علامہ کو ہروا دیا گیا۔ بی بی سی نے ایک تجزیہ نشر کیا کہ جن حلقوں میں حد سے زیادہ دھاندلی کر کے انتخابات کے نتائج تبدیل کر دیئے گئے، ان میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کا حلقہ بھی شامل تھا۔

الیکشن کے نتائج کچھ یوں تھے کہ پیپلز پارٹی نے کل 155 سیٹیں جیت لی تھیں، جبکہ قومی اتحاد پورے پاکستان میں صرف 35 سیٹیں جیت سکا۔ جبکہ پنجاب بھر اور وفاقی علاقہ جات میں پیپلز پارٹی نے 108 جبکہ قومی اتحاد نے صرف 8 ...... جی ہاں صرف 8 نشستیں جیتیں۔ 8 مارچ کو ایک پریس کانفرنس میں اتحاد کے قائدین نے 10 مارچ کو ہونے والے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔

بھٹو کے خلاف تحریک کا آغاز

ذہین اور فطین بھٹو نے حماقت کا ثبوت دیا اور بے تحاشا اکثریت سے الیکشن جیتنے کے شوق میں دھاندلی کی انتہا کر دی۔ الیکشن کا نتیجہ آیا، جو مذاق لگ رہا تھا کہ قومی اتحاد

کا نام ونشان نظر نہ آ رہا تھا۔ ہر طرف پیپلز پارٹی جیت گئی یا یوں کہیے جتوا دی گئی۔ ردِ عمل میں عوام بپھر گئے اور بھٹو کی اس دادا گیری کے خلاف ملک بھر میں تحریک شروع ہو گئی۔ جس میں الیکشن کے نتائج کو نہ ماننے کا اعلان کر دیا گیا اور بھٹو حکومت کو ختم کرنے کا مطالبہ بھی۔ 12 مارچ کو مفتی محمود نے پریس کانفرنس میں احتجاجی تحریک کا اعلان کیا اور 14 مارچ کو نیلا گنبد سے پہلا احتجاجی جلوس نکالا گیا جس کی قیادت اصغر خان نے کی۔ ہر شہر میں ہنگامے شروع ہو گئے اور احتجاجی جلسے بھی۔ یہ دن علامہ شہید کی خطابت کے عروج کے دن تھے۔

تحریک نظام مصطفیٰ

ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کی تحریک تھی جو تحریک نظام مصطفیٰ میں بدل گئی یا یوں کہنا چاہیے کہ بدل دیا گیا۔ وگرنہ تحریک کی بنیادی رکن جماعتوں میں خان عبدالولی خان کی عوامی نیشنل پارٹی اور تحریک استقلال جیسی جماعتوں کی موجودگی میں کسی مذہبی تحریک کا کیا جواز تھا۔ بھٹو کی فسطایت اور آمرانہ طرزِ حکومت کے خلاف ایک لاوا تھا جو ابل پڑا۔ جب الیکشن میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کی گئی تو عوام سڑکوں پہ آ گئے۔ پورے ملک میں عوامی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ذوالفقار علی بھٹو اس حد تک جا کر دھاندلی نہ بھی کرتے تو بھی امکان تھا کہ ان کی پارٹی الیکشن جیت جاتی۔ لیکن جمہوریت کے کچھ نام لیوا اور علم بردار عموماً اپنی فطرت میں بدترین آمر ہوتے ہیں۔ بھٹو کی انا پرستی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ اس نے محض بلا مقابلہ منتخب ہونے کا ''اعزاز'' حاصل کرنے کے لیے لاڑکانہ سے اپنے مخالف جماعت اسلامی کے امیدوار کو اغوا کرا لیا اور تب چھوڑا گیا جب کاغذات نامزدگی کی تصدیق کا وقت گذر گیا۔ یہ تھی ''قائدِ عوام'' کی جمہوریت۔ اس ظلم اور جبر کے خلاف عوامی احتجاج شروع ہو گیا۔ ردِ عمل میں حکومت نے عقل و دانش کو خیر باد کہتے

ہوئے مظاہرین پر تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے تحریکیں کہاں دبتی ہیں بلکہ

رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

کے مصداق تحریک میں شدت آتی گئی۔

بھٹو کے جبر و استبداد کا عالم

ذوالفقار علی بھٹو نے ''تحریکیوں'' اور ان کی تحریک سے نمٹنے کے لیے پولیس اور فوج کے علاوہ ''ایف ایس ایف'' کے نام سے ایک الگ فورس بھی قائم کی تھی اور یوں یہ تینوں ادارے مل کر ظلم و تشدد کی بدترین تاریخ رقم کر رہے تھے۔ ہر طرف خوف کا سناٹا تھا اور خوف کی اس فضا کو قائم کرنے کے لیے بھٹو حکومت ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتی تھی۔ اندازہ کیجیے کہ میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی جیسے نجیب آدمی کو جب گرفتار کیا گیا تو جیل میں ان کی کوٹھری میں بازار حسن سے طوائفیں لا کر نیم برہنہ بٹھا دی گئیں۔ اس طرح کی حرکات پیپلز پارٹی کا ''مائنڈ سیٹ'' تھا۔

سو اس ماحول میں شرفا کے لیے عزت بچانا ایک مسئلہ تھا۔ دوسری طرف اپنے کارکنان کے اندر نفرت کی فضا پیدا کر کے قومی اتحاد کے کارکنان کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ میرے ایک عزیز جو پیپلز پارٹی کے ورکر تھے، وہ بتاتے ہیں کہ ''ہم مال روڈ کی عمارتوں پر چڑھے ہوتے تھے کہ جلوس کے شرکاء پر پتھراؤ کیا جائے اور بعض کارکن تیزاب کی بوتلیں بھی ہاتھوں میں لیے ہوتے تھے۔ یعنی بھٹو خانہ جنگی والا ماحول پیدا کرنے جا رہے تھے۔ ان کڑے دنوں کی تصویر آپ کو علامہ کے اس خطاب میں نظر آ سکتی ہے کہ جب اوکاڑہ میں ایک انتخابی جلسے سے خطاب کیا۔ علامہ کہتے ہیں:

''ہم ان شاء اللہ اسے بھاگنے نہیں دیں گے۔ پہلے خواجہ رفیق کے معصوم بچوں کا ہاتھ ہو گا اور تیرا گریبان ہو گا۔ ڈاکٹر نذیر کے خون کا بدلہ بھی،

مولوی شمس الدین کے خون کا بدلہ بھی، جاوید نذیر کے خون کا بدلہ بھی اور احمد رضا قصوری کیا ہوا، ہم سے روٹھ گیا۔ اس کے باپ کے خون کا بدلہ بھی اور اس عالم دین کی آبرو کا بھی جس کو تم نے مادر زاد برہنہ کر کے ایک فاحشہ عورت کو اس کے اوپر بٹھایا اور اس بوڑھے...... ہائے...... ملتان کے اس پینسٹھ سالہ بوڑھے کا بدلہ بھی جس کے بالوں کی سپیدی کو دیکھ کر رب کی رحمت بھی شرما جائے۔ جس کو تم نے جیل میں لے جا کر بدفعلی کا ارتکاب کروایا اور وہ جب جیل خانے سے باہر آیا تو اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی، کہ اس رسوائی کو لے کر اس دنیا میں زندہ نہیں رہنا۔''

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کس قدر ظالم تھی کہ اس کی نظر میں مخالفین کی عزت و آبرو کا کوئی مقام نہ تھا۔ بے انتہا ذہین و فطین ہونے کے باوجود بھٹو کی اس خامی نے اس کی حکومت کو رسوا کر کے رکھ دیا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ روز آخرت ان مظالم کا حساب یہ حکمران کیسے دیں گے؟ [1]

مال روڈ پر ''واہگہ بارڈر''

مال روڈ پر جلوس کے شرکا جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ آج ہجوم کے تیور کچھ اور ہی تھے۔ دوسری طرف حکومت حسب معمول مزاحمت پر تیار تھی۔ ہر روز احتجاجی تحریک میں جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ اس تناسب سے حکومتی مزاحمت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ شاید یہ اقتدار کی کرسی کا کمال ہے کہ انسان کی بصارت اور بصیرت دونوں کمزور ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ورنہ حالات کس نہج پر جا رہے ہوتے ہیں، صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اس روز بھی ایسی ہی حکومتی حماقت تھی کہ بریگیڈیئر اقبال جو فوج کے دستے کی کمان کر رہے تھے،

[1] ویسے تو بھٹو جیسے لیڈر بہت روشن خیال بنتے ہیں مگر ان کی اس طرح کی حرکات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے اندر اخلاقیات کا معیار کتنا گرا ہوتا ہے۔

انہوں نے مال روڈ پر جلوس کے راستے پر ایک سرخ لائن کھینچ دی اور اعلان ''فرما'' دیا کہ جو بھی یہ لکیر عبور کرے گا، اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ اپنے ہی نہتے عوام پر گولی چلانا، ''بہادر'' سورماؤں کا ہمیشہ سے ہی دل پسند مشغلہ رہا ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر کی ہی آخری تقریر کا اقتباس ہے کہ

> ''سینے پر دس دس تمغے لگائے ہوئے، جرنیل بھی ہے کرنیل بھی ہے۔ پوچھو کس ملک کو فتح کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ رات کے اندھیرے میں اپنی قوم کو فتح کیا، اپنے ملک کو فتح کیا۔''

سو اس روز بھی بریگیڈئیر محمد اقبال کی کمان میں بھٹو کے سپاہیوں کا ایک دستہ، اپنی قوم اور مال روڈ کو فتح کرنے کے لیے سڑک پر سرخ لکیر کو ''واہگہ بارڈر'' تصور کیے ہوئے موجود تھا۔

دوسری طرف ایک جم غفیر تھا جس کی قیادت علامہ احسان الٰہی ظہیر کر رہے تھے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ ''واہگہ بارڈر'' آ گیا۔ اب اس سرخ لکیر پر پہنچ کر جلوس اضطراری طور پر رک گیا۔ ایک طرف فوجی جوان بندوقیں سیدھی کیے۔ دوسری طرف گریبان وا کیے جذباتی ہجوم، اعصاب کا تناؤ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر یہ سوچ کہ جو آگے بڑھا اس کو بریگیڈئیر صاحب کے حکم کی تعمیل میں گولی مار دی جائے۔ ادھر یہ اضطراب کہ بارش کا پہلا قطرہ کون بنتا ہے اور یہ کہ بارش کا قطرہ کہیں خون رنگ نہ ہو جائے۔ ایسے میں صرف پینتیس سال کا جرأت مند، جو اس کم عمری میں جلوس کی قیادت بھی کر رہا تھا آگے بڑھتا ہے اور اس عالم میں کہ گریبان کھولے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ

جسے ہو غرور، آئے کرے شکار مجھے

تنی ہوئی بندوقیں نیچے ہو گئیں کہ یہ جوان علامہ احسان الٰہی ظہیر تھے۔ علامہ کی اس

کمال درجے کی جرأت کو دیکھ کر جلوس کے شرکاء کے جذبات تو جو بھڑکنے تھے سو بھڑکے۔فوج کے کمان دار بھی حیران رہ گئے۔ بریگیڈیئر اقبال علامہ کی جرأت کے اس درجہ اسیر ہوئے کہ تادم وفات علامہ کے دوست بن گئے۔

9 اپریل کا خونی دن

پھر 9 اپریل 1977ء کا تاریخی دن آج بھی علامہ کی جرأت و بہادری کی داستان سناتا ہے۔ اس روز مسلم مسجد لوہاری سے جلوس نکلنا تھا۔ پاکستان قومی اتحاد کی بیشتر قیادت جیل جا چکی تھی۔ لوہاری دروازے کے باہر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ علامہ بھی اچانک کسی طرف سے نمودار ہوئے اور جلوس کے شرکاء کا جذبہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس روز پولیس نے بدترین تشدد کیا۔ آنسو گیس کا ایک شیل سیدھا علامہ کو آ کر لگا تو علامہ زخمی بھی ہوئے اور بے ہوش بھی ہو گئے۔ کارکنان علامہ کو اٹھا کر مسجد چینیانوالی لے آئے جو وہاں سے قریب ہی تھی۔ میرے سیاسی شعور میں بھی 9 اپریل کی شام ایسے ہی تازہ ہے جیسے نوزائیدہ بہار میں کھلتے ہوئے گلاب۔

وہ اس طرح کہ اس روز میرے والد بھی پولیس کے ہاتھوں بری طرح مضروب ہوئے۔ ان کے سفید جسم پر سرخ لکیریں آج تک میری نظر میں ٹھہری ہوئی ہیں۔

مسجد شہداء لاہور میں ''تحریک نظام مصطفیٰ'' کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ جمعے کے روز اس پر تحریک کے داعیوں کا قبضہ ہوا کرتا تھا اور تحریک کے دنوں میں علامہ نے مسلسل وہاں پر ہی جمعے پڑھائے۔ انتظامیہ نے بہت کوشش کی کہ علامہ کو گرفتار کر کے جمعہ پڑھانے سے روکا جائے مگر علامہ ان کو جل دے کر کسی نہ کسی صورت مسجد میں داخل ہو ہی جاتے۔ علامہ اتنے بلند آہنگ سے خطبہ دیتے کہ میرے تایا زاد عبدالغفور بتاتے ہیں کہ ایک روز علامہ کے منہ سے دوران خطبہ خون آنے لگا۔ نہ جانے کتنا زور لگا دیا کہ خونِ جگر بھی باہر آنے کو تھا۔ بھائی عبدالغفور نے اپنا رومال علامہ کو دیا خون صاف کرنے

کے لیے۔ یہ عبدالغفور وہی ہیں کہ جن کی ایک آنکھ 23 مارچ 1987ء کے جلسے میں بم کے ذرات لگنے سے ضائع ہوئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عبدالغفور باوفا اور باضمیر ثابت ہوئے کہ اپنی آنکھ ضائع ہونے کا دوش علامہ کو نہیں دیتے اور آج تک علامہ سے محبت بھی کرتے ہیں اور علامہ کے بارے میں کبھی ایک برا لفظ بھی منہ سے نہیں نکلا۔

''تحریک نظام مصطفیٰ'' میں علامہ بھی ایک بار جیل گئے۔ ان کی جیل یاترا کے بارے میں ایس ایم ظفر کہ جو جیل میں ان کے ساتھی تھے یوں لکھتے ہیں:

> ''میں جب کوٹ لکھپت جیل کے بڑے دروازے سے گزر کر اس بیرک میں پہنچا جہاں مجھے نظر بندی کے دن گزارنے تھے تو میں نے نواب زادہ نصر اللہ، پروفیسر غفور احمد صاحب، ملک وزیر علی کے علاوہ علامہ احسان الٰہی ظہیر کو دیکھا جو پہلے سے وہاں موجود تھے۔ مجھے بیرک میں داخل ہوتے دیکھ کر علامہ احسان الٰہی ظہیر بولے: ''لیجیے ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ اس روز جلوس میں شامل کرانے کا مقصد یہی تھا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ یہاں پہنچ جائیں۔'' اس پر تمام قائدین کرام نے قہقہہ لگایا یہ سب لوگ اس بات پر خوش تھے کہ یہ میری پہلی جیل یاترا تھی۔ میری سیاست زیادہ تر آئین اور قانون کی حدود ہی میں ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اس سے پہلے کسی حکومت میں نظر بندی یا گرفتاری نہیں ہوئی تھی۔
>
> میں نے علامہ کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ میں بھانپ گیا کہ یہ علامہ اور میری دوستی کا آغاز ہے۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ہم نے مشترکہ طور پر جیل سے اپنی نظر بندی کو چیلنج کیا اور ہم دونوں جیل سے عدالت عالیہ تک پولیس وین میں بیٹھ کر اپنی آئینی درخواست کی پیروی کرنے کے لیے اکٹھے آتے جاتے رہے۔

جیل کی بیرک میں بحثوں کا سلسلہ شروع ہوا اور علامہ صاحب اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ ایک دن انہوں نے ذکر کیا کہ نواب اکبر بگٹی کو جیل میں قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ اس پر ہم دونوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل چودھری حمید سے گفتگو کی۔ اس نے کچھ لیت ولعل سے کام لیا۔ اس پر بیرک کے باقی ساتھیوں نے جلوس نکالنے کی دھمکی دی۔ بالآخر نواب اکبر بگٹی کو بھی ہماری بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔

بالآخر عدالت عالیہ لاہور کے جج جناب چودھری محمد صدیق نے ایک ہی فیصلہ سے علامہ صاحب اور میری نظر بندی کے احکامات کو کالعدم قرار دیا۔

ہم دونوں 24 اپریل کو باہر آئے۔''

تحریک استقلال کو خدا حافظ

جب تحریک نظام مصطفیٰ کا خاتمہ بالخیر ہو گیا اور ''امیر المؤمنین'' جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو قومی اتحاد بہت جلد تحلیل ہو گیا۔ اب جنرل ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر ڈرامہ شروع کر دیا۔ ایک مجلس شوریٰ بنائی گئی، جس میں اہل حدیث کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس احساس محرومی نے پورے ملک کے اہل حدیث علماء اور عوام کو ایک غم کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ دوسری طرف تحریک استقلال کے پلیٹ فارم سے چھتیس سالہ نوجوان احسان الٰہی ظہیر کی کامیابیوں اور خطابت کے چرچے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب بھر میں بالخصوص میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس احساس محرومی نے اہل حدیث اشرافیہ کو علامہ احسان الٰہی ظہیر کی طرف رجوع کرنے پہ مجبور کر دیا۔ وفود کے وفود علامہ کے درِ دولت پر حاضری دینے لگے۔ کہ آئیں، آگے بڑھیں اور جماعت کی قیادت سنبھالیں۔ دوسری طرف علامہ شہید بھی تحریک استقلال کے بعض معاملات سے مایوس تھے۔ تحریک کے سربراہ اصغر خان نے اپنی مقبولیت سے خوش فہم ہو کر قومی

اتحاد کو تحلیل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ علامہ اس فیصلے کے خلاف تھے۔

کالے کپڑے پہن کر پریس کانفرنس

اس مرحلے پر علامہ شہید نے تحریک استقلال کو خیر باد کہنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ نے لاہور میں پریس کانفرنس کی۔ اس میں آپ نے سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کیا۔ سیاہ ٹوپی سیاہ جوتے۔ یہ اصغر خان کے اس افسوس ناک فیصلے پر آپ کا ردعمل تھا۔ لیکن اس فیصلے سے آپ کے مرد میدان ہونے کا بھی پتہ چل گیا کہ آپ نے یہ فیصلہ اس وقت کیا جب تحریک ختم ہو چکی تھی۔ ورنہ لوگ مشکلات میں بھاگ جایا کرتے ہیں۔ آپ نے تحریک کے مشکل دنوں میں تحریک کا مکمل ساتھ دیا۔

آپ نے تحریک استقلال چھوڑ دی اور اپنا اہل حدیث پلیٹ فارم بنانے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ مرکزی جمعیت کی قیادت جماعت کے عہدے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور منصفانہ انتخاب ان کی موجودگی میں ایک لطیفے سے کم نہ تھا۔

پہلے سے بڑے علامہ

ہفت روزہ ''اسلامی جمہوریہ'' کے 1978 کے ایک شمارے میں جناب مجیب الرحمان شامی نے اس پریس کانفرنس پہ ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

''علامہ احسان الٰہی ظہیر کہ جن سے ہزار اختلاف کے باوجود، اس بات سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے نظام مصطفےٰ ﷺ کے لیے قومی اتحاد کی تحریک میں تاریخی کردار ادا کیا۔ مقدمے بنے، گرفتار ہوئے، لیکن علامہ کی آواز مسجد شہداء لاہور سے اس شان سے گونجی کہ دلوں کو نیا حوصلہ عطا کرتی رہی۔ تحریک کے آخری دنوں میں جب بھٹو سے مذاکرات کا آغاز تھا، قومی اتحاد کے قائدین کو ان کی وارننگ بی بی سی اور نیوز ویک کے ذریعے دنیا بھر میں لہرائی۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر تحریک استقلال کے ذریعے جماعتی سیاست میں داخل ہوئے تھے، لیکن اب تحریک سے اس طرح نکلے کہ جماعتی سیاست سے بھی (وقتی طور پر) کنارہ کش ہو گئے۔ انہوں نے بھرپور کوشش کی کہ قومی اتحاد اور تحریک میں جدائی کے لمحے نہ آئیں، لیکن کامیابی نہ ہوسکی اور تحریک کے ''علیحدگی پسند عنصر'' کے سامنے ان کی ایک نہ چلی، کئی دن وہ ''عالم سوچ بچار'' کا شکار رہے اور بالآخر فیصلہ کر ہی لیا۔ اپنی رہائش گاہ پر ایک بھرپور پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور کہا کہ تحریک کی قومی اتحاد سے علیحدگی کے بعد ان کے حلقہ انتخاب اور احباب کا اصرار ہے کہ وہ اپنی جماعت سے علیحدہ ہو جائیں، سو میں اس خواہش کی تعمیل کر رہا ہوں گا اور اب میرا وقت تنظیم اہل حدیث کے لیے وقف ہو گا۔ میں فی الحال مذہبی اور دینی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوں گا ...... اور جب سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کی صورت بنے گی، تب سیاسی وابستگی کا فیصلہ کروں گا۔

علامہ نے سوالوں کی کرید کے باوجود اپنے جواب میں تلخی نہ گھلنے دی ...... اور بڑے میٹھے لہجے میں اپنے (اب سابق) قائد اور ساتھیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ علامہ کی اس پریس کانفرنس نے ان کی سیاسی شخصیت میں بڑا اضافہ کیا کہ جب پریس کانفرنس ختم ہوئی تو ایک سینئر اخبار نویس نے کہا: ''یار علامہ نے آج تو کمال کر دکھایا۔ اگر اصغر خان بھی انہی لہجوں میں قومی اتحاد سے الگ ہوتے، تو ان کے مقام میں بھی اضافہ ہوسکتا تھا'' ...... اس طرح علامہ اب پہلے سے بڑے علامہ ہیں کہ انہوں نے سرکش اختلاف کو سنجیدہ اور شائستہ زاویوں میں باندھ کر دکھا دیا۔''[1]

---

[1] ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ، لاہور: 21 نومبر 1977ء۔

اپنی الگ لکیر کھینچو اور محنت کرو

حافظ زبیر احمد ظہیر کہتے ہیں کہ ایک روز علامہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ اگر آپ کا مخالف ایک لکیر کھینچتا ہے اور آپ اس سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو، اس کی لکیر مٹانے کی طرف توجہ نہ دو، بلکہ اپنی الگ لکیر کھینچو، اس سے بڑی، اس سے گہری۔ تمہارے مخالف کی لکیر خود بخود چھوٹی ہو جائے گی۔ جتنی محنت اور توجہ اس کی لکیر مٹانے پر صرف ہوگی اسے بھی بچا کر اپنی لکیر پر لگا دو۔

جمعیت اہل حدیث کے قیام کا پس منظر

ہم لکھ چکے ہیں کہ جب قومی اتحاد کی تشکیل ہوئی تو اس میں نو جماعتوں کو شامل کیا گیا۔ ان نو جماعتوں کو نو ستارے بھی کہا گیا۔ جب قومی اتحاد کا جھنڈا بنایا گیا تو اس پر بھی نو ستارے موجود تھے۔ جس جماعت کی بے انتہا قربانیاں تھیں، جس کے کارکنان جان کی بازی لگانے کو ہر وقت تیار رہتے تھے، اس کو اس قابل ہی نہ سمجھا گیا کہ دسواں ستارہ ہی بنا لیا جاتا۔

یہ اس جماعت کی قیادت کی نااہلی تھی۔ علامہ شہید کو تو یہ لوگ پہلے ہی جماعت سے نکال چکے تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کو بطور مبصران اجلاسوں میں شریک تو کر لیا جاتا تھا مگر اتحاد کا حصہ نہ مانا گیا۔ یہ قیادت قومی اتحاد کے اجلاس سے پہلے ہی اجلاس کے مقام پر پہنچ جاتی تھی اور چہرے پہ خوشامد بھری مسکراہٹ سجائے کھڑے ہو جاتے۔

اہل حدیث مطالبات کمیٹی

علامہ نے مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر مرکزی جمعیت کو نظر انداز کر کے اپنا الگ پلیٹ فارم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جنرل ضیاء الحق نے مجلس شوریٰ اور دیگر ادارے تشکیل دینے شروع کیے تھے اور ان اداروں میں اہل حدیث کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس معاملے پر جماعت اہل حدیث میں اضطراب پایا جاتا تھا۔ اس کے

ساتھ ساتھ یہ احساس بھی اہل حدیث عوام کے دل میں جاگزیں تھا کہ تحریک نظام مصطفیٰ میں ہم نے بہت زیادہ قربانیاں دی ہیں مگر ہم کو ہی سب سے زیادہ نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس اضطراب نے علامہ اور آپ کے ساتھیوں کو ''اہل حدیث مطالبات کمیٹی'' تشکیل دینے پر مجبور کر دیا۔ لاہور میں اس کے پہلے کنوینز میرے والد مولانا عبدالخالق قدوسی بنائے گئے اور مسجد قدس چوک دالگراں میں اس سلسلے کا پہلا جلسہ رکھا گیا۔ میری یادوں میں اس اشتہار کا نقشہ آج بھی محفوظ ہے۔ یک رنگہ اشتہار تھا سفید زمین پر سیاہ عبارت۔ بہت کامیاب جلسہ تھا۔ میں بھی اپنے والد کے ہمراہ اس جلسے میں گیا۔ یہ کسی جلسے میں میری پہلی شمولیت تھی۔

تاریخ بدلنے کو تھی

''اہل حدیث مطالبات کمیٹی'' کے چند جلسے ہوئے۔ تمام جلسے بہت پر جوش اجتماع کے حامل تھے۔ کثیر تعداد میں لوگوں کی شرکت نے علامہ کے حوصلے بلند کر دیئے۔ دوسری طرف اہل حدیث عوام بھی اپنی قیادت کے جمود سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اسی دوران علامہ کی سوچ میں بھی نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کی چند روزہ قربت نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ نفاذ اسلام کا نعرہ محض سیاسی نعرہ ہے۔ دوسری تبدیلی علامہ کی سوچ میں یہ آ گئی تھی کہ مارشل لاء حکومت کے ساتھ چلنے میں اصولوں کی بھی نفی ہے۔ یہ سارا ماحول بہت تیزی سے جمعیت اہل حدیث کی تشکیل کے مراحل طے کر رہا تھا اور بہت جلد وہ وقت آ گیا کہ علامہ نے احباب کے مشورے اور اصرار پہ جمعیت اہل حدیث پاکستان کا اعلان کر دیا۔ ان فیصلوں کے روح رواں پروفیسر قاضی مقبول احمد، میرے والد (مولانا) عبدالخالق قدوسی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید ہوتے تھے۔ ان سرگرمیوں کی بنا پر جمعیت اہل حدیث میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ بعض ''شاہینوں'' کی جانب سے میرے والد کو دھمکیاں دی گئیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی

کہ ''تمہارے مکتبہ قدوسیہ کو آگ بھی لگائی جا سکتی ہے۔'' میرے والد بہت بہادر آدمی تھے۔ مگر شریف النفس تو تھے۔ مجھے یاد ہے ان دنوں ہمارے گھر کی فضا میں پریشانی لگی ہوئی تھی۔ علامہ شہید نے، میرے والد نے اور ان کے دیگر ساتھیوں نے یہ دن بہت مشکل اور محنت سے گذارے تھے۔ علامہ پہ قاتلانہ حملے تک کرائے گئے، جن کا ذکر آپ پڑھیں گے۔ شاید اسی لیے علامہ نے موچی دروازے کے جلسہ عام کی تاریخی تقریر میں ایک جملہ کہا تھا: ''راتوں کو پانی دینے کے لیے ہم تھے...... پکی ہوئی فصلیں کاٹنے کے لیے تو بہت آ جاتے ہیں۔''

علامہ پر الزامات

جب علامہ شہید نے الگ جماعت قائم کر لی تو ملک بھر کے اہل حدیث کسی سیلاب کی مانند اس جمعیت میں شامل ہونے لگے۔ کوئی دن گزرتا تھا، جب کسی علاقے کی بڑی شخصیت علامہ کی جماعت میں شامل نہ ہوئی ہو۔ لامحالہ اس ماحول میں ان کے حریفانِ حسرت زدہ کے دل پر آرے تو چلنے ہی تھے۔ اسی حسد اور تکلیف کا نتیجہ سامنے آیا اور انہوں نے علامہ کی کردار کشی شروع کر دی۔ آپ کی کتابوں پر چوری کے مضامین کا طعنہ دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ذہنی دیوالیہ پن کے حامل ان لوگوں نے علامہ کی عربی زبان پہ بھی اعتراض کر دیئے کہ اس شخص کو تو عربی بھی نہیں آتی۔ پتہ نہیں ان کے ذہن میں یہ نکتہ کیوں نہ آیا کہ اس شخص کو تو تقریر بھی نہیں آتی۔ کسی سے ریکارڈ کروا کے ٹیپ ریکارڈر جیب میں رکھ کر کے کیسٹ چلا دیتا ہے۔

لیکن علامہ شہید کی عزت اور شہرت پہ یہ مضامین کچھ بھی اثر انداز نہ ہوئے۔ ہر گزرنے والا دن علامہ کی عزت اور ہر دل عزیزی میں اضافہ کا دن ثابت ہو رہا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ آپ کے دوسرے مخالفوں کے ہاتھ میں ایک اور واحد ہتھیار آ گیا۔ مثلاً علامہ شہید کی کتاب بریلویت کا جواب دینا بریلوی علماء کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا۔

الحمرا ہال میں احمد رضا خان پر ایک کانفرنس تھی۔ اس میں بھی علامہ کی کتاب ''بریلویت'' کے تذکرے تھے۔ اہل حدیث کے ''ممدوح خاص'' میاں نواز شریف کے بھائی میاں شہباز شریف مہمان خصوصی تھے۔ ان کی رگِ بریلویت پھڑکی۔ انہوں نے سٹیج پر آ کر اعلان کیا کہ جو علامہ احسان الٰہی ظہیر کی کتاب بریلویت کا جواب دے گا، اس کو حلوہ بھی کھلاؤں گا اور ایک پلاٹ انعام دوں گا۔ ایک لاکھ روپے نقد کا اعلان بھی کیا یہ خبر اگلے روز کے نوائے وقت اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئی۔ شاید اس اعلان کا نتیجہ تھا کہ بریلوی حضرات نے اپنی دانست میں ''بریلویت'' کا جواب لکھا۔ اس کتاب کا نام ''اندھیرے سے اجالے تک'' رکھا گیا۔ یہ جواب کیا تھا اور کیسا تھا، یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اس ''جواب'' میں ''اصل جواب'' وہی بنتا تھا، جس میں علامہ پر لگائے گئے الزامات [1] کا تذکرہ تھا۔

ممکن ہے ہماری جماعت کے کوئی ''بھگت کبیر'' قسم کے صاحب میرے ان الفاظ پر اعتراض کریں کہ ان کی کیا ضرورت تھی۔ میرا اتنا ہی جواب ہے کہ جن کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے وہ دوسروں کی عزت کا بھی خیال کرتے ہیں۔ وہ لوگ ذہنی بیمار ہوتے ہیں وہ لوگ کہ کسی کے بزرگ کی عزت تو سر بازار اچھالنے کو بھی اپنا حق سمجھیں اور خود کو برہمن خیال کیے بیٹھے رہیں۔

[1] یہ مضامین علاوہ شہید پر بعض اعتراضات پر مشتمل تھے اور حد اخلاقیات سے گزرتے ہوئے ذاتیات کو زیر بحث لایا گیا تھا۔ یہ مضامین مولانا عبدالرحمان مدنی کے نام سے لکھے گئے۔ مگر انہوں نے تقریباً پچیس برس بعد اپنے ایک انٹرویو میں ان مضامین کا پول کھول دیا۔ اسی بات سے انکار کر دیا کہ یہ مضامین ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ دیر سے ہی سہی مگر اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واضح لفظوں میں اقرار کیا کہ میں ذاتی مخالفت کی وجہ سے ان مضامین کے غلط مدرجات سے عدم اتفاق کے باوجود خاموش رہا۔ اب آپ ان کا یہ بیان اگلے صفحات میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ اس وضاحت کے بعد ان الزامات کے پاؤں تلے زمین باقی نہیں رہی۔ تو علامہ کی کتب کے جواب میں جب دلیل نہ ہو تو ان مضامین کو روایت کرنا کس اخلاقی دیانت کے زمرے میں آتا ہے؟

جہاں تک تعلق ہے میاں شہباز شریف کے اعلان کا تو اس پر ہم تبصرے نہیں کرتے، یہ ان کے ذمے قرض ہے کہ جو میاں صاحب کو اٹھتے بیٹھتے ...... اہل حدیث تک ثابت کرتے رہتے ہیں۔ ہاں ان کو یہ ضرور یاد دلاتے چلیں گے کہ میاں نواز شریف جب ایک تحریری معاہدے کے تحت دس سالہ شاہی جلا وطنی کے بعد پاکستان واپس آئے تو کسی مسجد میں نہیں گئے تھے، سیدھے دربار پہ تشریف لے گئے تھے۔

پھر کیا ہوا......

علامہ شہید پہ الزامات لگائے گئے۔ علامہ نے اپنے رسالے میں کبھی جواب نہ دیا۔ بس ایک خاموشی تھی۔ نہ جانے اس خاموشی کے پیچھے کیسا اضطراب تھا۔ کبھی تو اس نے تنہائی میں اپنے رب کے سامنے اس درد کو ظاہر کیا ہوگا، کبھی تو ایک آنسو درد بن کر بہہ نکلا ہوگا، کبھی تو اس کی زبان سے نکلا ہوگا:

اللہ میں تو وہ ہوں
جس نے تیرے نبی کی بیوی
کہ جس کی عصمت کی گواہی
تو نے آسمان سے دی
اللہ میں تو اس ام المومنین سیّدہ عائشہ (رضی اللہ عنہا)
کی عزت و عصمت کی
حفاظت کے لیے لڑتا رہا
اللہ میں
ابوبکر و عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم)
کی عزت کی چوکھٹ
پر کھڑا

پہرے داری کرتا رہا

اللہ آج میری عزت کا سوال ہے

پھر...... پھر یوں ہوا کہ اللہ نے تنہائی میں کی گئی ان فریادوں کو سن لیا اور علامہ شہید کو وہ عزت دی کہ کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ علامہ کے لیے خاص بلاوا آیا۔ آپ کو جنت البقیع بلایا گیا۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قدموں میں سلا دیا گیا۔ اس خاک میں کہ جس کو ہماری آنکھیں چومتی ہیں۔ ع

مٹی قبر تیری دی لے کے

اکھیں سرماں پاواں

صاحب مضمون کے لیے نہ ہم نے، نہ علامہ نے برا چاہا ہوگا، مگر رسوائی سر بازار ہوئی۔

وہ کہتے ہیں کہ میں تو بے قصور تھا

عبدالقیوم ظہیر علامہ شہید سے خاص محبت رکھتے ہیں۔ ان کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ ''ظہیر'' کا لاحقہ بھی لگا رکھا ہے۔ وہ وہاں تک جا پہنچے کہ جہاں تک ہم نہ جا سکے۔ اپنا اپنا انداز ہوتا ہے قرض چکانے کا۔ وگرنہ مقروض تو ہم سارے ہیں علامہ کے۔

عبدالقیوم ظہیر نے مولانا عبدالرحمٰن مدنی سے پوچھا آپ ان کی زبانی سنیے:

راقم الحروف اس وقت طالب علم تھا اور مرکزی جمعیت کے دفتر 106 راوی روڈ میں اہلحدیث سٹوڈنٹس فیڈریشن پاکستان کا ناظم دفتر تھا جس کی وجہ سے حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب سے کافی گہرے مراسم تھے۔

''راقم الحروف نے ایک دن حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب سے ان کے دفتر میں واقع مسجد جو J99۔ بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہے، وہاں بیٹھے ہوئے عرض کی کہ مدنی صاحب میں بہت حیران ہوا ہوں ایک طرف آپ کا یہ خطاب جو جناح ہال میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کو خراج

تحسین پیش کرتا ہے اور دوسری طرف آپ کا ایک مضمون ہفت روزہ اہل حدیث شمار نمبر 3 صفحہ 5 تا 7 (1984) جو کہ شہید اسلام قائد اہل حدیث کے متعلق انتہائی گھٹیا مضمون آپ کے نام سے شامل ہے جس میں یہ تحریر بھی موجود ہے کہ ان کو تو عربی زبان نہیں آتی اور اس میں گرائمر کی اغلاط بھی ہوتی ہیں بلکہ ان کی کتابوں کو میرے شاگرد تحریر کرتے ہیں اور ان (علامہ احسان الٰہی ظہیر) کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ یہ تو کھلی تضاد بیانی ہے تو حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب نے کہا بیٹا عبدالقیوم وہ میرا مضمون ہے ہی نہیں بلکہ میرا علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کے ساتھ ذاتی اختلاف تھا تو جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی اور شخص میرے نام سے علامہ صاحب رحمہ اللہ کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا تھا جبکہ میں ذاتی اختلاف کی وجہ سے خاموش رہا اور اس مضمون نگار کو نہ روکا اور نہ تردید کی جبکہ حقیقت یہی ہے کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر علمی دنیا میں بلند نام کے مالک تھے۔ مسلک اہل حدیث کے ماتھے کا جھومر تھے۔ عالم اسلام بھی ان کی خداداد اور قائدانہ صلاحیتوں کا قائل تھا اور آج بھی ہے۔" [1] (مجلّہ الاخوۃ)

جمعیت اہلحدیث پاکستان

اہلحدیث مطالبات کمیٹی دراصل جمعیت اہلحدیث کے باقاعدہ قیام کا سبب ثابت ہوئی اور ...... گوجرانوالہ میں پاکستان بھر سے آئے ہوئے علماء کرام کے بڑے اجتماع نے اس کے قیام کا مشترکہ اعلان کیا۔ مولانا محمد عبداللہ کو پہلا امیر مقرر کیا گیا۔ جو کہ جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث تھے۔ جب کہ مولانا محمد حسین شیخوپوری کو پہلا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ علامہ شہید کی متحرک شخصیت کے سبب ابتدائی طور پر اسے علامہ گروپ

[1] مجلّہ الاخوۃ / لاہور / انٹرویو مولانا عبدالرحمان مدنی از عبدالقیوم ظہیر۔

ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن علامہ کو شب و روز کی محنتوں کا پھل یہ ملا کہ صرف چند برسوں میں ہی متحارب کھلاڑی کا نام ونشان تک نہ رہا اور میدان سیاست میں اہلحدیث کی نمائندہ جماعت صرف جمعیت اہل حدیث کو ہی شمار کیا جانے لگا۔ صرف تین برس کے عرصے میں تمام ملک میں کوئی ایسا نمایاں عالم دین، شیخ الحدیث، مقرر اور مصنف نہ رہا کہ جو اہلحدیث ہو اور جمعیت اہلحدیث کا رکن نہ ہو۔ جمعیت کے قیام کے بعد اس کے ابتدائی دفاتر برانڈرتھ روڈ پہ ایک عمارت میں قائم کیے گئے جو بہت جلد شاہ جمال کی ایک بڑی عمارت میں منتقل کر دیئے گئے اور چند برس میں ہی 53 لارنس روڈ کی عمارت خرید لی گئی اور جمعیت کے دفاتر یہاں آ گئے۔

جمعیت کے قیام کے بعد ہی علامہ شہید نے بطور جماعت ملکی امور میں بحیثیت قائد جمعیت نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ جلسہ ہائے عام کا انعقاد کیا۔ اپنی جرأت اور بہادری سے اہلحدیث کو ان کا مقام دلایا جس کا تذکرہ آپ اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔

اقلیم خطابت کا تاج دار

شہید علامہ احسان الٰہی ظہیر کی خطابت کا لوہا اپنے اور غیر سبھی مانتے تھے۔ آپ ایک شعلہ بیاں خطیب تھے۔ الفاظ جیسے آپ کے سامنے ہاتھ باندھے تیار کھڑے ہوتے، موتیوں کی لڑی سے یکے بعد دیگرے گرتے رہتے اور ہر لفظ اپنے مقام پر آتا۔ اگرچہ آپ کی ذات کے کئی پہلو تھے۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں آپ کا ایک خاص مقام تھا، سیاست میں آپ صفِ اول کے راہنما تھے، راہنما ایسے کہ ایک قوم کی سوچ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ لیکن ان سب کے باوصف خطابت آپ کی ذات کا نمایاں ترین پہلو تھا۔ آپ لوگوں کے دلوں پہ ہاتھ رکھتے اور سرد راتوں میں بھی گرمی کی لہر دوڑ جاتی، دسمبر کی ٹھٹھرتی راتوں میں لوگوں کو میں نے آپ کی تقریر کے انتظار میں رات کو آنکھوں میں کاٹتے دیکھا۔ بہت سے مشتعل ہجوم آپ کے الفاظ کے جادو سے برف کی مانند جامد اور ٹھنڈے ہوتے دیکھے۔ بس یوں سمجھ لیں

دیکھنا تقریر کی لذت جو اس نے کہا
میں نے جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جب آپ مدینہ یونیورسٹی میں طالب علم تھے تو آپ کی خطابت کا شہرہ ساتھیوں

میں تھا۔ عربی زبان پر آپ کو عبور ایسا تھا کہ جیسے مادری زبان ہو۔ یونیورسٹی کا ماحول عربی تھا اور آپ کو ویسے بھی عربی زبان و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ آپ یونیورسٹی میں اس لیے بھی ممتاز حیثیت کے حامل تھے کہ عجمی ہونے کے باوجود عرب طالب علموں سے زیادہ عربی زبان و ادب پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ وہیں پر آپ نے عربی میں خطابت کا آغاز کیا اور اس میں اتنا ملکہ حاصل کیا کہ آپ عربی کے بھی بے نظیر خطیب ٹھہرے۔ اس کی شہادت عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے دی ہے جس کا تذکرہ علامہ شہید نے اپنی تحریر میں یوں کیا ہے:

''دوسری مرتبہ جب کہ مسجد نبوی کے باب السعود میں نماز مغرب کے بعد حسب معمول عربی میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا، آیات جہاد تلاوت کیں۔ فلسطین، کشمیر، قبرص اور اریٹیریا کے پس منظر میں اپنے ماضی کو آواز دی، بھیڑ بڑھتی اور آنکھیں بھیگتی چلی گئیں، سامنے شاہ دو عالم ﷺ اپنے دو سالاروں سمیت استراحت فرما، پڑوس میں ہی بائیں طرف بقیع میں سلطنت روم و یونان کے روندنے والے اور ایران و توران کے مسلنے والے محو خواب، پیش منظر میں بنو قریظہ و بنو نضیر کی اولاد کی دھمکیاں؟

سسکیاں، آہوں اور کراہوں میں بدل گئیں،

ایک ماتم برپا ہو گیا، پورا حرم امڈ آیا۔ اذانِ عشاء نے سلسلہ تقریر منقطع کرنے پر مجبور کر دیا۔ نماز کھڑی ہو گئی لیکن میرے یمین و یسار سسکیاں گونجتی رہیں۔ ادھر سلام پھرا، ادھر لوگ پل پڑے، عربوں کے ہاں اظہارِ محبت کے لیے ماتھے کو چومتے اور ناک پر بوسے دیتے ہیں۔ آدھ گھنٹے تک نشانۂ ستم بنا رہا۔ کچھ بھیڑ چھٹی تو ایک انتہائی خوبصورت اور وجیہ عرب چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی رکھے، دو جوانوں کے سہارے آگے بڑھا۔ میں

نے دیکھا کہ اس کے جسم پر فالج کا اثر ہے۔ اس نے آتے ہی میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، پوچھا:

کہاں سے ہو؟

میں نے جواب دیا...... پاکستان سے۔

پاکستان سے؟ انہوں نے حیرت واستعجاب سے دہرایا۔

جی ہاں۔ میں نے جواب دیا۔

مجھے اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے بولے۔

''پاکستانی ایسے ہی باکمال ہوتے ہیں۔ جوان! لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں عالم عرب کا سب سے بڑا خطیب ہوں لیکن میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی بڑے خطیب ہو۔''

یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ کی عمر بمشکل ۲۵ برس تھی اور ابھی آپ میدان خطابت کے باقاعدہ شہسوار نہ تھے۔ اسی مسجد نبوی میں آپ نے ایک بار پھر اپنی شعلہ بیانی اور سحر افشانی کا مظاہرہ کیا کہ جب یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور مسجد نبوی کی روشنیاں گل کر دی گئیں اور اندھیرے میں نماز ادا کی گئیں۔ آپ نے سفر حجاز میں اس کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے:

''اس روز پہلی مرتبہ حرم نبوی کے مینار روشنی کے چراغوں سے محروم رہے۔ بتیاں گل کر دی گئیں اور اندھیرے میں نماز مغرب، عشاء اور فجر ادا کی گئیں۔ اللہ! یہ دن بھی آنا تھا۔ میرے دل سے ہوک نکلی اور میں نماز فجر کے بعد روضۂ اطہر کے پڑوس میں دل کے داغ نمایاں کرنے لگا۔

''کبھی دنیا مدینے سے آنے والے قافلوں کے قدموں کے چاپ سنا کرتی تھی اور آج ہم مدینے کے راستوں پر یہودیوں کی یلغار کی خبریں سن رہے

ہیں۔ تب ہم اسلام کے صحیح معنوں میں علم بردار اور گنبد خضراء کے مکین کے حقیقتاً پیروکار تھے اور آج اسلام کو ہم نے چھوڑ دیا اور رحمت ونصرتِ رب ہم سے منہ موڑ گئی۔''

''اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گریباں پھٹ گئے، دامن چاک ہو گئے اور حرم نبوی ''الجہاد الجہاد'' کے نعروں سے گونجنے لگا۔ ادھر میں یونیورسٹی پہنچا، ادھر سعودی سی آئی ڈی کا نمائندہ حکم سرکار لیے آ گیا کہ اس پاکستانی طالب علم کو آئندہ حرم نبوی یا کسی دوسرے مقام پر جنگ کے موضوع پر تقریر کی اجازت نہیں جو جذبات سے کھیلتا، شعلے اگلتا اور آگ برساتا ہے۔''

نمازِ عید کا پہلا خطبہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اخلاقی اقدار قدرے زندہ تھیں، لوگ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، نماز عید عموماً شہر سے باہر کھلے میدان میں ادا کی جاتی تھی، نماز عید کے خطبے رائے عامہ ہموار کرتے تھے۔ اقبال پارک میں مولانا داؤد غزنوی نماز عید پڑھاتے۔ اخلاقی اقدار کی تازگی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ دیوبندی مسلک کی لاہور میں ایک بے حد قابل احترام شخصیت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی اقتداء میں نماز عید ادا کرتے۔ یقیناً ان کے خیال میں اہل حدیث کی اقتداء میں ان کی نماز بھی ہو جاتی ہوگی، جو وہ یہ عمل کرتے تھے۔

تب روایت تھی کہ چینیاں والی مسجد کا خطیب ہی منٹو پارک میں نماز عید کے فرائض سرانجام دیتا۔ ایوب خان کا آخری دور تھا، اس کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔ نوجوان خطیب نوآموز تھا۔ انتظامیہ اور شہر کی صف اول کی سیاسی قیادت نوجوان احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے پاس آ گئی اور کہنے لگی کہ نماز عید کا خطبہ کسی قد آور اور تجربہ کار شخصیت کے حوالے کر دیں تا کہ ایوبی آمریت پر کاری ضرب لگ سکے۔ نوجوان احسان الٰہی نے

پر اعتماد نظروں سے سب کو دیکھا اور کہا:

''آپ بے فکر ہو کر جائیں، آپ لوگوں کو شرمندگی نہیں ہو گی۔''

ایسا ہی ہوا۔ عید کا خطبہ شروع ہوا۔ جواں سال خطیب ایوبی آمریت کو للکار رہا تھا، کسی بانکے سجیلے ملاح کی طرح خطابت کے دریا کی سرکش موجوں سے کھیلتا ہوا کشتی چلائے جا رہا تھا۔ عوام سید داؤد غزنوی کے منبر پر اس کے حقیقی وارث کی جرأتوں کے نظارے دیکھ رہے تھے۔

نماز عید ختم ہوئی تو اس دور کے سب سے بڑے خطیب شورش کاشمیری آگے بڑھتے ہیں، میاں عبدالعزیز ؟؟؟ ان کے ساتھ ہوتے ہیں، اور علامہ احسان الٰہی ظہیر کا بازو تھام کر کہتے ہیں کہ

''احسان صاحب! آج کے بعد آپ تقریر نہ بھی کریں تو یہ آج کی تقریر آپ کو ہمیشہ کے لیے برصغیر کے بڑے خطیبوں میں شامل کر گئی ہے۔''

دل کے داغ، جو زبان پہ آ گئے

لگ بھگ ۱۹۸۲ء کی بات ہو گی۔ اپنے والد محترم کی ذاتی لائبریری میں ترجمان الحدیث ۱۹۷۱ء کا ایک شمارہ دیکھا جس میں شہید علامہ احسان الٰہی ظہیر کی ایک تقریر شائع ہوئی تھی۔ یہ سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد کا خطبہ جمعہ تھا۔ ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ دل پڑھ کر تڑپ کر رہ گیا۔

شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ اس تقریر کو سننا چاہیے۔ میرے تایا زاد بھائی عبدالحمید شاکر کہ جنھوں نے علامہ شہید کی تقاریر کا بیشتر ریکارڈ اکٹھا کیا اور محفوظ بھی کیا ہے اور پھر یوں سمجھیں کہ ہم ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ میری بڑی ہمشیرہ اس معاملے میں پیش پیش تھیں۔ لمبی تگ ودو کے بعد وہ تقریر دستیاب ہو سکی۔

میں سمجھتا ہوں خطابت کی شاہ کار یہ تقریر آج اگر دستیاب ہے تو اس کے لیے

علامہ شہید کے تمام چاہنے والے عبدالمجید شاکر کے احسان مند ہیں اور علامہ شہید کی جو چند ویڈیوز دستیاب ہیں، وہ بھی شاکر صاحب ان کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ جو احباب آج ''یوٹیوب'' پہ گاہے گاہے علامہ شہید کی تقاریر سن لیتے ہیں، وہ ہمارے بھائی اور علامہ شہید کے جاں نثار عبدالمجید شاکر کو دعائیں دیں۔

یہ ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگ اس دور میں کی گئی جب اس کا ذوق تھا نہ شعور۔ شاکر صاحب نے علامہ شہید کا آڈیو ریکارڈ غایت محنت سے اکٹھا کیا۔ اس کے لیے سفر کیے۔ پھر انہیں ایک روز ویڈیو کا خیال آیا تب یہ ہمارے ہاں ایک شجر ممنوعہ بلکہ ''حرام کام'' تھا۔ علامہ شہید کی پہلی ویڈیو جو بنائی گئی، وہ بیگم کوٹ کے پہلے جلسے کی تھی۔ جب ویڈیو بننا شروع ہوئی تو لوگوں کے لیے یہ حیرت ناک بات تھی۔ مزید یہ کہ حافظ عبداللہ شیخوپوری مرحوم نے اس پر ناگوار سا تبصرہ کر دیا۔ لوگوں کو مزید شہہ مل گئی۔ مسئلہ نہی عن المنکر کا ہو، بعض علماء لوگوں کو انگیخت بھی کر رہے ہوں اور سامعین بھی وہابی ہوں تو پھر جو بھی ہو گا کم ہی ہو گا۔ وہ بے چارہ ویڈیو والا گالیاں سنتا دھکے کھاتا ہو، بھی ویڈیو بناتا گیا۔ آپ دیکھیں گے اس پہلی ویڈیو میں کبھی کبھی کیمرہ خطیب کی بجائے پنڈال کی چھت کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ یہ اصل میں وہ دھکا ہوتا ہے جو ویڈیو کے کسی مخالف کی طرف سے کیمرہ مین کو پڑتا ہے۔ سو ان حالات میں عبدالمجید شاکر نے حضرت علامہ کی ویڈیوز بنائیں۔

پھر ایک روز وہ علامہ شہید سے ''فرمائش کنندہ'' ہوئے کہ آپ کے جمعہ کی ویڈیو بنانی ہے۔ ''یار عبدالمجید لوگ غصہ کریں گے۔'' علامہ شہید نے جواب دیا۔ لیکن وہ بضد رہے اپنے دلائل دیتے رہے کہ حرم میں بھی ویڈیو بنتی ہے یہ لوگ وہاں جا کر تو خاموش رہتے ہیں۔ ان کی ضد دیکھ کر علامہ شہید نے اجازت دے دی۔ اب ویڈیو بنتی دیکھ کر لوگ چیں بجبیں ہونا شروع ہوئے۔ ادھر خطبہ شروع ہوا، ادھر یہ

''بھنبھناہٹ'' بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ علامہ شہید کو کہنا پڑا ''جو کچھ کرتا ہے، کرنے دیں۔ آپ لوگ آرام سے بیٹھیں۔'' تب مجمع پرسکون ہو گیا۔ یہ چند الفاظ بھی آپ کی خطابت کے خوبصورت لہجے کا کمال تھے۔ حتیٰ کہ جمعہ بھی مکمل ہو گیا اور ویڈیو بھی۔ پھر وہ دن بھی دیکھے ہیں کہ اس ویڈیو کے بنانے پر اعتراض کرنے والے لوگ وہی ویڈیو دیکھ کر زار و قطار روتے تھے......ع

کتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

ویسے یہ ویڈیو اور تصویر کا معاملہ بہت زیادہ قابل غور ہے۔

جن دنوں علامہ شہید پاکستانی سیاست میں چھائے ہوئے تھے، لاہور کے ایک بزرگ عالم دین جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، اخبارات میں ان کی تصاویر دیکھ کر فتوے جاری کرتے۔ پھر میں نے ایک روز ان بزرگ کی خوبصورت تصویر اخبار کے رنگین صفحے کی زینت بنی دیکھی۔ جب فتووں کا مدار افراد کی محبت اور مخاصمت پر ہو اور معاملات اعتدال سے ہٹے ہوئے ہوں تو اس طرح ہی ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہماری ایک جہادی تنظیم کو جب اپنے آغاز میں ''ایشوز'' کی ضرورت تھی تو اس نے بھی تصاویر پر فتوے بازی شروع کر دی۔ ''جمہوریت کفر کفر'' کی آسمان شکن آوازیں بلند کرنا شروع کر دیں۔ ٹی وی کو ''بدمعاش'' قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ ٹی وی شیطان تڑوانے کی مہم شروع کروا دی گئی۔ اسی جماعت کے نمائندہ ''پرچے'' میں ہر مہینے اس انداز کی خبریں ہوتی تھیں کہ ''اس ماہ الحمد للہ 20 ٹی وی بدمعاش توڑ دیے گئے۔'' اس مہم میں کئی لطیفے بھی پیش آئے۔ میرے مکتبے میں ایک صاحب کام کرتے تھے۔ نام ان کا منیر احمد تھا۔ بہت نیک اور سادہ طبیعت تھے۔ منڈی وار برٹن سے ان کا تعلق تھا۔ ایک روز رات کے بارہ بجے پیدل شہر سے باہر کی طرف جا رہے تھے۔ دفعتاً پولیس کی گاڑی ان کے پاس رکی۔ پوچھا گیا:

''مولوی! رات گئے تم اکیلے کہاں جا رہے ہو؟''

مولوی منیر نے کہا ''میں نے ایک شیطان کو قتل کر دیا ہے۔''

پولیس والے ایک دم ہوشیار ہو گئے۔ اسلحہ تان لیا۔

''مولوی کس کو قتل کر کے آئے ہو؟'' بدلے لہجے میں پوچھا گیا۔

میرے گھر میں ایک بدمعاش تھا، اس کو قتل کر کے آیا ہوں۔ پولیس والوں نے مولوی منیر کو گاڑی میں بٹھایا اور جائے وقوعہ لے گئے۔ جہاں ٹی وی شیطان کی ''لاش'' پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد مولوی منیر سے اس کے باپ نے کیا سلوک کیا، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ بہر حال ایک دم ماحول بدل گیا۔ تنا ہوا اسلحہ جھک گیا۔ جب کبھی مولوی منیر کا یہ واقعہ ہمارے مکتبہ پر دہرایا جاتا ہے، محفل کشت زعفران بن جاتی ہے۔

بات علامہ کی سقوط ڈھاکہ کی تقریر سے چلی تھی اور کہاں کی کہاں جا نکلی۔ واپس 1971ء کے اسی خطبہ جمعہ کی طرف آتے ہیں۔ یہ تقریر اس قدر شان دار ہے کہ جب مرحوم جاوید جمال ڈسکوی نے علامہ شہید رحمہ اللہ پر کتاب لکھی تو آپ کی خطابت کے نمونہ کے طور پر اس کو کتاب میں شامل کیا۔ یہ افواج پاکستان کے چیف جنرل یحییٰ خان کے دور حکومت کا خطبہ تھا اور سقوط ڈھاکہ کے بعد کا پہلا جمعہ تھا۔

نکلتی ہے جو بات دل سے اثر رکھتی ہے

کے مصداق تقریر کا ہر لفظ دل کو چیر رہا تھا۔ چینیاں والی مسجد، لوگوں کی سسکیوں سے شام غریباں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ سامعین سارے کے سارے رو رہے تھے، خود علامہ شہید رحمہ اللہ مسلسل رو رہے تھے، آپ کہہ رہے تھے:

......آج ہماری اٹھی ہوئی گردنیں جھک گئی ہیں۔

......آج ہمارے تنے ہوئے سینے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔

......آج ہماری آوازیں کجلا گئی ہیں۔

......آج ہماری روحیں مرجھا گئی ہیں۔

......آج ہمارے دل بیٹھ گئے ہیں۔

......آج ہمارے اعصاب ٹوٹ گئے ہیں۔

......آج ہمارے جسم چھلنی ہو گئے۔

......آج ہمارے دل زخمی ہو گئے۔

......آج ہمارے جگر پھٹ کر رہ گئے ہیں۔

آج صبح ہم پہ جو گزری ہے نہ آسمان اس کو جان سکتا ہے نہ زمین اس کو محسوس کر سکتی ہے۔

کعبے کے رب کی قسم! میرا ایک بچہ ہے [1] اگر وہ مر جاتا، کٹ جاتا مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ آج ہم کیوں زندہ ہیں؟ کاش! آج سے پہلے ہم مر گئے ہوتے۔''

اج میں ای اللہ وسایا آں

ان کی خطابت محض خشک وعظ ہی نہ ہوتا تھا بلکہ وہ حاضرین کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ گاہے چٹکلے بھی ہوتے۔ ہلکا پھلکا مذاق بھی چلتا رہتا۔

جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ (لاہور) میں جمعیت علمائے اسلام کا غالباً مرکزی جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں حضرت علامہ شہید خاص مقرر ہوا کرتے تھے۔ تب اتنا تعصب نہ ہوا کرتا تھا۔ دیوبندی حضرات علامہ شہید کا بہت احترام کرتے۔ علامہ بھی ان کے جلسہ میں ضرور چلے آتے۔ آخری بار جب گئے تب سردی کے دن تھے۔ آپ کو تیز بخار تھا لیکن پھر بھی تشریف لے گئے۔ آپ نے سفید فر کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ آپ کی طبیعت خراب تھی اور چاہ رہے تھے کہ تقریر جلد ہو جائے مگر میزبان جانتے تھے کہ اگر علامہ احسان الٰہی ظہیر کی تقریر پہلے کروا دی گئی تو پھر چراغوں میں روشنی نہ رہے گی اور دوسرے مقررین کے لیے کون بیٹھے گا۔

[1] حافظ ابتسام الٰہی ظہیر، جو کہ تین بیٹیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

ادھر آپ کی طبیعت اس قدر خراب تھی کہ بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس اثناء میں اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب آپ کے سامنے مولانا اللہ وسایا خطاب کریں گے۔ یہ سننا تھا کہ علامہ شہید آگے بڑھے اور مولانا اللہ وسایا کو پرے کر کے مائیک پکڑ لیا اور یہ کہہ کر تقریر شروع کر دی "اج میں ای اللہ وسایا آں۔"

سارا مجمع کشت زعفران بن گیا۔

ایک یادگار تقریر

حضرت علامہ کی ایک یادگار تقریر وہ بھی تھی جو مولانا محمد حسین شیخوپوری کی مسجد میں آپ نے کی تھی۔ مولانا شیخوپوری علامہ شہید کی جماعت کو چھوڑ چکے تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد مولانا کو قربت کا خیال آیا اور انہوں نے علامہ شہید کو اپنی مسجد میں پہلے سے طے شدہ ایک جلسے میں بلا لیا۔ حالانکہ جلسے کے اشتہار میں بھی علامہ شہید کا نام نہیں تھا اور نہ ااپ پہلے سے مدعو تھے۔ یہ تو حضرت شیخوپوری نے آپ کو اچانک دعوت دی۔ جانے سے پہلے ہمارے گھر آئے۔ والد محترم سے کچھ صلاح مشورہ کیا۔ طے پایا کہ مولانا کی دعوت پر ضرور جانا چاہیے۔

میرے والد کا ویسے بھی مولانا شیخوپوری کے بارے میں ہمیشہ نرم گوشہ اور محبت کا تعلق رہا۔ اس حد تک کہ جب مولانا شیخوپوری نے علامہ شہید کو بہت نامناسب وقت پر چھوڑ دیا تو ہر کارکن سخت غصے میں تھا۔ ایک روز میں نے اپنے والد کے سامنے کچھ سخت الفاظ کہہ دیئے۔ میرے والد نے بہت برے طریقے سے مجھے ڈانٹا، اتنا کہ شاید پہلے کبھی ایسے نہیں ڈانٹا تھا۔ اللہ رب العزت مجھے معاف کرے اور مولانا شیخوپوری رحمہ اللہ پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

بہرحال حضرت علامہ شیخوپورہ کے لیے عازم سفر ہوئے، میں بھی آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس روز آپ نے کمال تقریر کی۔ میں نے آپ کی اس سے عمدہ

تقریر نہیں سنی۔ وہاں ہر شخص جو موجود تھا، آپ کی خطابت کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔ پیچھے بیٹھے مولانا محمد حسین شیخوپوری بے اختیار ''عجیب ...... کمال ہے'' کے الفاظ بول رہے تھے۔ آپ نے تقریر ختم کی تو ہر بندہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا۔ جب واپسی کے لیے گاڑی کی طرف نکلے تو علامہ شہید نے مجھ سے پوچھا ''سناؤ ٹھیک ہو گئی آج تقریر؟''

تب ہمیں ایسی ''گاڑھی'' اردو کہاں آتی تھی۔ بے اختیار جواب دیا ''آج تو آپ نے کمال لفاظی سے کام لیا'' آپ مسکرا دیئے اور گہری نگاہوں سے عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا۔ کچھ دن بعد ''لفاظی'' کا صحیح مفہوم سمجھ آیا تو ان کی مسکراہٹ بھی سمجھ میں آتی گئی۔ کیا خوبصورت شخصیت تھی ان کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائیں۔

دل کی دنیا بدلتی ہے

ان کی شخصیت کے سحر اور خطابت کی اثر آفرینی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک روز میں اپنے دفتر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ وہ ملتان سے تعلق رکھتے تھے۔ باتوں باتوں میں علامہ شہید کا ذکر چل نکلا۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ کیا کہ خاندانی اہل حدیث نہیں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیسے اہل حدیث ہوئے؟ وہ کہنے لگے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کی ملتان کی تقریر سن کر اہل حدیث ہوا۔ میں مسکرا دیا اور قدرے حیرانی سے پوچھا کہ اس تقریر میں ایسی کیا خاص بات تھی، بلکہ وہ تو خالصتاً سیاسی تقریر تھی جس میں علامہ صاحب نے جنرل ضیاء الحق کی حکومت پر شدید تنقید کی تھی۔

اور یہ بات بھی یاد رہے کہ علامہ شہید کا مزاج نہ تھا کہ اپنے ہم مسلک مخالفین پر تنقید کریں بلکہ وہ ان کا ذکر کرنا بھی پسند نہ کرتے کہ اپنی سیاسی موت مر رہے ہیں، مرتے رہیں گے۔ لیکن ملتان کے اس جلسہ عام کے انعقاد میں ان حاسدین نے بہت زیادہ رکاوٹیں کھڑی کی تھیں اس وجہ سے علامہ شہید اس دن بہت دکھی تھے۔ قصہ مختصر

میں نے اسی پس منظر میں ان صاحب سے پوچھا کہ حضرت ذرا بتایئے تو کیا بات خاص نظر آئی آپ کو اس تقریر میں کہ آپ سارے کے سارے ہی وہابی ہو گئے؟ ان صاحب کا جواب آپ بھی سنیے اور لطف اٹھایئے۔ کہنے لگے:

''میں ملتان میں جمعیت اہل حدیث کا جلسہ سننے چلا گیا۔ وہاں علامہ احسان الٰہی ظہیر کی تقریر سنی۔ ان کا لب ولہجہ دل میں اترتا چلا گیا۔ میں گھر آ کر دیر تک سوچتا رہا کہ یہ لہجہ بہادری کا استعارہ ہی نہیں بلکہ ایک سچے انسان کی آواز بھی ہے۔ اور جو بندہ سچا ہوتا ہے اس کا مسلک کیسے جھوٹ ہو سکتا ہے۔ دل کی دنیا بدلنی تھی سو بہانہ بن گیا۔ میں نے مسلک اہل حدیث کے بارے میں تحقیق شروع کر دی اور حق کو پا لیا۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ میں علامہ شہید کی ملتان کی تقریر سن کر اہل حدیث ہوا۔''

آپ کی خطابت کی سحر آفرین کی ایک دنیا اسیر ہوئی خطابت کیا تھی، ایک جادو تھا، فسوں تھا جو سننے والوں پر پھونکا جاتا تھا۔ آپ بلند آہنگ خطیب تھے۔ پورے جوش سے بات کرتے۔ الفاظ اپنے اپنے مقام پر موتیوں کی طرح اس طور آتے جیسے کسی جڑاؤ کنگن میں ہوں۔ ہر ایک اپنی جگہ الگ آب وتاب کے ساتھ۔

اور وہ بھی احسان الٰہی ظہیر کے ہوتے ہوئے

اپنے مسلک کی غیرت کا شاہکار آپ کا وہ خطاب بھی تھا، جب آپ ختم نبوت کانفرنس میں گئے۔ یہ کانفرنس گوجرانوالہ میں منعقد ہوئی جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء جمع تھے۔ یہ فطری امر ہے کہ ہر بندہ اپنے نقطہ نظر کا محافظ ہوتا ہے۔ اپنے عقیدے اور بزرگوں کے محاسن بیان کرنے کی سعی میں ہوتا ہے۔ اس روز بھی ایسے ہی ہوا۔ جب آپ پنڈال میں داخل ہوئے (مولانا) لقمان علی پوری خطاب کر رہے تھے۔ جن کا تعلق مسلک دیوبند سے تھا۔ مجمع میں دیوبندی اور اہل حدیث کافی تعداد میں موجود تھے۔ جبکہ دوسرے مکاتب فکر کے لوگ بھی موجود تھے۔ اب (مولانا) لقمان علی پوری

صاحب نے تحریک ختم نبوت کی جدوجہد کو صرف اپنے بزرگوں کے ''کھاتے'' میں ڈالنا شروع کیا ہوا تھا، مگر آپ کے پنڈال میں داخل ہونے کے بعد مولانا کا لب ولہجہ تبدیل ہو چکا تھا۔ پھر بھی معاملہ کچھ کچھ آپ کی سمجھ میں گیا تھا۔ جب آپ اسٹیج پر تشریف فرما ہوئے تو اہل حدیث پر جوش ہونا شروع ہو گئے۔ مولانا لقمان علی کی جارحانہ تقریر کے سبب جو چہرے کمہلائے ہوئے تھے، نسبتاً کھل اٹھے۔ مولانا یوسف احرار جو معروف اہل حدیث شاعر تھے، نے علامہ کو جا کر ایک رقعہ دیا، جس میں سارا معاملہ لکھا اور فرمائش کی کہ اس بات کا جواب ادھر ہی دیا جائے یعنی قصہ زمین برسر زمین...... کچھ یہ بات بھی تھی کہ علامہ پہلے ہی مولوی صاحب کی تقریر کے آخری حصے کو سن کر غصے میں آ چکے تھے۔ مزید کام اس رقعہ نے کر دیا۔ آپ مائیک پر آئے، واسکٹ پہنی ہوئی تھی جس کو اتارتے ہوئے بنا دیکھے پیچھے پھینکا، آستینیں چڑھا لیں، بہت مختصر خطبہ پڑھا اور تقریر کا آغاز کیا۔ آپ کا خطاب کیا تھا...... اک شیر کی آمد تھی، ایک شیر للکار رہا تھا۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

سلام ثناء اللہ امرتسری! تیری عظمت کو سلام

سلام میر سیالکوٹی! تیری محنت کو سلام

سلام محمد حسین بٹالوی! تیرے علم کو سلام

سلام احمد دین گکھڑوی! تیرے مقام کو سلام

غرض یہ کہ اپنے بزرگوں کی عظمت کے تذکرے کرتے ہوئے تقریر کا آغاز کیا، کہنے لگے:

''جلسہ کرتے ہو ختم نبوت کا مشترکہ اور بات کرتے ہو اپنے اپنے مسلک کی اور وہ بھی احسان الٰہی ظہیر کے ہوتے ہوئے۔''

سارا مجمع خطابت کے سحر میں جکڑا جا چکا تھا اور اسٹیج پر بیٹھے علماء آپ کے غصے اور

جوش و جذبے پر، ساکت و جامد تھے اور حاضرین میں موجود اہل حدیث جو دبکے پڑے تھے، اب جیسے زندہ ہو گئے اور نعرے لگا رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے:

''آج میں بتا کر جاؤں گا کہ ختم نبوت پر سب سے پہلا ڈاکہ کس نے ڈالا۔ تم لوگ تھے جنہوں نے نبی کی بات کو چھوڑ کر غیر نبی کی بات کو اختیار کیا۔''

اسٹیج پر سارے مسالک کے علماء بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنا چہرہ پچھلی طرف پھیرا تو مختار احمد گجراتی پر نظر پڑی جو بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، ان کی طرف اشارہ کیا:

''ایک یہ قبروں کے پجاری بیٹھے ہوئے ہیں۔''

ساتھ ہی شیعہ مسلک کے علامہ ع غ کراروی بیٹھے ہوئے تھے۔ کراچی سے تعلق تھا علامہ سے بھی کافی بے تکلفی تھی لیکن اس روز سب روا تھا، ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اور یہ بھی آئے ہیں گھوڑوں کے پجاری، ختم نبوت کانفرنس میں۔''

کسی میں جرات نہ تھی کہ اس روز احسان الٰہی ظہیر کو روکتا یا ٹوکتا۔ وہ بانکا سجیلا جوان جیسے طوفان میں کشتی چلا رہا، اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ آپ نے تقریر ختم کی، مجمع اکھڑ گیا، نہ کسی نے اس کے بعد ٹھہرنا چاہا نہ جواز تھا کہ ؏

اک طلوع آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد چراغوں کو کون پوچھتا ہے۔ ہاں ایک سوال آج بھی ہے کہ آج کوئی مولوی لقمان علی جسارت کرے تو شیخ الاسلام حضرت امرتسری رحمہ اللہ اور مولائے میر رحمہ اللہ کا دفاع کون کرے گا؟ میرے پاس تو اس کا کوئی جواب نہیں۔ شاید کسی اور کے پاس ہو۔

علامہ شہید کی خطابت کے ساتھ ایک مسئلہ میزبانوں کے لیے بھی پیدا ہو جاتا تھا

کہ اگر آپ کی تقریر پہلے ہو جاتی تو اس کے بعد" چراغوں میں روشنی نہ رہتی۔" نہ مزید کسی مقرر کے لیے تقریر کی گنجائش رہتی، نہ عوام سننے کے لیے تیار ہوتے۔ اہل حدیث کے ہاں تو یہ طے شدہ کلیہ تھا کہ آپ آخری مقرر ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب مشترکہ جلسے ہوتے تو اپنے زعم کے ہاتھوں بعض لوگ مارے جاتے۔ جیسے اس روز کھیالی دروازے (گوجرانوالہ) میں ہوا۔ مشترکہ جلسہ تھا جس کا عنوان تھا "عظمت صحابہ و اہل بیت کانفرنس۔" سارے اہل سنت مکاتب فکر کے علماء اس میں شریک ہوئے۔ جلسہ گاہ کے پہلو میں شیعہ کی امام بارگاہ تھی جس کی وجہ سے ماحول ذرا مقابلے بازی کا ہو جاتا تھا۔ شیعہ کے حوالے سے آپ کی تقریر کے بعد کسی اور کا خطاب تو دور کی بات، گفتگو کی بھی گنجائش کہاں رہتی۔ میزبان سے تکنیکی غلطی ہو گئی کہ اس نے آپ کی تقریر چند مقررین سے پہلے کروا لی۔ آپ نے خطاب کیا۔ اپنا کوٹ اٹھایا اور دکان بڑھا گئے۔ اب آپ کے بعد بریلوی مسلک کے معروف خطیب شبیر شاہ حافظ آبادی کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ علامہ کیا گئے ساتھ میں ساری رونق بھی ساتھ لے گئے۔ مجمع اکھڑ چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شبیر شاہ حافظ آبادی کا ان دنوں طوطی بولتا تھا۔ لہک لہک کر ترنم بھرے انداز میں بلکہ "ملکہ ترنم" سے کچھ بڑھے ہوئے انداز میں یہ صاحب خطاب کرتے۔ واقعہ کربلا جب بیان کرتے...... اگرچہ ان کا سہارا زمانے بھر کی موضوع اور منکر روایات ہی ہوتیں، لیکن آنکھ نم ہو ہی جاتی تھی۔ مگر اس روز اکھڑا مجمع دیکھ کر شبیر حافظ آبادی نہ رہ سکے:

"اک وہابی تقریر کر کے گیا اے تے سارے چلے گئے" آج کے بعد میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔

ایسا ہی ایک واقعہ شیخوپورہ میں بھی ہوا۔ ایک مولوی صاحب ہوتے تھے جن کا اصل نام غالباً فقیر سلطانی تھا البتہ ان کا عرفی نام مولوی فرشتہ تھا، جس سے وہ معروف

تھے۔ بریلوی عقیدے کے حامل تھے اور علامہ کے عقیدت مند۔ انہوں نے جلسہ کیا جس میں علامہ کو بھی بلایا اور اپنے مسلک کے بڑے عالم (مولانا) عبدالستار خان نیازی کو بھی بلایا۔ اب فرط محبت اور جوش عقیدت میں نیازی صاحب سے پہلے علامہ کا خطاب کروا دیا۔ علامہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موضوع پر تقریر کی۔ اس موضوع پر اس سے بہتر خطاب شاید آپ کو سننے کو نہ ملے۔ بہرحال علامہ کے بعد لوگوں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ عبدالستار خان نیازی علامہ سے بھی اچھا تعلق رکھتے تھے اور زمانے کے سرد وگرم چشیدہ تھے۔ انہوں نے بکھرتے اکھڑتے مجمعے سے خطاب کی ضد نہیں کی اور دعا شروع کر دی کہ عافیت کا راستہ یہی تھا۔ البتہ اتنا ضرور کہا کہ ''ظہیر صاحب نے تقریر تو بہت عمدہ کی ہے لیکن عقیدہ اپنا اپنا۔''

آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس مینار پاکستان

میری یادوں کے دھندلے سایوں میں 1978ء میں ہونے والی آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس بھی ہے۔ یہ کانفرنس 12، 13 اور 14 اپریل کو مینار پاکستان کے وسیع میدان میں منعقد ہوئی۔ اس میں مکتبہ قدوسیہ کا اسٹال بھی لگا تھا۔ اس سہ روزہ کانفرنس کا تیسرا دن اچھا نہیں تھا۔ خاص طور پر کاروباری لحاظ سے۔ ہوتا یہ ہے کہ شرکاء کتابیں پسند کرتے رہتے ہیں اور ان کا ارادہ ہوتا ہے کہ آخری روز واپسی کے سفر سے پہلے کتب خرید لیں گے اور اس طرح وقت سے پہلے غیر ضروری بوجھ سے بچ جائیں گے۔ لیکن تیسرے روز اس زور کا طوفان آیا کہ سارے ارادے اس کی نذر ہو گئے۔ کانفرنس خراب ہو گئی اور بے وقت اسٹال بند کرنا پڑے۔ جبکہ آخری نشست بادشاہی مسجد میں منعقد ہوئی دھندلا سا یہ منظر میری یاد میں محفوظ تھا کہ میرا بچپن تھا۔ لیکن جب یہ سارا کچھ لکھنے بیٹھا تو قاضی عبدالقدیر خاموش نے اس طوفان کے حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ کانفرنس طے ہوئی تو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے عہدے داران اور علامہ

احسان الٰہی ظہیر کے درمیان تعلقات خوش گوار نہیں تھے۔ وہ ہی آج والا المیہ کہ ؎

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا

سو ان ناخوش گوار تعلقات کے پیش نظر ان لوگوں نے اس کانفرنس میں علامہ کو نہ بلانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ ان کے اس فیصلے کی بھنک چوہدری محمد صادق مرحوم ایڈووکیٹ کے کانوں میں پڑی جو زمانے کے گرم و سرد چشیدہ تھے۔ انہوں نے مرکزی جمعیت کی قیادت کو مشورہ دیا اور سمجھایا کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر کو بلا لو ورنہ بدنام ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد تو وہی اقتدار کے محلات کی غلام گردشوں میں پنپنے والی کہانیاں ہوتی ہیں جن میں کردار بدل جاتے ہیں اور سب کچھ ویسے ہی رہتا ہے۔ پس پردہ جو کچھ بھی ہوا، فیصلہ یہ ہی ہوا کہ علامہ کو بلایا جائے لیکن چالاکی یہ کی گئی کہ علامہ کی تقریر دوسرے دن رکھی گئی، مقصد اہمیت کم کرنا تھا۔ لیکن اصل فیصلے تو اوپر ہوتے ہیں۔ علامہ نے تاریخی تقریر کی۔ ان دنوں جنرل ضیاء الحق کے دورِ آمریت کا آغاز تھا۔ مجلس شوریٰ کی تشکیل اور اس طرح کے دیگر معاملات چل رہے تھے۔ ''جنرل'' اہل حدیث برادری کو کوئی زیادہ ''لفٹ'' نہیں کروا رہا تھا اور اِدھر سے ''دے جا سخیا راہ مولا'' والا رویہ تھا۔ ایسے میں علامہ نے اہل حدیث کی غیرت والی تاریخ کو اجاگر کیا۔

اسی تقریر میں آپ نے یہ تاریخی جملہ بولا کہ ''حقوق مانگے نہیں جاتے حقوق چھینے جاتے ہیں۔''

قاضی عبدالقدیر خاموش بتاتے ہیں کہ ANP کے مرحوم سیاست دان اور اہل حدیث خانوادے کے چشم و چراغ فاروق قریشی مرحوم کا تبصرہ آپ کی تقریر کے حوالے سے بہت ہی معنیٰ خیز تھا۔ انہوں نے کہا ''اگر احسان الٰہی ظہیر کی تقریر نہ ہوتی تو سب نے یہ ہی سمجھنا تھا کہ یہ کانفرنس G.H.Q نے کروائی ہے۔''

علامہ کی تقریر ہی اس کانفرنس کا حاصل تھا اور ان کی تقریر کے بعد حسب توقع میلہ

اجڑ گیا۔ اب جن لوگوں نے ارادہ کیا تھا کہ علامہ کی تقریر دوسرے روز کروا کر اس کی اہمیت بھی کم کر دی جائے اور آخری روز ان کا ذکر تک نہ ہو، ان کا یہ حال تھا کہ تیسرے روز طوفان نے سارے "تنبو، قناتیں" فارغ کروا دیں۔ ؏

آئی برسات تو برسات نے دل توڑ دیا

اللہ رب العزت کا فرمانا ہے: وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ سو اس روز کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کے علاوہ علامہ کی باغیانہ تقریر نے جنرل ضیاء الحق کی محبت و تعریف والی تقاریر کا اثر بھی زائل کر دیا۔ اندازہ کیجیے اس طرح کا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ ایک بڑے خطیب نے اپنی تقریر میں قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی کہ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا٥ اور جاء الحق سے استدلال یہ لیا کہ ضیاء الحق آ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

دھرتی ہل دی نظر آئی سی

علامہ کے نقوش قدم اور یادیں ہر سو بکھری پڑی ہیں۔ چند روز پہلے دار المسافر جدہ کے مدیر "عمر الفاروق" میرے پاس تشریف لائے۔ علامہ شہید اور برادرم عمر الفاروق کے والد حافظ محمد دین مرحوم کا بے حد قریبی بلکہ قلبی تعلق تھا۔ حافظ محمد دین اس گاؤں میں مولانا محمد صدیق رحمہ اللہ کی ہدایت پر تشریف لائے۔ وہاں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور اس کا نتیجہ ہے کہ آج اس گاؤں کا نام ہی اہل حدیثاں والا ہے۔ حافظ صاحب نے ایک بار علامہ شہید سے جلسے کا وقت لیا اور شاندار انداز میں تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کے استقبال کے لیے راستے کے دونوں طرف ڈیڑھ دو میل تک کیلے کے درخت لگائے۔ وسیع پنڈال سجایا گیا اور علامہ آ ہی نہ سکے۔ سب کے لیے صدمے کا مقام تھا اور ویسے بھی وعدہ کر کے نہ آنا علامہ کے مزاج کے خلاف تھا۔ عمر فاروق بتاتے ہیں کہ ایک بزرگ تو زیادہ ہی ناراض تھے کہ "بڑا اپنا علامہ لیے پھرتے ہو۔" اگلے سال پھر علامہ کا

آنا طے ہوا۔ اس بار علامہ آئے۔ جلسے سے پہلے آپ کو گھر میں ٹھہرایا گیا۔ جہاں آپ کی مہمان نوازی اور خدمت جاری تھی کہ آپ کو بتایا گیا کہ باہر خالد رانجھا ایڈووکیٹ آئے ہیں۔ آپ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ بعد میں یہ خالد رانجھا وزیر قانون بھی رہے اور بعض مقدمات میں علامہ کے وکیل بھی۔ ان کا یہ حلقہ انتخاب بھی تھا۔ کچھ آرام کے بعد آپ جلسہ گاہ کی جانب چلے۔ خطاب شروع ہوا۔ عمر فاروق بتاتے ہیں کہ جب آپ کا شاندار خطاب ہو چکا تو میں نے اس پچھلے سال کے ناراض بزرگ سے پوچھا سنائیے بابا جی کس سحر میں ہیں؟ وہ بزرگ اپنے مخصوص سرگودھوی لہجے میں کہنے لگے

"سوں رب دی ساری گل سمجھ تے نئیں آئی پر دھرتی ہل دی نظر آ رئی سی۔"

حافظ محمد دین کا علامہ سے اس قدر گہرا تعلق تھا کہ آپ نے اپنے بچوں اور خاندان کے گیارہ افراد کو علامہ کا بدلہ لینے کے لیے وقف کر دیا۔ آپ مرکزی دفتر آئے ان افراد کے نام لکھوائے کہ یہ اپنی جان کے ساتھ وقف ہیں کہ اگر علامہ کا بدلہ لیا جائے مگر......

اے بسا آرزو کہ خاک شد

حتی کہ آپ نے علامہ کے غم میں رو رو کر اپنی نظر کمزور کر لی۔

سیاہ عَلَم کے نیچے عِلم کا جھنڈا

کبھی کبھی میرا گمان ہوتا ہے کہ شیخوں میں ایسا بہادر آدمی شاید ہی پہلے کبھی پیدا ہوا ہو۔ اگر وہ "مائنڈ" نہ کریں تو شاید وہ آخری بھی تھا۔ دیکھئے نا کیسا منظر تھا کہ "امام بارگاہ" کے دروازے پر اسٹیج سجا ہے اور اوپر عَلَم لگا ہے۔ نیچے احسان الٰہی ظہیر کھڑا للکار رہا ہے۔

"آج......

اپنی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دے کر جاؤں گا۔

آج زبان میری......

کتاب تیری......"

جی ہاں لائن ایریا کراچی کی امام بارگاہ کے باہر سر بازار یہ کانفرنس ہوئی تھی۔ آپ نے اس میں تاریخی خطاب کیا۔ آپ اپنے ساتھ عراقی سفیر کو بھی لیے چلے آئے جو آپ سے گہری عقیدت اور قربت رکھتا تھا۔ ہاں یاد آیا! کچھ ایسا ہی منظر تو بیگم کوٹ لاہور میں فضائل صحابہ کانفرنس میں بھی ہوتا تھا۔ ایک معروف تبرائی رافضی بابا صدا حسین کی امام بارگاہ کے پڑوسی میں ہر سال حضرت علامہ اصحاب رسول و امہات المومنین کی شان و عظمت بیان فرماتے تھے اور سیاہ روؤں کے دل جل کر مزید سیاہ ہو جاتے تھے۔

پیر پگاڑا کا سوال نوابزادہ کا جواب

یونس خلیق میرے ایک مخلص دوست ہیں۔ بلال گنج لاہور میں گاڑیوں کے پرزہ جات کا کام کرتے ہیں۔ ان کے بھائی حاجی یٰسین مرحوم بیان کرتے تھے کہ ایک روز وہ کسی کام سے نواب زادہ نصر اللہ خان کے دفتر نکلسن روڈ گئے۔ وہاں اس وقت پیر پگاڑا بھی آئے ہوئے تھے اور علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی موجود تھے۔ گفتگو کا رخ خطابت کی طرف مڑ گیا۔ پیر پگاڑا نواب زادہ سے پوچھنے لگے کہ "اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا خطیب کون ہے۔" نواب زادہ نے فوراً ہاتھ کا اشارہ علامہ کی طرف کرتے ہوئے کہا کہ "میری نظر میں تو علامہ سے بڑا خطیب کوئی بھی نہیں۔" پیر پگاڑا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں میں مذہبی خطیب کی نہیں، سیاسی خطیب کی بات کر رہا ہوں۔" نواب زادہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "علامہ کی خطابت کا معیار یہ ہے کہ آپ کو بغیر موضوع بتلائے کسی سیاسی یا مذہبی اسٹیج پر کھڑا کر دیا جائے اور کہا جائے آج آپ نے اس موضوع پر گفتگو کرنی ہے تو علامہ اس پر قادر ہیں۔"

مجلس احرار اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت میں جوانی گزارنے والے نواب صاحب کی طرف سے یہ آپ کی خطابت کی وسعت اور گہرائی کا بہت بڑا اعتراف تھا۔

کتابیں ہیں چمن اپنا

امام العصر حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر کتنی ہی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کو کتابوں سے محبت تھی۔ میرے والد کی محبت بھی کتاب تھی اور اس محبت نے میرے والد محترم کو کتابوں کے کاروبار کی جانب مائل کر دیا۔ گوجرانوالہ سے لاہور مسجد چینیانوالی میں ملازمت اختیار کرنے کے صرف ایک سال بعد میرے والد محترم نے کتابوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ 1967ء کے وسط میں علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی مسجد چینیانوالی کی خطابت پر فائز ہو گئے اور یوں دوستی کا ایک بندھن بندھا جو بیس برس تک ان کی وفات تک چلا۔ ہمیں اللہ سے امید ہے اور دعا ہے کہ ان شاء اللہ جنت میں بھی ہمسائے ہوں گے۔ میرے والد محترم نے تب کشمیری بازار لاہور میں مکتبہ قدوسیہ کا آغاز کیا جو مسجد چینیانوالی کے قریب ہی واقع تھا اور جلد ہی مدرسہ کی ملازمت ترک کر دی یقیناً کاروباری مصروفیت تدریسی امور میں حائل ہوتی ہو گی اور تب علامہ کی مکتبہ قدوسیہ آمد شروع ہوئی۔ پھر مکتبہ قدوسیہ اردو بازار میں منتقل ہو گیا اور علامہ ادھر بھی مسلسل آتے رہے تھے کہ اپنی زندگی کے آخری مہینے مارچ میں شہادت سے چند روز پیشتر بھی تشریف لائے اور میرے والد محترم کے ساتھ کچھ جذباتی باتیں کرتے رہے جن کا ذکر میں نے

ان کے متعلق ایک علیحدہ مضمون میں کیا ہے۔

ذکر تھا کتاب سے علامہ کی محبت اور تعلق کا۔ جو تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے دوران ہی گہرا ہونا شروع ہوا۔ اس طرح کہ علامہ نے مدینہ یونیورسٹی دوران تعلیم محسوس کیا، جب ان کے اساتذہ مختلف مذاہب اور مسالک کے عنوان سے تعلیم دیتے ہیں تو ان کی بعض اوقات بہت عمدہ معلومات نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر قادیانیت کے عنوان سے انہوں نے اپنے اساتذہ کی معلومات کو کمزور پایا۔ اب قادیانیت خالصتاً برصغیر کا فتنہ تھا۔ اس لیے عرب علماء اس سے کما حقہ واقف نہیں تھے۔ علامہ نے اپنے اساتذہ سے اجازت طلب کی کہ اگر وہ ان کی جگہ ''قادیانیت'' کے موضوع پر لیکچر دے سکیں، انہیں اجازت مل گئی۔ اب مدینہ یونیورسٹی کا طالب علم یونیورسٹی میں رد قادیانیت پر لیکچر بھی دیتا تھا اور سامعین میں اس کے اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے یہی لیکچرز مرتب شدہ مضامین کی صورت بعض مجلسوں میں شائع ہوئے۔ بعد میں علامہ نے ان لیکچرز کو کتابی شکل دے دی جو "القادیانیة دراسات و تحلیل" کے نام سے شائع ہوئی۔ جب آپ نے یہ کتاب مکمل کی تو اسے شائع کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ آپ ایک ناشر کے پاس گئے۔ اس نے کتاب پسند کی اور شائع کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ ناشر نے علامہ کو تجویز دی کہ آپ کے نام کے ساتھ مدینہ یونیورسٹی کے طالب علم کی بجائے یہ اضافہ کیا جائے کہ آپ یونیورسٹی سے فارغ ہو چکے ہیں۔ آپ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ناشر کے اصرار پر آپ نے اپنے استاد اور بعد کے مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ سے ذکر کیا تو شیخ نے کہا کہ میں آپ کو اس امر کی اجازت دیتا ہوں کہ آپ اپنے نام کے ساتھ فاضل مدینہ یونیورسٹی لکھ لیں۔ اس پر آپ نے ازراہ تفنن کہا کہ اگر میں فیل ہو گیا تو کیا ہو گا۔ شیخ نے کیا تاریخی جملہ ارشاد فرمایا ''اگر احسان الٰہی ظہیر فیل ہو گیا تو ہم یونیورسٹی بند کر دیں گے۔''

مولانا عبدالرؤف رحمانی رابطہ عالم اسلامی کے رکن تھے۔ جمعیت اہل حدیث نیپال کے امیر بھی تھے۔ آپ کا علم کی دنیا میں بڑا مقام ہے۔ کتنی ہی کتب کے مصنف تھے۔ مجھ سے اور خاص طور پر عمر فاروق قدوسی سے بہت محبت کا رشتہ تھا۔ ان کے محبت بھرے خطوط ہماری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ آپ علامہ شہید کی کتاب القادیانیہ کے حوالے سے دو بہت متاثر کن واقعات روایت کرتے ہیں۔ آیے ان کے قلم سے پڑھتے ہیں۔

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے جس سال ایشیائی کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی علامہ صاحب اس کانفرنس میں لاہور سے تشریف لائے تھے۔ وہ میری ملاقات کے لیے میرے کمرہ میں مجھ سے ملنے آئے۔ تو اتفاق میں موجود نہ تھا اور مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اس کے دوسرے سال جب رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس موسم حج میں ہوا اور ہم لوگوں کے لیے حج کا انتظام خود رابطہ نے بڑے اہتمام سے کیا جب ہم لوگ واپس ہوکر مزد لفہ پہنچے تو علامہ احسان الٰہی ظہیر سے مزدلفہ کے میدان میں عشاء کے بعد ملاقات ہوئی۔

اس کے بعد دوسری تفصیلی ملاقات دوسرے سال کے سفر پر رابطہ کے مہمان خانہ منیٰ میں ہوئی۔ اس وقت آپ نے بتایا کہ جب میں مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اس زمانہ میں پاکستان میں فتنہ قادیانیت کا بڑا زور تھا۔ اسی ماحول سے متاثر ہوکر میں نے القادیانیہ ایک کتاب لکھی تھی اور اس میں ختم نبوت کے قطعی دلائل اور براہین میں نے کتاب وسنت سے پیش کیے تھے میں جب یہ کتاب مدینہ منورہ میں لکھ رہا تھا اور اس کا تتمہ شب قدر کی ستائیسویں رات کو میز کرسی پر بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا کہ مجھے سحری کے وقت نیند آ گئی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ مسجد نبوی

میں تشریف فرما ہیں اور شیخین ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ آپ کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں۔ لوگ جوق در جوق سلام و مصافحہ کے لیے حاضر ہو رہے ہیں میں بھی سراپا شوق ملاقات کے لیے حاضر ہو گیا۔ دیدار و زیارت تو ہو گئی۔ اتنے میں میری اہلیہ محترمہ نے مجھے جگا دیا کہ سحری کھا لیجئے۔ میں نے کہا کہ تم نے مجھے ناحق جگا دیا ایک بڑا اچھا خواب دیکھ رہا تھا پھر سارا خواب بیوی سے بیان کیا تو انہوں نے کہا مبارک ہو آپ کی کتاب بارگاہ نبوت میں مقبول ہو گئی۔ علامہ مرحوم کا بیان ہے کہ جب میں صبح آٹھ بجے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پڑھنے گیا اس وقت شیخ عبدالعزیز بن باز جامعہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے ان سے میں نے اپنا پورا خواب پچھلے پہر کا دیکھا ہوا بیان کیا تو شیخ ابن باز فرطِ مسرت سے اٹھ پڑے اور گلے لگا لیا اور کہا کہ ''مبروک مبروک'' یعنی تمہارا خواب بڑا مبارک ہے تمہاری کتاب القادیانیہ کے مقبول ہونے کی یہ ایک بڑی دلیل ہے۔

ایک اور مبارک واقعہ

علامہ مرحوم جس طرح علم و فضل میں ممتاز عالم تھے اسی طرح بفضل خدا حافظ قرآن بھی تھے۔ انہوں نے اپنا ایک دردناک و بصیرت افروز واقعہ مجھ سے بیان فرمایا کہ جن دنوں فتنہ قادیانیت زوروں پر تھا ان ایام میں میرا اشہب قلم بھی اس فتنہ کی تردید میں رواں دواں تھا الاعتصام لاہور میں میرے مضامین ایک سے بڑھ کر ایک شائع ہو چکے تھے حکومت وقت کو میرے مضامین ناگوار گزرے تو انہوں نے ایک الزام لگا کر مجھے جیل کی سلاخوں میں بند کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ جب میں نے مدینہ یونیورسٹی کی بڑی سے بڑی ملازمت کی پیشکش سے انکار کر دیا اور اپنی مادر وطن پاکستان میں

دینی خدمت کرنے کی آرزو لے کر آیا اور الاعتصام کی ادارت سنبھالی اور اس میں زور دار مضامین لکھنے اور حمایت حق کے سبب مجھے جیل میں جانا پڑا اور معاشی طور پر بھی پریشانی ہوئی۔ تو ایک روز ختم قرآن کر کے جب میں سو گیا تو صبح کے وقت بیدار ہوا تو دیکھا کہ میرے چھوٹے بھائی فضل الٰہی رہائی کا پروانہ لے کر جیلر کے پاس پہنچے اور جیلر صاحب نے آ کر مجھ کو رہائی کی خبر دی اور جیل سے باہر گیا۔ باہر سینکڑوں آدمی زندہ باد و مبارکباد کہنے کے لیے موجود تھے۔ جب میری کار آگے بڑھی تو مجھ کو میرے چھوٹے بھائی فضل الٰہی نے ایک لفافہ دیا جو جلالۃ الملک فیصل کی طرف سے ریاض سے آیا تھا اس میں فیصل شہید رحمہ اللہ نے لکھا تھا کہ مجھ کو خوشی ہے کہ تم ہمارے ادارے میں پڑھے ہوئے قابل قدر طلبہ میں سے ہو۔ تمہیں خداداد صلاحیت ملی ہے تم نے جو کتاب "القادیانیہ" لکھی ہے اس کے بارے میں یوگنڈا کے سفیر نے مجھ کو لکھا ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر سینکڑوں قادیانی قادیانیت سے تائب ہو کر پکے محمدی بن گئے اور اس کتاب کے سینکڑوں نسخوں کو مزید طلب کیا ہے اس کے لیے ایک لاکھ روپے کا ڈرافٹ روانہ ہے تم اس سے ساٹھ ہزار نسخے طبع کرا کے ہمارے پاس بھیج دو ہم اس کو یوگنڈا روانہ کر دیں گے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر کہتے ہیں کہ ہم نے رات میں قرآن شریف ختم کر کے دعا کی تھی پھر یہ دعا کتنی جلد مقبول ہوئی فوراً بارگاہ الٰہی کی مشیت سے جیل سے نجات ملی اور میرے معاش کا بھی پردہ غیب سے انتظام ہو گیا۔ علامہ مرحوم یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کتاب کے ساٹھ ہزار نسخے چھپوا کر بھیج دیے اور ہمیں کافی مالی منفعت بھی حاصل ہوئی۔ [1]

[1] مقالہ مولانا عبدالرؤف رحمانی / ترجمان الحدیث مارچ 1988ء۔

"القادیانیة" کی مقبولیت نے نوجوان احسان الٰہی ظہیر کو حوصلہ دیا اور اس کے فوراً بعد ان کی دوسری کتاب "البھایہ" منظر عام پر آئی یہ بھی انہوں نے مدینہ یونیورسٹی میں اپنے قیام کے آخری سال میں ہی لکھی تھی۔ جس کی صراحت مولانا عبدالحمید رحمانی نے اپنے مکتوب مطبوعہ الاعتصام میں کی ہے اور 1972ء میں ان کی تیسری کتاب "الشیعة و السنة" منظر عام پر آئی۔ اگرچہ شیعہ کے حوالے سے اس سے پہلے بھی کئی کتب موجود تھیں لیکن اپنے منفرد اسلوب اور مکمل طور پر شیعہ کتب کے حوالوں سے مزین یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا تیس کے قریب زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے بعد علامہ کا قلم رکا نہیں اور پھر وفات تک آپ کی سترہ کتب طبع ہو چکی تھیں اور مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر رہی تھیں۔ بلکہ سانحہ لاہور کے روز بھی شام کے وقت آپ اپنی کتاب "دراسات فی التصوف" مکمل کر کے جلسے میں تشریف لائے۔

☆......☆......☆

ایک بار علامہ بیروت کے ایک بڑے مکتبہ میں گئے۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے مالک مکتبہ سے پوچھا کہ آپ کے ادارے میں سب سے اہم کتاب کون سی ہے اس نے "الشیعة و السنة" نکال کر سامنے رکھ دی۔ ''جی ہاں یہ کتاب میرے ادارے میں میری نظر میں سب سے قیمتی ہے۔'' ممکن ہے صاحب مکتبہ بھی اس ذوق کا حامل رہا ہو کہ جس کے آپ تھے۔ لیکن اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی کہ جب علامہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ''میں ہی احسان الٰہی ظہیر ہوں اور اس کتاب کا مؤلف ہوں۔'' اب اس نے علامہ کی نکالی ہوئی کتابوں کی قیمت لینے سے صاف انکار کر دیا۔

☆......☆......☆

پھر اس سفر کی روداد بھی مجھے یاد ہے جو آپ نے ہمارے مکتبہ پر بیٹھ کر سنائی کہ آپ کئی ملکوں کا سفر کرتے سری لنکا پہنچے تھے۔ ہوٹل میں قیام پذیر تھے کہ مالدیپ کے کچھ لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے۔ وہ بضد تھے کہ آپ اپنا طے شدہ پروگرام بدل کر ان کے ہمراہ مالدیپ چلیں۔ آپ انکار کرتے رہے، وہ منت سماجت کرتے رہے۔ آپ نے کہا کہ ''میں بہت دن سے نکلا ہوا ہوں، رمضان کی آمد سے پہلے مجھے واپس جانا ہے۔'' جب وہ ہار گئے تو انہوں نے آپ سے آپ کی تازہ کتاب چھین لی کہ چلیں یہ ہی دے دیں، اس کا ترجمہ کروا کر شائع کریں گے۔ علامہ ہمارے مکتبہ پر بیٹھ کر یہ واقعہ سنا رہے تھے اور ساتھ ہنس بھی رہے تھے۔

زندگی کے آخری چند سالوں میں تو علامہ کی کئی ایک کتب منظر عام پر آئیں اور یہ دن عراق ایران جنگ کے بھی تھے۔ میں ذکر کر چکا کہ تمام عرب ممالک ایران کی مذہبی متعصب ملاّ قیادت سے خائف تھے کہ یہ ملا حضرات اپنے اس فرقے کے تنگ نظر انقلاب کو اسلامی انقلاب بنا کر پیش کر رہے تھے اور اس انقلاب کو ایرانی سرحدوں سے باہر پھیلانے کے عزائم کا برملا اظہار کر رہے تھے۔ ایرانی قیادت کے جارحانہ رویے کے سبب یہ جنگ شیعہ سنی جنگ بننے کو جا رہی تھی۔ اسی تناظر میں آپ کی کتب عالم عرب میں بہت مقبول ہو رہی تھیں اور آپ کو مختلف کتب خانوں سے ان کتب کی فراہمی کے آرڈر مل رہے تھے۔ عام سنی مسلمان مختلف فرقوں کے عقاید و نظریات سے آگاہی کے لیے آپ کی کتب پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ دین کی خدمت تو تھی ہی، ساتھ ہی ساتھ ان دنوں آپ نے خوب کاروبار کیا۔ ایک روز میرے والد کو بتانے لگے کہ کل میں نے حساب کیا تھا، اس سال کی کتابوں میں سے اتنا نفع حاصل ہوا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ رقم لاکھوں میں تھی۔ اس سے آپ اس اعتماد اور بھروسے کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو علامہ کو ہمارے والد گرامی پر تھا۔

میری تمام پریشانیاں دور ہو گئی ہیں

عطاء الرحمٰن ثاقب مرحوم بیان کرتے ہیں کہ علامہ کے اساتذہ ''فرق'' کے موضوع پر اپنے اس ہونہار تلمیذ کو اپنا استاذ مانتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مدینہ یونیورسٹی میں آپ کی معیت میں آپ کے اساتذہ کرام سے ملاقات کا اتفاق ہوا...... گفتگو شروع ہوئی۔ آپ کے ایک استاذ نے آپ کی آخری تصنیف کے بارے میں دریافت کیا۔ قائد نے مجھے اشارہ کیا، میں نے ''التصوف'' کے چاروں نسخے جو میرے پاس تھے، ان کو ایک ایک کر دے دیئے...... ان میں سے ایک نے...... مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا...... کتاب کا ٹائٹل دیکھتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا...... خوشی سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی اور کہنے لگے: واللہ! مجھے اس موضوع پر کسی مستند کتاب کی تلاش تھی...... اللہ کا شکر ہے، آپ کی یہ تصنیف دیکھ کر میری تمام پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔ ضرور باقی تصانیف کی طرح یہ بھی ہر پہلو کو محیط ہو گی۔ اب میں کوئی تشنگی محسوس نہیں کروں گا...... یہ کہا اور کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر کی کتب

علامہ شہید نے عربی زبان میں جو کتب لکھیں ان پہ ایک بہت مفصل اور جامع تبصرہ پروفیسر محمد یوسف سجاد نے تحریر کیا تھا۔ جو مجلّہ ترجمان الحدیث میں شائع ہو چکا ہے۔ جبکہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے جناب عبدالرزاق علامہ شہید کے حالات پر تقریباً اڑھائی سو صفحات کے لگ بھگ کتاب لکھی جس میں پروفیسر یوسف سجاد کا تبصرہ بعض اضافوں کے ساتھ نقل کیا۔ جبکہ چند ایک کتب پر تبصرہ نہ ہو سکا۔ ہم ان کے شکریے کے ساتھ بعض کتب پر اضافہ کر کے شامل کر رہے ہیں۔ جبکہ بعض کتب کا تعارف علامہ شہید نے اپنے مختلف انٹرویوز میں کروایا ہے۔ اس کو میں نے وہاں سے اخذ کیا ہے۔

۱۔الشیعة والسنة:

(عربی) صفحات ۲۱۶، بائیسواں ایڈیشن ۱۹۸۴ء ناشرادارہ ترجمان السنہ ۴۷۵ شادمان لاہور۔

یہ کتاب علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی شیعہ موضوع پر اولین تحریری کاوش ہے۔سولہ صفحات کے مقدمہ کے بعد تین ابواب ہیں۔

باب اول: ......شیعہ اور سنت..........اس باب میں عبداللہ بن سبا (یہودی) فتنہ وفساد کے لیے اس کی مساعی، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہ اور امہات المومنین رضی اللہ عنہا دیگر اجلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن وتشنیع اور سب وشتم کی مختلف عبارتیں پیش کی گئی ہیں۔

باب دوم: ......شیعہ اور قرآن..........اس باب میں تحریف قرآن کی مثالیں اور شیعہ کے نزدیک امامت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

باب سوم: ......تقیہ..........تقیہ کی شرعی حیثیت، نکاح ام کلثوم اور اصحاب ثلاثہ کی خلافت کا عتراف جیسے موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے، کتاب میں ۳۶ غیر شیعہ اور ۵۲ شیعہ مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۔الشیعة واھل البیت:

(عربی) صفحات ۳۱۶۔طبع دہم ۱۹۸۵ء ناشر ادارہ ترجمان السنہ ۴۷۵، شادمان لاہور۔

اس کتاب میں روافض کی مزعومہ حُبّ اہل بیت کی حقیقت آشکار کی گئی ہے اور نہایت شرح وبسط کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ وہ طائفہ جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر زبان طعن دراز کرنے کو باعث سعادت سمجھتا ہے، درحقیقت یہ حُبّ اہل بیت میں بھی مخلص وصادق نہیں، کیونکہ اہل بیت اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باہم شیروشکر تھے اور ان جلیل القدر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنا حب اہل بیت کے دعویٰ سے متنا

قص ہے، نیز اہل بیت کی زبان سے جاں نثاران نبوت کی عظمت خود شیعہ کتب سے بیان کی گئی ہے، کتاب کے آغاز میں گیارہ صفحات کا پُر مغز مقدمہ ہے۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: ...... الشیعہ واہل البیت۔ اس میں لفظ اہل بیت اور لفظ شیعہ کی تحقیق، ائمہ کی تعریف میں غلو اور انہیں انبیاء پر فضیلت دینے کا بیان ہے۔

باب دوم: ...... اہل بیت کی مخالفت۔ بالخصوص خلفا و ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت کا موقف، باغ فدک، عبداللہ بن سبا جیسے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔

باب سوم: ...... اہل بیت پر جھوٹے الزامات، متعہ اور اس کی جزئیات کے سلسلے میں اہل بیت کی طرف منسوب اقوال کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب چہارم: ...... توہین اہل بیت۔ شیعہ کتب سے، جملہ اہل بیت بشمول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق توہین آمیز کلمات نقل کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ ہے جس میں ۱۴۲ شیعہ کتب اور اہل سنت حضرات کی ۸۸ کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۔ الشیعة والقرآن:

(عربی) صفحات ۳۵۲، طبع سابع ۱۹۹۵ء ناشر ادارہ ترجمان السنہ ۴۷۵ شادمان لاہور۔

تشیع پر علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تیسری معرکہ آراء تالیف ہے پہلے ۲۶ صفحات پر مبسوط مقدمہ پھیلا ہوا ہے، جس میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ اللہ نے اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کی ہے کہ:

علامہ محب الدین الخطیب مصری رحمہ اللہ نے کتاب "الخطوط العریضة" لکھی جس میں علامہ مصری رحمہ اللہ نے شیعی کتب سے یہ ثابت کیا تھا، کہ روافض قرآن کریم میں

ریف کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں شیعہ عالم نے کتاب لکھی جس میں
امہ مصری رحمہ اللہ کی تردید کی گئی۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ شیعہ کے نزدیک بھی قرآن اسی
رح غیر محرف ہے جیسا کہ اہل سنت کے نزدیک۔ چونکہ علامہ مصری تو بقید حیات نہیں
تھے جو جواب الجواب لکھتے (چنانچہ) علامہ مصری کی تائید میں علامہ احسان الٰہی
ہیر رحمہ اللہ نے اس فرض کو اپنے ذمہّ لیا۔ اور پھر اس کا حق ادا کر دیا اور ایرانی قلمکار کے
ام دلائل کو تارِ عنکبوت ثابت کیا، اس کتاب کے چار ابواب ہیں، اور ہر دور کے شیعہ
کابر کی زبان سے تحریف قرآن کا دعویٰ ثابت کیا گیا ہے اور سب سے زیادہ مواد ایک
ڑے شیعہ عالم فاضل محدّث مرزا حسین رازی طبرسی کی کتاب "فصل الخطاب فی
حریف کتاب رب الارباب" سے پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب اس موضوع پر
ندان شکن اور مسکت حوالہ جات پر مبنی ہے۔ ۷۸ شیعہ اور ۶ اہل سنت کی کتب سے
ستفادہ کیا گیا ہے۔

۴۔ الشیعة و التشیع (فرق و تاریخ):

(عربی) ❶ صفحات ۴۱۶ ناشر ادارہ ترجمان السنہ

شیعہ پر چوتھی کتاب کا مقدمہ ۸ صفحات پر محیط ہے، اس کتاب کا موضوع شیعہ
زم کی مکمل، مفصل تاریخ، پس منظر اور اس کے مختلف فرقے ہیں۔

بـــاب اول: ...... شیعان علی رضی اللہ عنہ ، شہادت عثمان رضی اللہ عنہ ، اختلاف علی رضی اللہ عنہ
معاویہ رضی اللہ عنہ کی کیفیت، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاندان نبوت کی باہم رشتہ
اریاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وحضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح، بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ مباحث
پر قلم اٹھایا گیا ہے، اور ہر بحث کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

---

❶ عربی میں دس بار اور انگریزی میں پانچ بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس کے اور بھی ایڈیشن
شائع ہو چکے ہیں۔

تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں شیعہ عالم نے کتاب لکھی جس میں علامہ مصری رحمہ اللہ کی تردید کی گئی۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ شیعہ کے نزدیک بھی قرآن اسی طرح غیر محرف ہے جیسا کہ اہل سنت کے نزدیک۔ چونکہ علامہ مصری تو بقید حیات نہیں تھے جو جواب الجواب لکھتے (چنانچہ) علامہ مصری کی تائید میں علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے اس فرض کو اپنے ذمہ لیا۔ اور پھر اس کا حق ادا کر دیا اور ایرانی قلمکار کے تمام دلائل کو تارعنکبوت ثابت کیا، اس کتاب کے چار ابواب ہیں، اور ہر دور کے شیعہ اکابر کی زبان سے تحریف قرآن کا دعویٰ ثابت کیا گیا ہے اور سب سے زیادہ مواد ایک بڑے شیعہ عالم فاضل محدث مرزا حسین رازی طبرسی کی کتاب "فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب" سے پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب اس موضوع پر دندان شکن اور مسکت حوالہ جات پر مبنی ہے۔ ۷۸ شیعہ اور ۶ اہل سنت کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۴۔ الشیعة والتشیع (فرق وتاریخ):

(عربی) [1] صفحات ۴۱۶ ناشر ادارہ ترجمان السنہ

شیعہ پر چوتھی کتاب کا مقدمہ ۸ صفحات پر محیط ہے، اس کتاب کا موضوع شیعہ ازم کی مکمل، مفصل تاریخ، پس منظر اور اس کے مختلف فرقے ہیں۔

باب اول: ...... شیعان علی رضی اللہ عنہ، شہادت عثمان رضی اللہ عنہ، اختلاف علی رضی اللہ عنہ ومعاویہ رضی اللہ عنہ کی کیفیت، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاندان نبوت کی باہم رشتہ داریاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وحضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح، بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ مباحث پر قلم اٹھایا گیا ہے، اور ہر بحث کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

---

[1] عربی میں دس بار اور انگریزی میں پانچ بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس کے اور بھی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

باب دوم:...... تشیع اور سبائیت کے اشتراک پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

بـاب سوم: ...... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات واتہامات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان اعتراضات کے جواب دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کرتے ہوئے ان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

بـاب چهارم:...... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مدینہ کے حالات جنگ جمل اور جنگ صفین کے محرکات وعوامل زیر بحث لائے گئے ہیں۔

بـاب پـنجم: ...... تشیع کی تاریخ، عقائد اور فرقے............ قاتلان حضرت حسین رضی اللہ عنہ، کوفہ کے لوگوں کی غداری، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد ان کا اختلاف وافتراق، مختلف شیعہ فرقے، الغرابیہ، الزیدیہ، الجارودیہ، الناوسیۃ السمطیۃ، الفتحیۃ، الاسماعیلیۃ، القرامطۃ، الآغاخانیۃ والبہرۃ، النصیریہ وغیرہ کے عقائد اور تاریخ بیان کی گئی ہے۔

بـاب ششم: ...... شیعہ اثنا عشریہ کی وجہ تسمیہ، شیعی شرائط امامت اور عصمت کے تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بـاب هـفتم:...... شیعہ اثناء عشریہ اور عقائد سبائیہ، صحابہ کرام سے بغض کا عقیدہ، خمینی اور ان کی کتاب کشف الاسرار" مہدی، رجعت مہدی، دابۃ الارض، خرافات الجزائری، مسئلہ حلول وتناسخ اور مستشرقین کی آراء نقل کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۲۵۹ مراجع و مصادر سے مزین ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔

۵۔ البريلوية:

(عربی) صفحات ۲۵۳، طبع یازدہم [1] ۱۹۸۵ء ناشر: ادارہ ترجمان السنہ ۴۷۵، شادمان لاہور۔

کتاب کے شروع میں ۶ صفحات پر شیخ عطیہ محمد سالم قاضی عدالت مدینہ طیبہ

[1] ۸۔ ایڈیشن انگریزی زبان میں نکل چکے ہیں۔

ومدرس وخطیب مسجد نبوی کی پر مغز تقریظ شائع کی گئی ہے، صفحات ۷ سے ۱۲ تک مؤلف کی طرف سے مقدمہ ہے، کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: ...... تاریخ اور اس کا بانی .... اس باب میں بریلویت کے موسس اور بانی کا تذکرہ کیا گیا ہے، بریلویوں کی طرف سے تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جہاد اور مجاہدین کی مخالفت، بانی بریلویت کی شان میں غلو، اصحاب النبی ﷺ کی اہانت، بریلوی زعماء نعیم الدین، امجد علی، دیدار علی، حشمت علی اور احمد یار نعیمی وغیرہ کے بارے میں معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

باب دوم: ...... بریلوی عقائد .... اس باب میں بریلوی کتب حوالہ سے بریلوی عقائد مثلاً غیر اللہ سے استعانت واستغاثہ، رسول اللہ ﷺ سے استعانت، شیخ عبدالقادر جیلانی سے استمداد، انبیاء، اولیاء کے اختیارات، شیخ جیلانی بطور محی وممیت، سماع موتی، حیات انبیاء، سماعت انبیاء، نور من نور اللہ، مسئلہ علم غیب، اولیاء کی غیب دانی، مسئلہ بشریت انبیاء مسئلہ حاضر وناظر وغیرہ قلم بند کئے گے ہیں، اور بریلویوں کے ہر مزعومہ عقیدہ کو پیش کرنے کے بعد کمال اہتمام کے ساتھ قرآن وحدیث سے نصوص صریحہ پیش کر کے ان کا رد کیا گیا ہے۔

باب سوم: ...... بریلویت اور اس کی تعلیمات .... اس باب میں قبریں پختہ بنانے، ان پر قبے تعمیر کرنے، ان پر پردے اور عمامے رکھنے، شمعیں اور دیئے جلانے، عرس منعقد کرنے، مخصوص دنوں میں فاتحہ اور قرآن خوانی کرنے، میلاد منانے اور کھانے پینے سے متعلق رسومات، قبروں کے گرد طواف، تبرک، قبر پر اذان دینے سے متعلق بریلوی عبارات نقل کر کے تعلیمات قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کی تردید وتغلیط کی گئی ہے۔

باب چہارم: ...... بریلویت اور مسلمانوں کی تکفیر .... اس باب میں ان

بریلوی عبارات کا ذکر ہے، جن میں احمد رضا خان اوران کے معتقدین نے شیخ الاسلام مجدد ملت علامہ محمد بن عبدالوہاب، مولانا محمد قاسم نانوتوی، علامہ رشید احمد گنگوہی، شیخ خلیل احمد سہارنپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، شاہ محمد اسماعیل شہید، میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، امام العصر حافظ ابن حزم، امام ابن قیم، امام شوکانی، آل سعود، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، سرسید احمد خاں، محمد علی جناح، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو کافر، فاسق، فاجر، خارج از اسلام اور نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔

باب پنجم: ...... بریلویت .... اس باب میں بریلویوں کے کشف وکرامات کی عجیب وغریب حکایات بیان کی گئی ہیں، جن کی بدولت عامتہ الناس ان کے دام تزویر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کو ۱۵۸ کتب اور رسائل کے حوالہ جات سے مزین کیا گیا ہے۔

۶۔ القادیانیة:

(عربی) صفحات ۳۲۰، طبع اکتیس ❶ ۱۹۸۵ء ناشر ادارہ ترجمان السنہ ۴۷۵، شادمان لاہور۔

یہ کتاب برصغیر میں انگریزوں کی کاشتہ ذریت قادیانیت کے بارے میں ہے۔

کتاب کے شروع میں استاد علامہ السیّد محمد المنتصر الکتانی سابق رئیس شعبہ علوم القرآن والسنہ کلیۃ الشرعیہ جامعہ دمشق وسابق استاذ فقہ مالکی جامعہ رباط مراکش واستاذ حدیث وفقہ کلیۃ الشریعۃ والدعوۃ واصول الدین جامعہ اسلامیہ مدینہ منورّۃ اور فضیلۃ الشیخ عطیہ محمد سالم استاذ الفقہ والادب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورۃ کی تقاریظ ہیں، پہلے اٹھارہ صفحات پر

❶ بیس ایڈیشن انگریزی زبان میں نکل چکے ہیں۔

انتہائی معلوماتی اور جاندار مقدمہ ہے جس میں القادیانیۃ پر لکھنے کے محرکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔

مقالہ اول: ...... قادیانیت ایک استعماری حربہ............اس مقالہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ قادیانیت انگریزوں کی سازش اور اسلام دشمنی کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئی۔

مقالہ دوم: ...... قادیانیت اور مسلمان............اس مقالہ میں مسلمانوں کے بارے میں قادیانی آراء، اسرائیل کا قادیانیوں سے تعاون، اسرائیل میں قادیانی مرکز سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

مقالہ سوم: ......مرزا قادیانی کی طرف سے انبیاء وصحابہ کی توہین......اس مقالہ میں قادیانیوں کی وہ عبارات نقل کی گئی ہیں جن میں انہوں نے نبی اکرم ﷺ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی توہین کا ارتکاب کیا ہے۔

مقالہ چہارم: ......متنبی قادیانی کی رسول اللہ ﷺ سے مماثلت وعظمت (معاذاللہ) .... اس مقالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے (معاذاللہ) استخفاف اور آپ پر فضیلت کے دعاوی پر گفتگو کی گئی ہے۔

مقالہ پنجم: ......قادیانیت اور اس کے عقائد............اس مقالہ میں اللہ تعالیٰ، ختم نبوت، جبرئیل، قرآن، قادیان، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، حج، جہاد سے متعلق قادیانی عقائد کو شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔

مقالہ ششم: ......قادیانی متنبی اور اس کی تاریخ............اس مقالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی ذاتی اور نجی زندگی کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور ا

س کی بعض ہفوات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقالہ ہفتم: ...... متنبی قادیانی اور پیشین گوئیاں..........اس مقالہ میں مرزا کے اس خلل دماغ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس نے پیشین گوئیوں کی صورت میں ظاہر کیا۔

مقالہ ہشتم: ...... قادیانیت اور مسیح موعود..........اس مقالہ میں قادیانی عقیدہ متعلق بہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقالہ نہم: ...... قادیانی زعماء اور فرقے..........اس مقالہ میں قادیانی سرخیلوں، حکیم نور الدین بھیروی، محمد علی لاہوری، مرزا محمود، کمال الدین، محمد احسن امروہوی، محمد صادق، عبدالکریم، یار محمد، نور محمد، محمد صدیق، عبداللہ تیماپوری، چراغ دین وغیرہ اور مختلف فرقوں قادیانی ولاہوری کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقالہ دہم: ...... ختم نبوت اور قادیانی تحریفات..........اس مقالہ میں ان قادیانی تحریفات پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو قادیانیوں نے ختم نبوت کے سلسلہ میں روا رکھی ہیں۔

اس کتاب کے لیے ۱۵۰ حوالہ کی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۷۔ البهایه:

نقد و تحلیل (عربی) صفحات ۳۷۱، طبع ہفتم [1] ۱۹۸۴ء کتاب ہذا بہائیت سے متعلق ہے جو بستی نور علاقہ مازندران (ایران) سے معرض وجود میں آئی، کتاب کا انتساب شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ سابق رئیس ادارۃ البحوث والافتاء والدعوۃ والارشاد سعودی عرب اور شیخ محمد بن علی الحرکان امین عام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف کیا گیا ہے، پھر طبع ہفتم کا مقدمہ ہے، باقی کتاب آٹھ مقالوں پر مبنی ہے۔

پہلا مقالہ: ...... بہائیت اس کی تاریخ اور ابتداء..........اس مقالہ میں موسس بہائیت مرزا حسین علی مازندرانی کے حالات زندگی، روسی تعاون، سقوط فلسطین پر

---

[1] عربی وانگریزی دونوں زبانوں میں بارہ بار طبع ہو چکی ہے۔

بہائیوں کی مسرت ، بغداد روانگی، بغداد سے اخراج، استنبول روانگی، فلسطین روانگی، صہیونیوں، یہودیوں کی طرف سے حمایت، اس کی بیماری جنون، موت اور اس کی تالیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا مقالہ: ...... مازندرانی اور اس کے دعاوی...........اس مقالہ میں مازندرانی کے مختلف دعاوی مثلاً یہ کہ وہ مہدی منتظر ہے، مسیح موعود ہے، اس پر وحی اور فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ وہ تمام انبیاء ورسل سے افضل ہے۔ صاحب عصمت کبریٰ ہے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر سکتا ہے، جو چاہے وہ کر سکتا ہے، وہ مسجود ومعبود ہے، آیات نازل کرنے والا اور رسولوں کو بھیجنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔ العیاذ باللہ ولعنۃ اللہ علیہ۔

تیسرا مقالہ: ...... بہائیت اور اس کی تعلیمات...........اس مقالہ میں بہائیت کی تعلیمات کا تضاد ذکر ہوا ہے کہ ایک طرف وہ وحدت الا دیان اور اتحاد کی دعوت ہے، ساتھ ہی فساد وجدل اور قتل وقتال کی موجد ہے۔ ایک طرف وحدت الا دیان کی دعوت دی ہے، اور تعدد لغات کو اختلاف کا سبب بیان کیا ہے، لیکن عملاً اس کے خلاف عمل کیا اور بابیوں کے ساتھ وحدت لغت کے باوجود اختلاف باقی رکھا، پھر مرد وزن کے حقوق وفرائض، مرتبہ ومقام اور حیثیت کے بارے میں اسلامی اور بہائی نقطہ نظر کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھا مقالہ: ...... بہائی شریعت...........اس مقالہ میں بہائیت کی عبادت بشری، بہائی نماز کی کیفیت، بہائی روزہ، بہائی زکوۃ، بہائی حج، بہائیوں کا کعبہ، بہائی شریعت میں توحید، رسالت ونبوت، امور آخرت، احکام ومعاملات اور محرمات، ازدواج، مخالفت جہاد، احکام میراث وغیرہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

پانچواں مقالہ: ...... مازندرانی اور اس کی زبان دانی...........اس مقالہ میں مازندرانی کی کتاب ''کتاب السایقان'' کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور اس کی لغوی، نحوی،

ترکیبی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور بہائیت کے فریب کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

چھٹا مقالہ: ...... بہائیت اور اس کی پیش گوئیاں............اس مقالہ میں بہائیت کی تمام پیش گوئیوں کی تغلیط اور شرمندۂ تعبیر نہ ہونے پر گفتگو کی گئی ہے۔

ساتواں مقالہ: ...... بہائیت اور اس کے جھوٹ............اس مقالہ میں بہائیت کی لغو اور جھوٹ پر مبنی واقعات پیش گئے ہیں۔

آٹھواں مقالہ: ...... بہائیت کے زعماء اور اس کے فرقے............اس مقالہ میں بہائیت کی ابتداء اور عباس بہائی کی منافقت و مداہنت کا ذکر ہے اور بعد میں مختلف بہائی زعماء، مختلف فرقوں کا تعارف، اور ان کے اعتقادات بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب ۲۱۷ مصادر و مراجع کے حوالہ جات سے لیس ہے۔

البابیه:

عرض ونقد (عربی) صفحات ۲۹۶، طبع ہفتم [1] ۱۹۸۴ء

یہ کتاب بابیہ سے متعلق ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے، کتاب کا انتساب رابطہ عالم اسلامی کی طرف کیا گیا ہے، چالیس صفحات پر پھیلا ہوا مقدمہ کتاب کی روح ہے اور معلومات کا ایک گنجینہ۔ مقدمہ میں علامہ رحمہ اللہ نے بابیہ کا نچوڑ اور آئینہ پیش کر دیا ہے۔ کتاب چار فاضلانہ مقالات پر مشتمل ہے۔

پہلا مقالہ: ......البابیہ اور اس کی تاریخ وابتداء............اس مقالہ میں بابیہ کی تاریخ اور اس کے آغاز سے متعلق معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

دوسرا مقالہ: ......شیرازی اور اس کے دعاوی............اس مقالہ میں مسئلہ امامت وخلافت، ائمہ کی الوہیت وربوبیت، حلول وتناسخ، نسخ شریعت اسلامیہ سے متعلق شیعی کتابوں سے حوالہ جات پیش کر کے حمیری، بغدادی، علامہ ابن حزم اور احمد مصری کی

[1] عربی زبان میں بارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

طرف سے ان کا رد کیا گیا ہے۔

تیسرا مقالہ: ......شریعت بابیہ اور اس کی تعلیمات............اس مقالہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ بابیہ جبریہ شریعت ہے، یہ لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ اسے قبول کریں، اور جو اسے نہ مانے، اس کے قتل کرنے، اس کا مال غصب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، بعدازاں بابیہ کی عبادات، مناکحات، معاملات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھا مقالہ: ...... بابیہ کے زعماء اور اس کے فرقے............اس مقالہ میں بابیہ کے زعماء شیرازی، قرۃ العین، الرشی، محمد علی البار فروشی، صبح الازل، حسین علی مازندرانی کے حالات زندگی اور ان کے کردار کی جھلک پیش کی گئی ہے، مقالہ کے آخر میں بابیہ کے چار معروف فرقوں اور ان کے متبعین کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں، کتاب کے مواد و حوالہ جات کے لیے ۱۷۴ کتب بطور مراجع و مصادر پیش کی گئی ہیں۔

۹۔ التصوف...... المنشاء والصادر:

(عربی) صفحات ۲۹۶، طبع اول ۱۹۸۶ء ناشر: ادارہ ترجمان السنۃ ۴۷۵، شادمان لاہور۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر اپنی اس کتاب کے تعارف میں اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

فرق کے موضوع پر میری ایک اور کتاب صادر ہوئی ہے جو "التصوف المنشاء والمصادر" کے نام سے ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے اور جو بھی لکھا ہے اس پر تنقید یا اس کے دفاع میں لکھا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں نے اس کے منشا و مصدر کی طرف توجہ کی ہے کہ تصوف نے کہاں سے اپنے اصول و قواعد اور بنیادیں حاصل کی ہیں جن پر اس کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ اللہ کے فضل سے میں نے اس کتاب میں اس قوم کی معتبر کتابوں سے تصوف کے منشا و مصدر پر بحث کی ہے۔ اپنی عادت کے مطابق میں اسی گروہ کی کتابوں کے حوالے

ذکر کرتا ہوں جس کے متعلق میں لکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی طرف میں ایسی چیزیں کبھی منسوب نہیں کرتا جن کو وہ قبول نہ کرتے ہوں۔ یا اپنی معتبر کتابوں میں ذکر نہ کرتے ہوں۔ اس بناء پر یہ کتاب اسی نوعیت کی ہے۔ کیونکہ میں نے تصوف کے منشا و مصدر کی بحث میں بدھ مت اور ہندومت جیسے پرانے مذاہب، اسی طرح مجوسیت و زرتشت جیسے فارسی مذاہب اور جدید افلاطونی مذاہب اور آخر میں منحرف و تحریف شدہ مسیحیت کا ذکر کیا ہے۔ جو تصوف کے سرچشمہ ہیں۔ پھر اس کے بعد میں نے بیان کیا ہے کہ شیعیت نے ہی تصوف کو ایجاد کیا ہے اور اس میں ایسے نظریات داخل کر دیئے ہیں جن کا مسلک اہل سنت والجماعت اور مذہب سلف صالحین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ باب (جو کہ اس کا تیسرا باب "التصوف والتشیع" کے نام سے ہے) اس کتاب میں سب سے بڑا باب ہے جو ایک سو پنتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ حالانکہ کتاب کل تین سو صفحات کی ہے۔ [1]

اب کتاب کے مندرجات کے بارے میں پڑھتے ہیں۔

کتاب ہذا کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ''تصوف'' ہے۔ کتاب مقدمہ کے علاوہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: ...... تصوف کی ابتداء اور اس کی منزل بہ منزل تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے اس باب کو چار فصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔

فصل اول میں...... "الاسلام عبارة عن الكتاب والسنة" کے تحت یہ ثابت کیا گیا ہے کہ درحقیقت اصل دین جس پر نبی اکرم ﷺ ہم کو چھوڑ گئے، وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ اس ضمن میں ارکان اسلام، اطاعت رسول ﷺ، مذمت بدعت اور تکمیل دین جیسے موضوعات پر انتہائی وقیع اور موثر انداز

[1] ترجمان الحدیث صفحہ نمبر: 194.

میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

فصل ثانی میں......تصوف کی اصل اور اس کے اشتقاق پر بڑی خوبصورت بحث کی گئی ہے، اور بعد میں صوفیاء کی تعریف اور ان کی علامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل ثالث میں......تصوف کی تعریف خود صوفیاء کی اپنی کتب سے بیان کی گئی ہے۔

باب ثانی: ......تصوف کے مصادر وماخذ بیان کئے گئے ہیں اور اس کے بعد صوفیاء کے وہ اقوال نقل کئے گئے ہیں جو کتاب وسنت سے یا تو متصادم ومتضاد ہیں، یا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تصوف درحقیقت عیسائیت سے ماخوذ ہے، ہندی اور ایرانی مذاہب کا ذکر کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان مذاہب نے نصرانیت سے اثر قبول کیا اور تصوف کے نام پر اسلامی معتقدات کی روح کے منافی سرگرمیوں میں ملوث رہے، اس ضمن میں بعض مشاہیر صوفیہ کے عجیب وغریب ملفوظات پیش کئے گئے ہیں، وحدت الوجود اور وحدت الشہود ودیگر اصطلاحات صوفیہ کا مفہوم اور طریقت کی کرشمہ سازیوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔

باب ثالث: ......اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شیعیت، کا بانی عبداللہ بن سبا تھا۔ بعدازاں اس شخص کا مکمل تعارف دیا گیا ہے، اکابر صوفیاء کا شیعہ ہونا ثابت کیا ہے، اس کے ساتھ ہی تصوف کے مختلف سلسلوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں انتہائی غلو کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح بعض رافضی صوفیوں نے توہین الٰہی اور توہین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارتکاب کیا ہے۔

نزول الوحی واتیان الملائکہ کے ضمن میں صوفیاء کے افکار ومعتقدات کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی تہہ میں شیعیت پوشیدہ ہے، نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شیعہ کے نزدیک ان کے اپنے ائمہ کو انبیاء پر برتری حاصل ہے، شیعہ صوفیوں کے بلند بانگ دعوے اور

تعلیاں باعث استعجاب ہیں، شیعہ کے نظریہ عصمت انبیاء و تفضیل ائمہ علی الانبیاء کی نقاب کشائی کی گئی ہے اس کے بعد شیعہ کتب سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حلول وتناسخ جیسے اعتقادات بھی شیعہ ہی کے حوالے سے متعارف ہوئے۔

مراتب الصوفیہ میں صوفیوں کے مختلف ناموں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، شیعہ عقیدہ ''تقیہ'' پر سیر حاصل تعارفی نوٹ شامل ہے، کتاب ہذا میں عربی، فارسی اور اردو وانگریزی کے ۳۵۶ مصادر ومراجع پیش کیے گئے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی بات کہنے کی بجائے ہر ہر فقرہ حوالے سے مزین ہے، تصوف کے موضوع پر عربی زبان میں ایک شاہکار تالیف ہے۔ [1]

۱۰۔ دراسات فی التصوف:

یہ کتاب حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر نے اگرچہ اپنی حینِ حیات مکمل کر دی تھی۔ کمپوز بھی ہو چکی تھی مگر زیر طباعت سے آراستہ نہ ہو سکیں اور علامہ کی شہادت کے بعد منظر عام پر آئی۔ علامہ شہید اپنی اس کتاب کا تعارف اپنے ایک انٹرویو میں جو سعودی عرب کا معتبر جریدے الدعوۃ کو دیا اس میں خود کرواتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ایک اور کتاب ''دراسات فی التصوف'' کے نام سے ہے۔ پہلی کتاب میں تصوف کے منشا و مصدر کے متعلق بحث ہے جبکہ اس کتاب میں صوفیاء کے عقائد ونظریات اور ان کے آخری مراحل پر بحث ہے اسی طرح اس کتاب میں تصوف کے سلسلہ جات اور لوگوں میں رائج مشہور طریق اور ان بنیادوں کا ذکر ہے جن پر یہ قائم ہیں جو تصوف کو سلف صالحین کے مذہب سے انتہائی دور کرتی ہیں۔ تصوف اور مشروع و مطلوب زہد میں تعلق بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح غلو و مغالات کا ذکر کیا ہے جو تصوف کی اساس

[1] ماہنامہ ترجمان الحدیث ۲۲۳ تا ۲۲۴۔

ہیں۔ یہ کتاب زیر طبع ہے ان شاء اللہ جلد ہی چھپ کر آجائے گی۔ ❶

پہلی کتاب میں تصوف کے منشاء و مصادر کے متعلق بحث ہے جب کہ اس کتاب میں صوفیاء کے عقائد ونظریات اور ان کے آخری مراحل پر بحث ہے، اسی طرح اس کتاب میں تصوف کے سلسلہ جات اور لوگوں میں رائج مشہور سلاسل اور ان بنیادوں کا ذکر ہے جن پر یہ قائم ہیں جو تصوف کو سلف صالحین کے مذہب سے انتہائی دور کرتی ہیں۔ تصوف اور مشروع ومطلوب زہد میں تعلق بیان کیا گیا ہے، اسی طرح غلو ومغالات کا ذکر کیا گیا ہے، جو تصوف کی اساس ہیں۔ ❷

۱۱۔ بين الشيعة واهل السنة

علامہ شہید کی کتاب الشیعہ والسنہ کا ایک مصری شیعہ عالم نے جواب لکھا تھا آپ نے اس کے رد میں جواب الجواب لکھا۔ اس کو مصر کے سفر میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے قایدہ میں ہی بیٹھ کر اس کتاب کا جواب لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ کمپیوز بھی کروایا اور طبع بھی کروایا۔

۱۲۔ الاسماعيلية:

یہ کتاب اسماعیلیہ فرقہ سے متعلق ہے، جو شیعہ فرقے اثنا عشریہ کے علاوہ ہے۔ ہمیشہ سے ان کی کتابیں اور دستاویزات پردۂ اخفاء میں رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق کسی بھی مورخ کو بھرپور معلومات حاصل نہ ہوسکی ہیں، پاکستان کے مشہور مورخ ''شیخ محمد اکرام'' بھی بڑے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں: ''آج بھی پاکستان کے شیعہ حضرات میں اس فرقے کی تعداد کافی ہے۔ افسوس ہے ان کے علماء وزعماء کے حالات دستیاب نہیں ہوئے، تواریخ کی کتب سے اتنا پتا چلتا ہے کہ عہد عالمگیری میں جب ترویج شرع کی کوششیں

---

❶ ترجمان الحدیث، صفحہ: 195.

❷ ماہنامہ ترجمان الحدیث ص ۱۹۴/۱۹۵ مارچ، اپریل ۱۹۸۸ء۔

ہوئیں، تو گجرات کے اسماعیلیوں سے مواخذہ کیا گیا، بعض بوہرہ سرگروہوں کو گرفتار کر لیا گیا اور اپنے پیروؤں سے جو رقمیں وہ وصول کرتے تھے، انھیں بند کرنے کی کوشش کی گئی۔'' ❶

دراصل ''حضرت جعفر صادق کے بیٹے موسیٰ کاظم کو اثنا عشری شیعہ امام موصوف کا جانشین اور امام مانتے ہیں۔ لیکن امام موسیٰ کاظم کے ایک بھائی امام اسماعیل تھے، جو لوگ بجائے موسیٰ کاظم کے ان کے بھائی اسماعیل کو امام مانتے ہیں، وہ شیعہ اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ دولت عبیدیین اسماعیلی شیعوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ اسماعیلیوں نے اپنے حصول مقصد کے لیے ہمیشہ پوشیدہ اور خفیہ کاروائیوں اور نہاں درنہاں سازشوں سے کام لیا۔ ان کے عقائد نہایت خطرناک ہیں۔ اللہ کی کتاب قرآن مجید کو یہ لوگ قابل عمل نہیں جانتے۔ اسماعیل بن جعفر صادق کو پیغمبر مانتے ہیں اور جناب محمد ﷺ کا ہم رتبہ خیال کرتے ہیں اور اسی طرح محمد مکتوم بن اسماعیل بن جعفر صادق کو بھی نبی یقین کرتے ہیں، ان کے نزدیک اماموں کی تعداد سات ❷ ہے، اپنی کتاب ''الاسماعیلیة'' پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ اپنے آخری انٹرویو میں یوں کہتے ہیں:

> ''فرق کے موضوع پر میں نے ایک اور کتاب لکھی ہے جو میری اب تک کی کتابوں میں سب سے بڑی ہے، وہ اپنے موضوع پر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس موضوع پر زیادہ لوگوں نے نہیں لکھا، بلکہ کم مسلمان باحثین نے اس طرف توجہ دی ہے۔ اگرچہ بعض مستشرقین نے اس موضوع پر لکھا ہے مگر صرف ذاتی مقاصد کے لیے۔ بعض مصری دوستوں نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ قومی میلان ان پر غالب رہا۔ اسی

---

❶ رود کوثر ص ۶۴۰۔

❷ تاریخ اسلام ج ۲ ص ۵۳۴۔

لیے انہوں نے اس گروہ کے عقیدہ وفکر پر بحث نہیں کی بلکہ تاریخی وجذباتی بحث کی ہے۔ جس گروہ کے متعلق میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، وہ اسماعیلی گروہ ہے۔ اسماعیلی فرقے پر بہت کم لکھا گیا ہے اور بہت کم اس طرف توجہ دی گئی ہے۔ کیونکہ ان کی کتابیں مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ ان کا شمار باطنیوں میں ہوتا ہے بلکہ وہی باطنی ہیں۔ وہ دوسروں سے اپنی کتابیں اور دستاویزات چھپا کر رکھتے ہیں۔

اسی لیے اس فرقے کے متعلق جستجو کرنے میں، میں نے بہت محنت کی ہے یہ کتاب اس گروہ کے عقائد اور ایک معین وقت کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ بدیہی عرصہ اسماعیلیہ کی نشوونما، پھر مغربی ممالک پر ان کے تسلط، مصر کی طرف ان کی منتقلی، مشرقی اسلامی دنیا میں ان کا پھیلنا، اسلامی دارالحکومت بغداد پر ایک سال کے لیے ان کا قبضہ، پھر صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ان کے انجام کا عرصہ ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جو آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اگر چہ یہ ایک مستقل کتاب ہے مگر یہ میری اس کتاب کی ایک جلد ہے، جو مستقبل قریب میں ان شاء اللہ موجودہ اسماعیلی فرقے کے متعلق لکھنے کا میرا ارادہ ہے، اس بنا پر یہ کتاب پرانے اسماعیلیوں پر ہے، جب کہ آئندہ کتاب نئے اسماعیلیوں پر بحث کرے گی۔ حاصل یہ کہ اس کتاب میں بفضلہٖ تعالیٰ بعض ایسی معلومات ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نے ذکر نہیں کیں۔'' [1]

[1] ترجمان الحدیث ص ۱۹۳/۱۹۴

اے کاش!

کاش ہم وہ پتھر ہوتے جو نبی ﷺ کے قدموں کو چوما کرتے تھے۔

کاش ہم کپڑے کی وہ ٹاکیاں ہوتے جو خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے زخموں پر رکھا کرتی تھیں۔

کاش ہم بھی اس وقت ہوتے اور اپنے آقا ﷺ کے چہرے کو دیکھ کر اپنی آنکھوں پر جہنم کو حرام کر لیتے۔ کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ کہ جن کو سرورِ کونین ﷺ کے رُخِ زیبا کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی قسمت کا کیا کہنا ہے وہ تو انسان تھے اللہ نے ان بستیوں کو مقدس بنا دیا جن بستیوں نے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھا ہے۔ ﴿ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ٥ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ٥ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ٥ ﴾

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دُھول [1]

زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی رفتار بسا اوقات اتنی تیز ہوتی ہے کہ خوبصورت دن حافظے سے محو ہونے لگتے ہیں۔ لیکن بہت چھوٹی عمر کی حسین یادیں دل کے نہاں خانوں میں اپنا مقام طے کیے رکھتی ہیں اور ان ہی یادوں میں ایک بہت خوبصورت یاد ہمارا سال میں دو دفعہ نماز عید کے لیے منٹو پارک جانا ہوا کرتا تھا۔ ہمارے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی ہر سال عید منانے اپنے آبائی گاؤں کوٹ رنجیت سنگھ جایا کرتے تھے جو شیخوپورہ شہر سے گوجرانوالہ روڈ پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ میرے دادا گاؤں میں ہی قیام پذیر تھے اور میرے والد وہاں نہ صرف ان کی خدمت میں حاضری دیتے بلکہ عید کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم بھی ایک مرتبہ عید منانے کے لیے ان کے ہمراہ گاؤں گئے تھے اور نماز باہر کھیتوں میں ایک نسبتاً ہموار میدان میں پڑھی گئی تھی اور گاؤں کے واحد بازار میں عید کی مناسبت سے دکانیں

---

[1] اس باب میں علامہ شہید کی زندگی کے بعض دلچسپ اور تاریخی واقعات آپ پڑھیں گے۔ واقعات کا یہ سلسلہ مجلہ الاخوۃ میں بالاقساط شائع ہوا تھا، ان واقعات سے علامہ کی ذات، مزاج اور شخصیت بہت کھل کر سامنے آتی ہے یہ مضامین میں نے شاید دس برس پہلے لکھے تھے، اس لیے ممکن ہے کہیں آپ کو تکرار نظر آئے، گوارا کیجیے گا۔ (ابوبکر)

اور خریداروں کے ہجوم کا دھندلا سا نقشہ بھی حافظے میں محفوظ ہے۔ عید کے روز ہم اپنے نانا کے گھر لاہور میں ہوتے ہمارے ننھیال کا سارا خاندان نماز کے لیے منٹو پارک جاتا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا دور تھا۔ سیاسی فضا عموماً گرم ہی رہتی تھی۔ لیکن ہم ان باتوں سے لا تعلق کھلونوں اور نان پکوڑوں کے چکر میں رہتے تھے۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ میرے ماموں رانا محمد اکرام ایڈووکیٹ، بھٹو کے قریبی ساتھی تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تب اس کے تاسیسی اجلاس میں جو افراد شریک تھے، ان میں میرے ماموں بھی شامل تھے اور جب 1971ء میں الیکشن ہوئے تو ان کو بھی قومی اسمبلی کا ٹکٹ ملا۔ اب دوسری طرف میرے نانا بھٹو کے اتنے ہی شدید مخالف تھے۔ واپسی پر گھر میں خوب بحث ہوتی کہ خطبہ میں فلاں بات یوں تھی اور فلاں یوں۔ ہم ان باتوں کو غور سے سنتے لیکن ان سب سے قطع نظر کہ عید کا خطبہ کیا ہوتا ہے، ہمارے لیے وہ دن ایک اعلیٰ قسم کی ''پکنک اور آؤٹنگ'' کا ہوتا تھا۔

نماز عید کا خطبہ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ ارشاد فرماتے تھے۔ یوں بچپن سے ہی گھر کی فضا میں جس شخصیت کا نام ایک قائد اور راہنما کے طور پر کانوں سے آشنا ہوا، وہ علامہ احسان الٰہی ظہیر تھے جو بھٹو مخالف تحریک ''قومی اتحاد'' کے مرکزی راہنما تھے اور ہمارے والد کے قریبی دوست تھے۔ جب قومی اتحاد کے اکثر راہنما جیل میں تھے تو تحریک کی قیادت علامہ احسان الٰہی کے ہاتھ میں تھی اور آپ لاہور میں اس کے جلسوں کی روح رواں تھے۔ ان دنوں لاہور میں مسجد شہداء تحریک کا مرکز ہوا کرتی تھی اور آپ تحریک کے دنوں میں عموماً جمعہ وہیں پڑھاتے رہے۔ آپ کی خطابت کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ لوگ علامہ صاحب کا خطبہ سنتے اور بھٹو حکومت کی فسطائیت کے خلاف حوصلہ پاتے تھے۔

مسلم مسجد بیرون لوہاری دروازہ کے ۹ اپریل کے تاریخی جلوس کی قیادت بھی آپ

نے کی۔ حکومت نے بہت وحشیانہ لاٹھی چارج کیا۔ اس دوران آنسو گیس کا ایک شیل آپ کو لگا اور آپ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ کارکن آپ کو اٹھا کر مسجد چینیانوالی لے گئے۔ میرے والد مسلم مسجد میں وضو کر رہے تھے کہ پولیس اندر آ گئی، لاٹھی چارج ہوا، وہ بھی زخمی ہو گئے۔ جب گھر آئے تو ان زخموں کو دیکھ کر میں نے سیاسی شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

مشہور شیعہ عالم اور خطیب علامہ ع غ کراروی بیان کرتے ہیں کہ ''ایک دن میں اور علامہ احسان جلوس کے اختتام پر گرفتاری سے بچنے کے لیے اندرون شہر گلیوں میں ہو لئے۔ میں ان گلیوں کے پیچ وخم سے نا آشنا اور علامہ کے لیے وہ جیسے ہوم گراؤنڈ۔ میں آگے تھا اور وہ پیچھے۔ ناگاہ ایک ٹھوکر لگی اور میں گر گیا۔ علامہ طیش میں آ گئے۔ کہنے لگے ''کیا ہوا ہے، تم سے چلا بھی نہیں جاتا۔'' ع غ کراروی اپنے خاص لب و لہجے میں جب یہ واقعہ بیان کرتے تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا۔

اس دور میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کو بھی شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بزعم خود ''شیر پنجاب'' غلام مصطفیٰ کھر (رنجیت سنگھ کے بعد پہلے پنجابی راہنما تھے جنھوں نے شیر ہونے کا دعویٰ کیا) نے علامہ شہید پر ستم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ ان پر بے شمار جھوٹے مقدمے درج کیے گئے۔ ایک روز آپ خانیوال کے علاقے میں کسی جلسے سے واپس آ رہے تھے کہ گاڑی بے قابو ہو کر نہر میں گر گئی۔ علامہ شہید جو کہ اچھے تیراک بھی تھے وہ تو تیرتے ہوئے باہر نکل آئے لیکن ٹیکسی ڈرائیور نہ بچ سکا۔ حکومت وقت نے اس کے لواحقین سے مل کر اس حادثے کو بھی قتل کا رنگ دے دیا اور علامہ شہید پر قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا۔ ایک بار علامہ شہید کو حالت روزہ میں جب کہ وہ تیز بخار میں مبتلا تھے، گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کی یہ گرفتاری ملتان شہر میں ہوئی۔ آپ کی طبیعت بگڑ گئی تو آپ کو ہسپتال لے جانا پڑا اور امر واقعہ ہے کہ اس ''شیر پنجاب'' غلام

مصطفیٰ کھر نے آپ پر اپنی نگرانی میں تشدد کروایا اور قابل ذکر بات ہے کہ اس وقت آپ ہتھکڑیوں میں تھے۔ بہرحال شیر شیر ہی ہوتا ہے چاہے پابند سلاسل ہو یا پس دیوار زنداں اور گیدڑ شیر کی کھال پہن بھی لے تو گیدڑ ہی رہتا ہے۔ سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان مقدمات کے دوران اور ابتلاء کے وقت اس دور کی اہلحدیث قیادت نے آپ کی جراتوں سے گھبرا کر کہ مبادا حکومت کا رخ ان کی طرف نہ ہو جائے، آپ سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ حضرت علامہ کے تحریک استقلال میں باضابطہ شامل ہونے کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار سے برطرف کر کے جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ ہر طرف خوف کی فضاء تھی۔ بھٹو مخالف لوگ خوش بھی تھے اور متفکر بھی۔ پیپلز پارٹی کے کارکنان اور لیڈر دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے تھے۔ اسی دوران میرے ماموں رانا محمد اکرام بھی گرفتار ہو گئے۔ میرے والد محترم نے علامہ صاحب سے ان کی رہائی کے لیے کہا اور انہوں نے اس سلسلے میں کافی کوشش بھی کی۔ اگرچہ مارشل لاء کا دور تھا اور مارشل لاء صرف اندھا ہی نہیں، بہرا بھی ہوتا ہے۔ اصول اور اخلاق کا وہاں کوئی گزر نہیں ہوتا اور یہی وجہ تھی کہ علامہ شہید بھی صرف کچھ عرصہ ہی جنرل ضیاء الحق کے ساتھ چل سکے۔ جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد میں علماء اور مشائخ کا اجلاس بلایا۔ پاکستان بھر کے علمائے کرام وہاں اکٹھے ہوئے اور ان میں سے اکثر "بادشاہ وقت" کی مدح سرائی میں بازی لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ آپ نے جنرل ضیاء الحق کو مخاطب کر کے نسبتاً ناقدانہ گفتگو کی۔ یہ ایک آمر مطلق کے مزاج کے خلاف تھی۔ اس اجلاس کا ایک طنزیہ لطیفہ علامہ صاحب بیان کیا کرتے تھے کہ ایک بڑے عالم کچھ اس طرح جنرل ضیاء الحق کی تعریف کر رہے تھے کہ غلو بھی شرمندہ ہو رہا تھا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے تقریر شروع کی تو مولوی صاحب بے

اختیار اور بلند آواز سے سبحان اللہ کہہ رہے تھے۔ علامہ صاحب کہنے لگے آپ کی گفتگو سن کر مجھے "بھٹو رضی اللہ عنہ" یاد آنے لگا ہے۔

اس اجلاس کے بعد علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ نے ضیاء الحق کے نفاذ اسلام کے دعووں کو بھانپ لیا تھا اور اس کی مشاورتی کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ آپ سب سے پہلے شخص تھے جو مستعفی ہوئے۔ چنانچہ ایک سچے اور پکے اسلام پرست کی طرح انہوں نے اس کے ان دعووں کی اپنی تحریروں اور تقریروں میں قلعی کھولنا شروع کر دی۔ دوسری طرف تحریک استقلال کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا تھا جب کہ اہلحدیث جماعت کے بزرگ اور ساتھی آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر اور جماعتی خدمات کے سبب آپ سے مسلسل مطالبہ کر رہے تھے کہ اب جماعت کی نشاۃ ثانیہ کی جائے۔ حکومت کی نام نہاد اسلامائزیشن کی پالیسی بھی جاری تھی جس میں اہل حدیث مسلک سے وابستہ افراد کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ احباب نے مل کر اہلحدیث مطالبات کمیٹی تشکیل دی اور حکومتی اداروں میں اہلحدیث کی نمائندگی کا مطالبہ پورے زور و شور سے کیا گیا۔ بہر حال علامہ شہید کے مخالفوں کو اس کا بہت فائدہ ہوا کہ ضیاء الحق نے انہیں ایک دو اداروں میں نمائندگی دے دی۔ جب کہ مسلک اہل حدیث کو اس کا نقصان یہ ہوا کہ سوائے چند ایک کے نا اہل افراد نمائندہ بن گئے اور دوسرا نقصان یہ ہوا کہ وہ لوگ چند کلیوں پر قناعت کر کے بیٹھ گئے۔ ان حالات میں جمعیت اہلحدیث کے اس دور کا آغاز ہوا جو قیام پاکستان سے لے کر اب تک کا اہلحدیث کا زرین دور شمار ہوتا ہے۔

میں ۱۹۸۳ء میں میٹرک کے پیپر دے کر فارغ ہوا تھا۔ یہ اہلحدیث یوتھ فورس کے ابتدائی دن تھے اور ہم فارغ۔ چنانچہ دفتر کا پتا پوچھا اور وہاں جا پہنچے۔ ان دنوں محمد خان نجیب صدر تھے اور قاضی عبدالقدیر خاموش سیکرٹری جنرل۔ بہت اچھا ماحول ہوتا تھا۔ آغا محمود۔ یورش بہت اچھے مقرر ہیں وہ ان دنوں بہت فعال ہوتے تھے۔ علامہ صاحب ان

کی تقریر کو بہت پسند کرتے۔

حضرت علامہ ''مکتبہ قدوسیہ'' اکثر اور بعض اوقات مسلسل کئی کئی روز تشریف لایا کرتے۔ کئی دفعہ آتے تو بوتلوں کے ساتھ پکوڑوں کی فرمائش بھی کرتے۔ وہ جب ہماری دکان پر آتے تو میں دیکھتا کہ میرے والد ان کے لیے اپنی نشست خالی کر دیتے۔ اس سے قبل میں نے انہیں صرف مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کے لیے ایسا کرتے دیکھا تھا۔ مولانا حنیف ندوی کے حضرت علامہ شہید بھی بہت معترف تھے۔

حضرت شہید علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ کسی ہشت پہلو عمارت کی طرح تمام عمر سربلند رہے۔ وہ صحیح معنوں میں اہل حدیث کے لیے قائد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ذات کے کتنے ہی پہلو تھے اور یہ سارے پہلو درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ غالب نے کہا ہے ع

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ان کی زندگی کے کتنے ہی دل چسپ واقعات ہیں جن سے ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کی قیادت کرنے والے میں کیا اوصاف اور خوبیاں ہونی چاہئیں۔ ان کی شخصیت کو دیکھ کر سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے قائدین کو سبق سیکھنا چاہیے۔ اقبال نے کہا تھا

نگہ بلند ، جاں پرسوز ، سخنِ دلنواز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

علامہ احسان الٰہی ظہیر کے بارے میں ایک عام تاثر تھا کہ ان کے مزاج میں بہت سختی ہے۔ ہم نے انہیں قریب سے دیکھا تو معاملہ اس کے برعکس پایا۔ میرا گمان ہے کہ یہ تاثر ان کی خطابت میں شعلہ بیانی کے سبب پیدا ہو گیا تھا اور یہ بھی سن رکھا ہے کہ

پاکستان آمد کے بعد جب آتش ابھی جوان تھا، تب ایسا ہی معاملہ تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی رہا ہو کیونکہ ہم نے تو ان کا وہ دور نہیں دیکھا۔ لیکن جب انہوں نے جمعیت اہل حدیث قائم کی، تب ان کے مزاج میں واضح تبدیلی آ چکی تھی۔ سختی کی جگہ نرمی، تیزی کی جگہ حلیمی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ بے حد رقیق القلب ہو چکے تھے۔ دوستوں کا خیال رکھتے، اپنے کارکنان کے حالات سے باخبر رہتے۔

ایک مرتبہ میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی شہید بیمار ہو گئے۔ ان دنوں کاروباری حالات دگرگوں تھے۔ جمعیت کی مجلس شوریٰ کا اجلاس جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ میں ہو رہا تھا۔ علامہ شہید میرے والد کو لینے کے لیے ہمارے گھر تشریف لائے تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔ علامہ شہید بہت تیز گاڑی چلاتے تھے۔ ابھی دریائے راوی ہی پار کیا تھا کہ مولانا حنیف ندوی (رحمہ اللہ) یاد آ گئے۔ افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ بہت غلطی ہو گئی کہ مولانا ندوی (رحمہ اللہ علیہ) کو ساتھ لانا یاد نہیں رہا۔ گوجرانوالہ پہنچ گئے۔ میرے والد بیماری کے سبب پنڈال سے ہٹ کر سائے میں چارپائی پہ لیٹے ہوئے تھے جب کہ اجلاس جاری تھا۔ ان دنوں مرکز اہل حدیث لارنس روڈ کی زمین کی خریداری کا مرحلہ درپیش تھا۔ چنانچہ شوریٰ کے اجلاس میں بھی چندے کی اپیل کی گئی۔ میرے والد محترم نے بھی پانچ ہزار روپے کا کہا۔ اس وقت یہ ایک خطیر رقم تھی۔ میں نے جا کر سٹیج پر علامہ شہید کو پیغام دیا۔ علامہ نے رندھے ہوئے گلے اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ ان پیسوں کا اعلان کیا کہ انہیں معلوم تھا کہ ان پیسوں کے پیچھے حالات سے قطع نظر جذبات کا ایک سمندر ہے۔

باپ سے زیادہ شفیق

ملتان سے مولانا ادریس عتیق ''باپ سے زیادہ شفیق'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ

''مجلس شوریٰ کے اجلاس کا دعوت نامہ وصول ہوا، اس تاکید کے ساتھ کہ اجلاس میں

ضرور شرکت کرنی ہے اور میری جیب کی حالت یہ تھی کہ آمدروفت کا کرایہ تک نہ تھا۔ میں علامہ کا حکم بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ ادھار پیسے پکڑ کر شوریٰ کے اجلاس میں پہنچا۔ اجلاس کے بعد چند ہم راہیوں کے ہمراہ واپسی کے لیے نکلا۔ ایک سیاہ رنگ کی گاڑی تیزی سے گذری اور ذرا آگے جا کر رک گئی۔ ایک دم علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید گاڑی سے برآمد ہوئے۔ آ کر گلے ملے اور بڑی محبت کا اظہار کیا کہ میں نے اتنا سفر کیا۔ پھر ایک طرف لے جا کر کہنے لگے میں جانتا ہوں کہ آپ کے مالی حالات اچھے نہیں، پھر بھی آپ نے بڑی ہمت سے کام لیا اور پانچ سو روپیہ زبردستی میری جیب میں ڈال دیا اور اس زمانے میں پانچ سو روپے کی قیمت بڑی ہوتی تھی۔"

دوستوں کی عزت افزائی

جب میرے والد بیماری کے سبب سروسز ہسپتال لاہور میں داخل ہو گئے۔ دوپہر کا وقت تھا جب داخلہ ہوا۔ تیمارداری کے لیے سب سے پہلے علامہ تشریف لائے جب کہ ابھی ہمارے گھر سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔

مرکز اہل حدیث لارنس روڈ کا افتتاح الشیخ عبداللہ عبدالمحسن ترکی نے کیا تھا۔ وہ آج کل رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل [1] ہیں اور سعودی سیاسیات میں خاصے متحرک اور موثر ہیں۔ جب وہ لاہور تشریف لائے تو علامہ احسان الٰہی ظہیر انہیں لے کر مکتبہ قدوسیہ بھی تشریف لائے۔ یہ بھی ان کا دوستوں کی عزت افزائی کا ایک خوبصورت انداز تھا۔ عبداللہ عبدالمحسن لاہور آنے سے پہلے کراچی گئے تھے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید نے کراچی کی تنظیم کے احباب کو ائرپورٹ پر ان کے استقبال کی ہدایت کی تھیں۔ چنانچہ کراچی سے اہل حدیث یوتھ فورس کے نوجوان ایک بڑا جلوس لے کر ائیرپورٹ موجود تھے۔ جب یہ قافلہ ائیرپورٹ سے شہر کی طرف روانہ ہوا تو پیچھے گاڑیوں کی لمبی

[1] جب یہ مضمون لکھا تھا تب کی بات ہے۔

قطاریں لگ گئی اور یوں محسوس ہو رہا تھا یہ بھی استقبالی جلوس کا حصہ ہیں اور یوں ایک بڑے جلوس کا سماں بندھ گیا۔ سعودی شیخ کے لیے اس طرح کا استقبال حیران کن تھا۔ جب ہوٹل پہنچے تو ہوٹل کی لابی میں کھڑے ہو کر علامہ احسان الٰہی ظہیر نے اپنی تنظیم کے مقامی ذمہ داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت چاہی تاکہ مہمان کچھ دیر آرام کر سکیں۔ ایسے میں ہجوم میں کھڑے ایک پر جوش مقامی کارکن پر نظر پڑی۔ وہ کارکن رکشہ چلاتا تھا اور علامہ کا بہت مداح تھا۔ علامہ نے اسے آگے بلا کر گلے لگایا، حال احوال پوچھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ساتھ سعودی مہمان اور وزیر کھڑے ہیں۔ علامہ کے بعد ایسے کارکنان ملک بھر میں بکھرے ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں کہ اس شخص نے ان کی اتنی عزت افزائی کی اور اب......؟

☆......☆......☆

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید دوسروں کی عزت نفس کا اتنا خیال کرتے تھے تو اپنے بارے بھی اتنے ہی حساس تھے۔ عالم عرب میں اتنی عزت پانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے ہاں سے جو افراد جاتے ہیں عموماً کشکول ہاتھ میں لیے ہوتے ہیں۔ لیکن علامہ اس ہنر سے نا آشنا تھے۔ جماعت پر خرچ ہونے والی رقم ان کی جیب سے ہوتی تھی یا ان کے چند ایک ذاتی دوست احباب شریک کار ہوتے تھے۔

حافظ عابد الٰہی بیان کرتے ہیں کہ میں اکثر ان سے الجھتا کہ بھائی جان عرب شیوخ اور حکمران آپ کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ آپ کا کہا نہیں ٹال سکتے تو آپ ان سے جماعت کے لیے فنڈ کی بات کیوں نہیں کرتے؟ علامہ شہید کہتے "یار مجھے شرم آتی ہے۔"

☆......☆......☆

مکتبہ کتاب و سنت ریحان چیمہ (ڈسکہ) کے مدیر حافظ مصطفیٰ جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ کے طالب علم تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ جون کا مہینہ تھا، گرمی زوروں پر تھی

اور میں لاہور کے لیے عازم سفر ہوا۔ علامہ شہید ان دنوں اپنی کتب تقسیم کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کی کتب کا ایک سیٹ حاصل کروں۔ شدید گرم دو پہر میں جمعیت کے دفتر شاہ جمال پہنچا اور دفتر کے ساتھیوں سے استدعا کی کہ میں علامہ کے گھر جانا چاہتا ہوں اور دل ڈر رہا تھا کہ وہ ناراض نہ ہوں کہ نامناسب وقت پر آیا ہوں۔ بہر حال ایک ساتھی نے مجھے ان کے دروازے پر لا کھڑا کیا کہ باقی کام خود کرو۔ میں نے گھنٹی بجائی تو ایک ملازم باہر آیا۔ مدعا پوچھا تو ملاقات کا مقصد عرض کیا۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ علامہ شہید لائبریری میں بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے اور ان کے اردگرد کتب بکھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور بیٹھنے کا کہا۔ میں نے عرض کیا کہ میں کتب کے لیے حاضر ہوا ہوں اور ساتھ ہی اپنی تعارف کرایا۔ مجھے تھوڑا سا ڈر تھا کہ بے وقت آنے پر ناراض ہوں گے لیکن وہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ جب میں داخل ہوا تو لائبریری میں ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا تو میرا دل چاہا تھا کہ کاش کتب کچھ دیر سے ملیں اور میں اس خنک ماحول میں کچھ وقت گزار سکوں۔ میرے دل کی مراد بر آئی اور علامہ شہید کہنے لگے ''بیٹا تم اتنی دور سے اس گرمی میں سفر کر کے آئے ہو، تھوڑی دیر ادھر قالین پر آرام کر لو'' اور ساتھ ہی مشروب سے میری تواضع کی۔ میں حیران اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہیں قالین پر لیٹا رہا۔ لائبریری کے یخ بستہ ماحول میں بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ جب تھوڑی دیر گزر گئی تو عرض کیا چلتا ہوں کتب عنایت کر دیجیے۔ گھر کے پچھلی طرف اوپر کی منزل میں سٹور واقع تھا۔ علامہ شہید اپنے ملازم کو بھیجنے کی بجائے میرے ساتھ خود سٹور میں گئے۔ وہاں انہوں نے خود ہی کتب باندھیں اور مطالعے کی تلقین کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک بار حافظ ابتسام الٰہی ظہیر نے بڑی خوبصورت بات کی تھی کہ ''ابوجان کا کارکنان سے بالکل باپ والا رویہ ہوتا تھا کہ دل شفقت سے بھرا ہوا اور آنکھ رعب سے پر۔''

ان کے بعض واقعات اتنے عجیب اور دل چسپ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

جمعیت کے دفتر میں حافظ عزیز الرحمان بالا کوٹی ہوتے تھے۔ ان کا تمام خاندان بریلوی مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اکیلے اہل حدیث ہو گئے۔ اتنے نیک تھے کہ مولانا شمشاد سلفی نے ان کا نام جنتی رکھ چھوڑا تھا۔ آٹھ سو روپے ماہوار پر انہیں ملازم رکھا۔ علامہ شہید نے کہا اگر سائیکل سیکھ لو گے تو تمہاری تنخواہ میں ایک سو روپے کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ عطاء الرحمٰن ثاقب مرحوم اور حافظ عزیز الرحمٰن اکٹھے سائیکل سیکھنے جاتے اور گراؤنڈ میں گپ شپ کر کے واپس آ جاتے۔ نتیجہ وہی نکلا کہ دونوں ہی سائیکل چلانا نہ سیکھے۔ البتہ عطاء الرحمٰن تو اس کے بغیر ہی جنت میں جا چکے (ان شاء اللہ) اور عزیز الرحمٰن آج بھی پیدل مارچ ہی کرتے ہیں۔

علامہ کی زندگی کا آخری رمضان تھا اور لارنس روڈ مرکز میں نماز تراویح کا اہتمام تھا۔ نئی جگہ تھی۔ آباد کرنے کا جوش علامہ پر سوار تھا۔ کچھ غیر ملکی مہمان آنے تھے۔ انہیں ائیر پورٹ پر وصول کر کے اور ہوٹل پہنچا کر علامہ مرکز کی طرف آ نکلے۔ دیکھا عزیز الرحمٰن اکیلے صفیں بچھا رہے ہیں۔ علامہ شہید نے پوچھا باقی لوگ کہاں گئے؟ عزیز الرحمٰن بتانے لگے کہ مہمانوں کے استقبال کے لیے گئے ہیں۔ آپ کو بہت افسوس ہوا کہ عزیز الرحمٰن اکیلا یہ ساری صفیں بچھا رہا ہے۔ علامہ مل کر اس کے ساتھ صفیں بچھانے لگے۔ جب ساری صفیں بچھ گئیں تو علامہ نے عزیز الرحمٰن سے کہا کہ تم تو بہت تھک گئے ہو گے، چلو آؤ میں تمہیں دبا دیتا ہوں۔ عزیز الرحمٰن بھونچکا رہ گئے کہ علامہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اس دوران دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ علامہ شہید نے انہیں خوب ڈانٹا کہ تم لوگ اتنی دیر سے آئے ہو۔ یہ بے چارہ بری طرح تھک گیا ہے اور آج جب عزیز الرحمٰن بائیس سال بعد میری دکان پر آیا تو میں نے اسے ایک پمفلٹ دکھایا کہ

جس میں علامہ کی دیانت اور امانت پر ایک ''احسان فراموش'' شخص نے سوال اٹھائے ہیں کہ جس پر علامہ کے ان گنت ذاتی احسان ہیں تو عزیز الرحمٰن رو پڑا اور واقعی تھکا تھکا دکھائی دینے لگا۔

☆......☆......☆

لارنس روڈ پر جمعیت اہل حدیث کی مجلس شوریٰ کا آخری اجلاس جاری تھا کہ اس کے بعد علامہ اس دنیا میں نہیں رہے۔

جماعت کے معروف خطیب مولانا حبیب الرحمان یزدانی نے کمالیہ کی جماعت کو جلسے کا وقت دیا تھا، کسی وجہ سے وہ وعدہ ایفاء نہ کر سکے اور جلسے میں نہ پہنچے۔ جو مولانا صاحب میزبان تھے وہ جمعیت کے رکن شوریٰ تھے اور اجلاس میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مولانا یزدانی پر مقدمہ دائر کیا ہوا تھا۔ اب مولانا یزدانی کا ڈرائیور جو خاصا لحیم شحیم تھا، اس کا سامنا اجلاس میں مولوی صاحب سے ہو گیا۔ کچھ تو تکار ہوئی اور بات بڑھ گئی۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا۔ اس پر اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

مولانا اسحاق چیمہ (رحمہ اللہ) اور فیصل آباد کے دیگر احباب شوریٰ سب کے سب شدید ناراض تھے اور صورت حال بہت نازک ہو چکی تھی۔ علامہ شہید کو پتا چلا تو بھاگتے ہوئے آئے۔ سارے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ یزدانی صاحب کے ڈرائیور کو بلایا۔ اسے زور کا تھپڑ رسید کیا اور مولوی صاحب سے یزدانی مرحوم کی طرف سے معذرت طلب کی۔ مولوی صاحب پھر بھی نہ مانے۔ علامہ شہید نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اب بتایئے مولوی صاحب کیا کرتے۔

☆......☆......☆

آخری دنوں میں علامہ صاحب کی طبیعت میں بہت رقت آ گئی تھی۔ اپنی شہادت

سے چند روز پہلے سعودی عرب کے آخری دورے سے واپس آئے۔ میرے والد دو دن فون نہ کر سکے تو ان کا فون آ گیا کہ ''دو دن ہو گئے، آپ نے خبر بھی نہ لی'' تھوڑی دیر گزری اور مکتبہ قدوسیہ آ موجود ہوئے۔ ہمارے مکتبے میں زمین پر ہاتھ سے بنے غالیچے کا خوبصورت ٹکڑا بچھا ہوتا۔ اس پر مجالس سے کاروبار تک کے سارے معاملے طے پاتے۔ دونوں دوست آمنے سامنے بیٹھے اس شعر کی تفسیر بنے بیٹھے تھے تو ؏

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو
شرح دہم غم تورا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

علامہ شہید حرم کعبہ میں گزری واردات قلبی کا حال سنا رہے تھے۔ کہنے لگے ''اس دفعہ عجیب بات ہوئی۔ میں طواف کے بعد حرم کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ دل بھر آیا۔ نگاہ میں سوال تھے۔

اللہ میں نے تیرے دین کی عزت کے لیے!

اپنی عزت اور جان کی پروا نہ کی!

اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں۔

اپنے مال اور اولاد کی پروا نہ کی

اور میرے مخالف

ویسے کے ویسے؟

اسی عالم میں جیسے غنودگی میں چلا گیا۔ ایسے لگا جیسے کسی نے کہا تو عجیب آدمی ہے۔ ہم نے تجھے اتنی عزت دی، شہرت دی کہ تیرے دشمن روز جیتے اور روز مرتے ہیں کیا تو چاہتا ہے وہ ایک بار ہی ختم ہو جائیں۔ ایک دم جیسے آنکھ کھل گئی۔ بات سمجھ آ چکی تھی، دل بھی ہلکا ہو چکا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔''

یہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کی مکتبہ قدوسیہ آخری آمد تھی۔

رفع الیدین اور آمین کے ''چکر''

اپنے مسلک کی غیرت وحمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جہاں توحید وسنت کے خلاف واقعہ ہوتا برداشت نہ کرتے۔ اعلیٰ پائے کے خطیب ہونے کے سبب دلوں کو فتح کرنے کا ملکہ ان کو حاصل تھا۔ بہت جلد ملک کی سیاست میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ ایک روز شورش کاشمیری نے بے تکلفی کے ساتھ ان کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ''علامہ صاحب اب آپ ملکی لیڈر بن چکے ہیں مسلکی تعصبات سے اٹھیے اور رفع الیدین اور آمین کے چکر سے باہر نکلیے۔'' علامہ احسان الٰہی ظہیر نے اسی بے تکلفی سے جواب دیتے ہوئے کہا ''شورش صاحب مر سکتا ہوں رفع الیدین اور آمین کے چکر سے نہیں نکل سکتا۔ آپ کو شاید پتہ نہیں مجھے حاجی ظہور الٰہی نے گھٹی دی ہوئی ہے۔'' حاجی ظہور الٰہی (رحمہ اللہ) کی گھٹی کے جملے کا صحیح لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو حاجی صاحب کو جانتا تھا۔

میں نے آپ کو معاف کیا

حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ کے واقعات اتنے دل چسپ ہیں کہ ان پر مستقل ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اپنا ذاتی واقعہ پیش کرتا ہوں۔ علامہ شہید کا حادثہ ہوئے ابھی چند برس ہی گزرے تھے کہ ایک روز پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی کے ہمراہ حاجی صاحب مکتبہ قدوسیہ تشریف لائے۔ ان کے پاس ایک کتاب کا مسودہ تھا اور آمد کا مقصد اس کتاب کی طباعت تھی۔ میں نے ان کی کتاب کا کام شروع کر دیا۔ اپنی دانست میں اور اس دور کے وسائل کے مطابق عمدہ کتاب شائع کی۔ جب حاجی صاحب کتاب لینے تشریف لائے تو انہیں کتاب کا سرورق پسند نہ آیا اور انہوں نے اپنی اس ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار بھی کر دیا کہ مداہنت اور مصلحت کوشی سے وہ کوسوں دور تھے۔ اور یہی وصف ان

کے بیٹے احسان الٰہی ظہیر میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ حاجی صاحب کی اس ''برسر عام حق گوئی'' کی مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میرا گمان تھا کہ کتاب بہت عمدہ طبع ہوئی ہے کیونکہ اس کی طباعت کے لیے میں نے بہت محنت کی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ آپ ایسا کہیں گے۔'' حاجی صاحب کو اس پر بڑا شدید غصہ آیا اور اس کا اظہار اپنے انداز میں انہوں نے کیا۔ اسی اثناء میں نماز کا وقت ہو گیا۔ آج بیس سال بعد بھی اور اس دن نماز کے بعد بھی مجھے احساس ہے کہ میرے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ نامناسب تھے نہ میرا منصب تھا نہ استحقاق کہ ایسے الفاظ منہ سے نکالتا۔ جب ہم نماز کے بعد واپس آئے تو حاجی صاحب دوبارہ گویا ہوئے لیکن اب ان کا رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور تھا۔ فرمانے لگے کہ ''میں نے تمہیں جو کہا وہ غلط تھا اب تم مجھے معاف کر دو اور یہ کہو کہ میں نے معاف کیا'' میں باقاعدہ بوکھلا گیا کہ عرض کیا حاجی صاحب آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ میرے منہ سے پہلے ہی نامناسب الفاظ نکل گئے تھے۔ میں خود ان پر شرمندہ ہوں۔ الٹا آپ معافی مانگ رہے ہیں اور اوپر سے تقاضا بھی کہ معافی قبول کرنے کے الفاظ بھی ادا کر دوں۔ لیکن حاجی صاحب مصر تھے کہ میں کہہ دوں کہ ''میں نے انہیں معاف کیا'' اب وہ میرے بھی بزرگ اور میرے والد کے بھی بزرگ، میرے لیے کڑا امتحان تھا۔ کتنی دیر تک تکرار جاری رہی، ان کے مطالبے کی شدت! اللہ جانتا ہے میں نے بہت مقابلہ کیا۔ لیکن جو اصحاب حاجی صاحب کو قریب سے جانتے تھے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شکست کس کے مقدر میں تھی۔ سو صاحب میں ہار گیا۔ میں نے سر جھکا کے کہا ''حاجی صاحب میں نے آپ کو معاف کیا۔''

مسجد کا تالا کھول دیں

بات ہو رہی تھی مسلک اہل حدیث کی غیرت وحمیت کی۔ توحید کی غیرت عمومی طور پر ہر اہل حدیث میں پائی جاتی ہے۔ نتیجتاً اہل حدیث حضرات کو خشکی اور ترشی کا طعنہ عام

طور پر سننا پڑتا ہے۔ ؏

یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لیے ہے

مسلک کی عزت وقار کا مسئلہ درپیش ہوتا تو احسان الٰہی ظہیر بے تاب ہو جاتے۔ مولانا رفیق مدن پوری کے بیٹے صدیق مدن پوری میرے دوست ہیں۔ بتاتے ہیں کہ فیصل آباد میں ایک مسجد کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ اس وقت کے ڈی سی نے مسجد کو تالا لگا دیا۔ اہل حدیث بے چارے ہوتے کمزور ہی ہیں اور عموماً سرکار دربار میں ان کا اثر و رسوخ بھی واجبی سا ہوتا ہے۔ وہ لوگ علامہ احسان الٰہی ظہیر کے پاس چلے آئے کہ علامہ صاحب یہ مسئلہ ہو گیا ہے۔ علامہ شہید نے بغور بات سنی اور کہا آپ چلے جایئے کچھ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دلاسے اور تسلی کو ہم نے طفل تسلی پر محمول کیا اور واپس چلے آئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ ادھر علامہ احسان الٰہی ظہیر نے فیصل آباد کے ڈپٹی کمشنر کو فون کیا۔ ''ڈپٹی صاحب دو ہی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ آپ انصاف کریں، ظالموں کا ساتھ نہ دیں اور مسجد کا تالا کھلوا دیں، دوسری صورت یہ کہ احسان الٰہی ظہیر اس مسجد کے سامنے جلسہ کرے گا اور آ کر خود مسجد کا تالا کھولے گا۔'' ڈپٹی کمشنر نے عرض کیا ''علامہ صاحب آپ تشریف نہ لائیں، مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' اور ایسا ہی ہوا۔ وہ دوست بیان کرتے ہیں کہ جب ہم واپس پہنچے تو مسجد کھلی ہوئی تھی۔

کاروباری اخلاقیات

ہمارے مرشد و مخدوم نے ذاتی زندگی میں امانت اور دیانت کے تقاضے پورے کر کے وسیع و عریض کاروبار کیا۔ بے شمار لوگوں سے معاملات تھے۔ آج اٹھائیس برس ہونے کو آئے ہیں۔ ہم نے ان کی طرف کسی کاروباری رفیق کی انگلی اٹھتے نہیں دیکھی۔ راوی روڈ پر میرے ماموں کے مغل برادری سے تعلق رکھنے والے ایک ہمسائے تھے۔ بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک دن اپنا واقعہ بیان کرنے لگے، لیجئے ان کے

الفاظ میں سنیے:

''ہم نے علامہ احسان الٰہی ظہیر کے ساتھ ایک پلاٹ کا سودا طے کیا۔ خاصا بڑا سودا تھا۔ چنانچہ بیعانہ کئی لاکھ روپے طے ہوا۔ مقررہ مدت آ گئی لیکن ہم سے مطلوبہ رقم کا انتظام نہ ہو سکا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارا لاکھوں روپیہ ڈوب گیا ہے کہ دوسری طرف اتنا بڑا لیڈر اور سیاسی آدمی جب کہ ہم عام لوگ۔ ایک دن اسی پریشانی میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست نے کہا یار گھر بیٹھے خیال باندھ رہے ہو۔ دین دار آدمی ہے، جا کر بات تو کرو۔ اس کے ایسا کہنے سے ہماری ہمت بندھی اور اور ہم علامہ کے گھر کو چل دیے۔ علامہ اپنی لائبریری میں بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے۔ ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب فراغت ہوئی تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ''کیا پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکا؟'' اور ظاہر ہے یہ بات ہمارے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ ہم نے اقرار میں سر ہلایا اور منتظر ہو گئے کہ کیا کہتے ہیں۔ علامہ اٹھ کر اندر گئے، چند لمحے بعد آ کر پیسے ہمارے سامنے رکھ دیے اور کہا ''یار دیکھو کسی کے پیسے ہم مارتے نہیں اپنے مرنے نہیں دیتے، مشکل وقت سب پر آ جاتا ہے۔'' اندازہ کیجئے ان کوتاہ قامت لوگوں کا کہ جو ''اپنے'' ہو کر آج علامہ پر انگلی اٹھاتے ہیں اور غیر اس کی امانت دیانت کا گواہ بن کے کھڑا ہے کہ اس کی مجبوری سے بھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا۔

جرأت اور بہادری کا وارث

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید بہت جرأت مند اور بہادر آدمی تھے ؎

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

علامہ شہید 1977ء کے الیکشن میں پتوکی سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ مقابلے پر اس علاقے کے جاگیردار اور وڈیرے سے ان کا مقابلہ تھا۔ مخالف امیدوار نے ابتداء میں

پراپیگنڈا کیا کہ یہ ”مولوی میرا کیا مقابلہ کر سکتا ہے، اس کو تو میں جب چاہے اٹھوا سکتا ہوں۔“ ہوتے ہوتے یہ بات علامہ کے کانوں تک بھی آ پہنچی۔ علامہ شہید گاڑی پر سردار کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ گاڑی سے اکیلے اس عالم میں اترے کہ ساتھی گاڑی میں ہی تھے۔ وہ سردار ڈیرے پر اپنے حلقہ احباب میں جان محفل بنا بیٹھا تھا۔ حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر علامہ ظہیر نے اس کو للکارا ”تم کہتے ہو جب چاہو مجھ کو اٹھوا سکتے ہو“ یہ کہہ کر اپنے ایک پاؤں سے جوتا اتار کر اپنے آگے پھینکا اور کہا ”تم اس جوتے کو اٹھا لو تو میں الیکشن چھوڑ کر چلا جاؤں گا“ سردار کی نظریں جھک گئیں اور علامہ شہید سر بلند کیے واپس ہو لیے۔ فیض نے کہا ہے ۔

بہادری وہاں تک پہنچی
بزدلی نے جہاں سے جست کی

علامہ کی اس الیکشن میں کئی کئی گھنٹوں کی تقاریر آج تک اس حلقے کے لوگوں کے دلوں پر نقش ہیں۔ دراصل یہ جرأت صرف اس صورت میں ہی نصیب ہو سکتی ہے جب دل اور عقیدہ باہم ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔

ہر حال میں سچ لکھنا ہے

ضیاء شاہد روزنامہ ”خبریں“ کے ایڈیٹر اور معروف صحافی ہیں اور میں نے براہ راست یہ واقعہ ان کی زبانی سنا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”ایک روز ہم دوست بیٹھے تھے اور علامہ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ ان دنوں علامہ کی کئی کتب منظر عام پر آ چکی تھیں اور تنازعات ان کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ ہم سب علامہ کو ”دلیکچر“ دے رہے تھے کہ آپ یہ موضوعات ترک کریں، لوگ آپ کے دشمن ہو رہے ہیں، آپ کی جان خطرے میں ہے۔ سارے دوست بہت ہی اخلاص کے ساتھ حسب توفیق

اپنا اپنا موقف بیان کر رہے تھے اور انہیں نصیحت کر رہے تھے۔ علامہ خاموشی سے سنے جا رہے تھے۔ آخر میں نے کہا علامہ آپ بھی تو کچھ بولیے، کہنے لگے دوستو، میرے صرف ایک سوال کا جواب دو تم کیا سمجھتے ہو؟ میں جو لکھتا ہوں وہ سچ ہے یا جھوٹ؟ ہم نے کہا ہم سمجھتے ہیں آپ جو لکھ رہے ہیں وہ سچ ہے تو بولے ''پھر معاملہ ختم۔ میں سچ لکھوں گا جان کی کوئی پروا نہیں یہ آنی جانی چیز ہے۔'' اب ہم خاموش تھے۔

گارڈ رکھ کر کیا کرنا ہے

ممکن ہے آپ ان کے فلسفے اختلاف کریں لیکن امیر عبد اللہ روکڑی، نیو خان روڈ رند کے مالک، ایک روز ان سے ملنے آئے تو کتنے ہی گارڈ ان کے ہمراہ تھے۔ جب علامہ ان کے استقبال کے لیے باہر آئے تو دروازے پر گارڈ تھا نہ ان کے ہمراہ کوئی گن مین باہر آیا۔ امیر عبد اللہ روکڑی نے حیران ہو کر پوچھا ''آپ نے کوئی گارڈ تک نہیں رکھا ہوا؟''۔ تو علامہ احسان الٰہی ظہیر نے ان سے کہا: ''آپ کے بیس گارڈ آنے والی موت کو نہیں ٹال سکتے تو میں گارڈ رکھ کے کیا کروں گا۔''

☆......☆......☆

وہ اتنے دبنگ تھے کہ ایک بار گنپت روڈ (کاغذ مارکیٹ) پر واقع ایک دکان پر گئے انہیں اپنی کتاب ''القادیانیہ'' طبع کرنے کے لیے کاغذ کی ضرورت تھی۔ اس دکان کے مالک قادیانی عقیدے سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کے جاننے والے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا علامہ صاحب کیا چھاپنا ہے؟۔ آپ فوراً بولے ''تہاڈے خلاف اپنی کتاب چھاپنی اے۔''

جامعة المنتظر میں

''الشیعة والتشیع'' لکھ رہے تھے۔ ایک حوالے کی ضرورت تھی۔ ان کے

پاس وہ کتاب موجود نہ تھی اور جامعہ المنتظر (ماڈل ٹاؤن، لاہور) کی لائبریری میں موجود تھی۔ گاڑی نکالی اور سیدھے جامعہ المنتظر جا پہنچے۔ ہارن دیا۔ گارڈ نے گیٹ کھولا۔ وہاں کے شیعہ مہتمم بڑے حیران ہوئے۔ آمد کا مدعا دریافت کیا۔ فرمانے لگے "آپ کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہا تھا ایک حوالے کی تلاش تھی۔ لائبریری میں جانا چاہتا ہوں۔" انہوں نے لائبریری کھول دی۔ وہاں بیٹھے، اپنا کام کیا، واپس چلے آئے۔

اتنا دبنگ اور بارعب ہونے کے باوجود ان میں بذلہ سنجی خوب تھی۔ اپنی تقاریر میں عوام کو ساتھ لے کر چلتے۔ درمیان میں کوئی دل چسپ بات یا فقرہ کہتے جاتے اور عوام مسکراتے رہتے۔

ہر طبقہ فکر میں ہر دل عزیز تھے۔ سب سے دوستی اور پیار رکھتے، دوسروں پر تنقید کرتے لیکن توہین نہ کرتے تھے۔ تمام مکاتب فکر کے علماء، ڈاکٹر، پروفیسر، صحافی، دائیں اور بائیں بازو سے وابستہ افراد سب ان کی دوستی کا دم بھرتے، خوب کھلاتے اور اچھا کھلاتے، خود بھی کھاتے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ صحافی حضرات سیاستدانوں کی دایا ہوتے ہیں کہ ان کا کچا چٹھا سب جانتے ہیں۔ یہ پہلا سیاست دان تھا جس کی موت پر ہم نے صحافیوں کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا۔ جاوید جمال ڈسکوی سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک بار ڈسکوی نے علامہ کے بارے میں ناقدانہ انداز میں کالم لکھا۔ ڈسکوی کہتے ہیں: "میرا خیال تھا کہ علامہ ناراض ہوں گے۔ کچھ روز میں ان سے چھپتا رہا۔ ایک دن کمرے کے باہر سے آواز آئی "اوے ڈسکو کتھے اے" میں ڈر گیا۔ اندر آئے تو مسکرا رہے تھے "کوئی بات نہیں یار تم نے یاد تو رکھا، ہمارے بارے میں لکھا تو سہی۔"

☆......☆......☆

(مولانا) محمود احمد رضوی لاہور کے بریلوی علماء میں ایک نمایاں مقام کے حامل

تھے۔ حضرت علامہ سے ان کی بے تکلفی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے ہمراہ لاہور سے باہر کسی کام سے جا رہے تھے۔ مولانا رضوی کے ساتھ ان کا اچھا تعلق تھا۔ راستے میں بابا چھتری والے کا مزار آ گیا۔ بابا چھتری والا معروف معنوں میں طبقہ صوفیا سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ اہل تصوف میں ایسے مجذوبانہ انداز واطوار والے افراد کو صاحب معرفت سمجھا جاتا ہے۔ دین دنیا سے دور کشمیری النسل یہ بابا فوت ہو گیا تو لوگوں نے اس کا مزار بنا دیا۔ اس کے مزار کے پاس سے گزرتے ہوئے علامہ نے بریک لگا دی۔ انہوں نے کہا ''رضوی صاحب سلام کر لیں پھر آگے چلیں گے''۔ مولانا رضوی ہنسنے لگ گئے۔ یوں ایک لطیف پیرائے میں مولانا کے سامنے چند معاملات کھول کر رکھ دیئے۔

کارکنان کی عزت افزائی

اپنے کارکنان کی عزت نفس کا بہت خیال کرتے۔ لارنس روڈ مرکز کی تعمیر کا آغاز ہونے کو تھا۔ اس وجہ سے جماعت کے دفاتر 50 لوئر مال روڈ پر واقع ان کی ذاتی بلڈنگ میں منتقل ہو چکے تھے۔ دیواروں پر تازہ سفیدی کروائی گئی تھی۔ کسی صاحب کا قلم نہیں چل رہا تھا۔ انہوں نے اپنا قلم رواں کرنے کے لئے ''چھڑکا'' تو سفید براق دیوار پر نیلے ستارے بنتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں علامہ شہید آ گئے۔ آپ کی طبع نازک پہ ستاروں کی یہ کمان بہت گراں گذری۔ آپ نے سب ملازمین کو خوب ڈانٹا۔ اب سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ اس بات کو آپ نے بھی محسوس کیا۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اب آپ کی طبیعت پر بھی بوجھ پڑ گیا تھا۔ سب کو اپنے کمرے میں بلایا اور پیار سے صفائی اور نظم وضبط کے بارے میں سمجھانے لگے۔ یہ بھی کہا کہ ''بیٹا دیکھو تم لوگوں سے تو میں نے بہت سی توقعات باندھ رکھی ہیں۔ اگر تم ہی نظم وضبط کا خیال نہ رکھو گے تو ہم کیسے ترقی کریں گے۔'' اس پیار بھرے لہجے نے دل کے بوجھ ختم کر دیئے۔ اب آپ کی آنکھوں میں بھی ستارے جھلملا رہے تھے اور پھر سب کو فالودہ کھلانے کا حکم دیا۔ ایک

ڈانٹ کا کتنا خوبصورت اختتام تھا۔

وقت کی قدر

معروف صحافی محبوب جاوید کے ساتھ اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں ’’میں وقت کے ہر لمحے سے کچھ نہ کچھ چھین لینے کی فکر میں رہتا ہوں‘‘ اور دیکھئے اس مختصر زندگی میں انہوں نے دنیا بھر کے بیشتر ممالک کا سفر کیا، نو سال کی عمر میں حفظ مکمل کیا اور تقریباً سینتیس سال ’’مصلیٰ‘‘ سنایا۔ جب مدینہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، تب بھی دوستوں کا گروپ بنا کر مصلیٰ سناتے رہے۔ عربی خطابت کے بارے میں تو ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کا یہ جملہ ہی کافی ہے ’’لوگ مجھے عالم عرب کا سب سے بڑا خطیب کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بڑے خطیب ہو‘‘ یا نوابزادہ نصر اللہ خان کا یہ جملہ کہ ’’آپ پاکستان کے سب سے بڑے خطیب ہیں جو کسی بھی عنوان پر فی البدیہہ گفتگو کر سکتے ہیں‘‘ اپنے موضوع پر حرف آخر ہے۔ پندرہ کے قریب کتب لکھیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئیں، بے شمار دوست بنائے اور سب کا دل اپنی مٹھی میں بند رکھا۔

اس تحرک کی مثال دیکھئے، قوت عمل اور تیزی کی انتہا ملاحظہ فرمایئے! عطاء الرحمان شیخوپوری (مرحوم) جو کہ مولانا محمد حسین شیخوپوری (رحمہ اللہ) کے فرزند ارجمند تھے وہ نوائے وقت میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ’’میں حضرت علامہ شہید کے ساتھ مصر کے دورے پر گیا۔ مصر میں ان کی کتاب ”الشیعہ والسنہ“ کے جواب میں ایک شیعہ عالم نے کتاب لکھی۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید نے اس جواب کو دیکھا اور وہیں اس کا جواب الجواب لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مصری دوست کی لائبریری میں بیٹھ گئے اور جواب لکھنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ اس کی کمپوزنگ شروع کرا دی۔ دونوں کام ختم کرا کے اس کی طباعت کا انتظام کیا۔ اس طرح اس پندرہ روز

کے دورے میں تقریباً تین سو صفحات کا جواب لکھ کر طبع کرا کے اور پھر سارا ایڈیشن فروخت کر کے واپس آئے۔''

اندازہ کریں ان کی قوت عمل کا۔ یہ واقعہ علامہ شہید نے خود بھی ایک تقریر میں مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ ان کی اس کتاب کا نام ہے ''بین الشیعہ واہل السنہ۔''

انتہائی نفیس انسان تھے

علامہ شہید طبعی طور پر نہایت نفیس آدمی تھے۔ ہمیشہ خوشبو سے معطر رہتے۔ آج تک ان کی خوشبو اپنے وجود کا پتہ دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی وہ گزرے ہیں جگر مرادآبادی کا یہ شعر نواب زادہ نصر اللہ خان نے ان کے بارے میں پڑھا تھا اور دیکھئے کیسا حسب حال ہے۔ ؏

وہ کب کے آئے بھی، اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

غالب نے بھی تو کہا تھا...... ؏

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

جب بھی گھر سے باہر جاتے، لباس تبدیل کر کے جاتے۔ ایک دفعہ کہنے لگے ''اپنے دو ہی تو شوق ہیں، اچھی گاڑی اور اچھا لباس۔''

☆......☆......☆

ایک بار چند صحافی دوستوں کے ہمراہ رائے ونڈ کی طرف کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں گنے کے رس کی ریڑھی تھی۔ سب نے علامہ صاحب سے فرمائش کی کہ ''علامہ صاحب رَوتے پیا دیو'' علامہ صاحب نے گاڑی روک لی اور سارے اصحاب گنے کا رس پینے لگے۔ اسی دوران تھوڑا سا ''رس'' علامہ کے کپڑوں پر گر گیا۔ علامہ کی

طبیعت اتنی حساس تھی کہ وہاں سے واپس گھر آئے، آ کر کپڑے بدلے اور تب دوبارہ عازم سفر ہوئے۔

ڈاکٹر محمد اکرام بیان کرتے ہیں کہ "علامہ شہید جب ہسپتال میں شدید زخمی تھے۔ انہوں نے پانی مانگا۔ میں ان کے لیے پانی لے کر آیا۔ ان کی نگاہ گلاس کے کنارے پہ پڑی۔ جس پہ کچھ داغ تھا۔ ایسے حالات میں کہ جب ان کا نصف چہرہ زخمی تھا، تب بھی نظر کی تیزی اور طبیعت کی نفاست کا یہ عالم تھا کہ علامہ نے کہا "گلاس تبدیل کر کے لاؤ۔ اس پر داغ لگا ہوا ہے۔"

امام اہل السنۃ

عرب میں علامہ شہید کا کتنا تعارف اور کتنی عزت تھی، اس کا اندازہ یہاں کم ہی لوگوں کو ہے دبئی میں مولانا کرم الدین سلفی کے بیٹے تقی الدین قیام پذیر ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان تشریف لائے، علامہ شہید کے حوالے سے بات چل نکلی۔ اپنا ذاتی واقعہ سنانے لگے۔ آیئے ان کی زبان سے سنتے ہیں:

> "میں ایک دفعہ شارجہ سے دور مضافات میں تھا۔ ایک چھوٹے سے قصبے میں گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی کتابوں کی دکان پر نظر پڑی تو میں رک گیا۔ اس سے تقاریر کی فہرست طلب کی کہ آپ کے پاس علماء کے دروس کی ریکاڈنگ کونسی ہیں۔ میں علامہ شہید کی عربی تقاریر تلاش کر رہا تھا۔ مجھے فہرست میں دکھائی نہ پڑیں۔ میرے چہرے پر مایوسی کے اثرات تھے۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس نے سوال کیا کہ میں کیا تلاش کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا یہ علامہ شہید کے بارے میں کیا جانتا ہو گا۔ اس دور دراز کے چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے ٹال دیا کہ ایک غیر عرب عالم کی تقریر کی تلاش تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے بتایا کہ مجھے استاذ

احسان الٰہی ظہیر کی ریکارڈنگ چاہئے۔ اس پر وہ عرب اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ چہرہ آسمان کی طرف بلند کر کے ان کے لیے دعائے مغفرت کے الفاظ کہتے ہوئے مجھے مخاطب ہوا۔ ''استاذ احسان مت کہو، امام اہل السنہ کہو'' اور بتایا کہ میرے پاس ان کے دو خطبات ہیں۔

تنقید کو برداشت کرنے کا عجیب حوصلہ

سیدنا امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب خلیفۃ المسلمین بنایا گیا تو ان کے مزاج میں بہت تیزی تھی لیکن وہ وقت بھی آیا کہ جب خلافت کا بار ان کے کندھوں پر لاد دیا گیا تو ان سے برسر مجلس چادر کا سوال کیا جاتا ہے۔ درہ اٹھتا ہے نہ تلوار نکلتی ہے۔ سر جھکا کر اپنے بیٹے سے جواب کی استدعا کرتے ہیں۔ ایسے ہی علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کو جب قیادت کا بار اٹھانا پڑھا تو وہ یوں موم ہو چکے تھے کہ وہ دوست جو پرانے احسان الٰہی ظہیر کو جانتے تھے، انہیں یہ سب ناقابل یقین لگتا۔

انگریزی زبان کے محاورے کا ترجمہ ہے ''پہلا تاثر ہی آخری ہوتا ہے'' جناب مولانا اسحاق بھٹی صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ کے لیے اپنے مخالف بات برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ دیکھیے وقت بندے کو کیسے بدل دیتا ہے...... جمعیت اہل حدیث کی عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا اور چند روز پہلے ہی مجیب الرحمٰن شامی نے ایک تند و تیز اور طنزیہ کالم لکھا تھا۔ باوجود دوستی اور قربت کے علامہ پر تنقید کم اور استہزاء زیادہ تھا۔ اب عاملہ کا اجلاس جاری تھا اور علمائے کرام اپنے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے رائے دی کہ روزنامہ جنگ کے مالک کو خط لکھ کر احتجاج کرنا چاہیے۔ دوسرے صاحب ذرا زیادہ جوش میں آ گئے۔ کہنے لگے ہمیں روزنامہ جنگ کے سامنے مظاہرہ کرنا چاہیے۔

غرض اپنے اپنے جذبات تھے۔ علامہ مسکراتے ہوئے سب کی سنتے رہے۔ جب

ان کی باری آئی تو انہوں نے اہل مجلس سے پوچھا "آپ سارے لوگ بتائیں کہ اس ملک میں کیا ایسے افراد نہیں ہوں گے جو جنرل ضیاء الحق کے معتقد اور محبّ ہوں؟ ان کو تو چاہیے کہ مجھے گولی مار دیں کیونکہ میں تو ہر جلسے اور تقریر میں جنرل ضیاء الحق کی گرفت کرتا ہوں۔" پھر کہنے لگے "حضرات دیکھیے جب ہم کسی پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں بھی ہر لمحے اپنے اوپر تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اس تربیت کا فیضان تھا کہ چند سال بعد لکشمی چوک میں مجیب الرحمٰن شامی اور عبدالرشید قمر کھڑے تھے کہ ہم دوست بھی ادھر آ نکلے۔ علامہ نے چند روز پہلے ہی موچی دروازے میں بہت بڑا...... جی ہاں! بہت ہی بڑا جلسہ کیا تھا اور ہم سارے دوست اس نشے میں تھے اور ان دنوں ذرا جھوم کے نکلتے تھے کہ شامی صاحب نے ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر چھیڑنا چاہا۔ جلسے کا ذکر کر کے کہنے لگے "ہاں اچھی دکان داری تھی"۔ اگر چند سال پہلے یہ بات کرتے تو ہم بگڑ جاتے۔ مگر میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ جی تھی تو دکان داری مگر نفع سارا جماعت کے لیے تھا۔ اپنی ذات کے لیے تو کچھ بھی نہ تھا۔

نرم دل احسان الٰہی ظہیر

طبیعت کی نرمی کی بات بھی پڑھ لیجیے۔ ایک مولوی صاحب علامہ شہید سے ملنے آئے اور جلسے کے وقت کے لیے اصرار کرنے لگے۔ انہوں نے انکار کیا کہ مصروفیت ہے۔ وہ صاحب مصر تھے۔ ان کی ضد سے تنگ آ کر انہیں ڈانٹ دیا تو وہ بوجھل دل سے رخصت ہو گئے۔ ادھر وہ گھر سے نکلے ادھر علامہ شہید بے چین ہو گئے کہ یہ مناسب نہیں ہوا۔ مولانا شمشاد سلفی موجود تھے، انہیں پیچھے دوڑایا کہ انہیں واپس لے کر آؤ۔ بصد مشکل مولانا سلفی ان صاحب کو واپس لے کر آئے۔ علامہ لائبریری میں ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے "مولوی صاحب معاف کر دو۔" مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غریب ورکر کو اس "امیر اور تلخ" بندے نے اتنی

عزت دی تھی کہ وہ آج بھی اسے یاد کر کے روتا ہے۔ خواجہ فرید نے سینکڑوں برس پہلے کیا خوبصورت بات کہی تھی ؏

پردیس گیوں پردیسی ہویوں
تے تیریاں نت وطناں ول لوڑاں
کملی کر کے چھوڑ دیتا او
تے میں لکھ گلیاں دے رولاں

اگر کبھی دفتر کے ملازمین اور جماعتی کارکنان کو ڈانٹ دیتے تو سب کے منہ لٹک جاتے۔ لٹکے چہروں کو دیکھ کر ان کا دل بھی شاید مٹھی میں آ جاتا۔ کسی شفیق باپ کی طرح پھر سب کو اکٹھا کر کے فالودہ کھلاتے، ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور سب کے مزے ہو جاتے۔

باجوہ صاحب آپ کا احسان ختم ہو گیا

علامہ شہید پر ''مرد مومن مرد حق'' ضیاء الحق کے دور میں ایک مقدمہ بن گیا۔ وہ رفیق باجوہ ایڈوکیٹ کے پاس چلے گئے کہ ان کے دوست تھے۔ انہوں نے وکالت کے لیے منظور کر لیا۔ جب علامہ نے فیس کا پوچھا تو رفیق باجوہ کہنے لگے ''علامہ صاحب ہم آپ سے فیس لیتے اچھے لگیں گے؟''۔ پھر باجوہ صاحب نے اپنے میز کی دراز سے ایک مقالہ نکالا اور کہنے لگے ''علامہ صاحب یہ میں نے لکھا ہے، ذرا سنیں'' اور سنانا شروع کر دیا۔ اب علامہ سننے پر مجبور تھے اور آپ تو جانتے ہیں کہ اہل علم دوسروں کا لکھا پڑھ تو سکتے ہیں، سننا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال اس مشکل سے سرخرو ہوئے لیکن یہ کہتے ہوئے کہ ''باجوہ صاحب اب آپ کا فیس نہ لینے کا احسان برابر ہو گیا۔''

مولانا عبداللہ گورداس پوری اور علامہ شہید

مولانا محمد عبداللہ گورداس پوری رحمہ اللہ باغ و بہار شخصیت تھے۔ محفل کو اپنی پر لطف

باتوں سے سجائے رکھتے۔ 2010ء میں مولانا مکتبہ قدوسیہ تشریف لائے تھے۔ تب انہوں نے یہ واقعہ سنایا تھا اور میں نے ان کی زندگی میں لکھ لیا تھا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید آپ کی نہایت عزت کرتے تھے۔ آپ بھی ان پر شفقت فرماتے۔ مولانا بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے علامہ سے ایک بار جلسے کا وقت لیا اور انہیں لے جانے کے لیے خود لاہور تشریف لائے۔ مولانا نے لاہور آ کر انہیں فون کیا تو علامہ نے کہا آپ لوہاری دروازے کے باہر نعمت کدہ ہوٹل ہے، وہاں تشریف لے آئیں۔ وہاں سے گاڑی کرایہ پر ملتی ہے، وہ لے کر چلتے ہیں۔ مولانا نعمت کدہ ہوٹل پہنچ گئے۔ علامہ بھی آ گئے اور دونوں اکٹھے بورے والا کے لیے چل دیئے۔

رات بورے والا میں جلسہ ہوا اور علامہ نے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ مولانا نے انہیں بہتیرا منع کیا کہ رات کا پچھلا پہر ہے، آپ سفر نہ کریں۔ لیکن علامہ نے سفر کرنے کو ترجیح دی۔ دراصل علامہ کا معمول تھا کہ وہ کہیں بھی ہوتے، رات کو گھر واپس آنے کو ترجیح دیتے اور یہی معمول ان کے بیٹے حافظ ابتسام الٰہی ظہیر کا ہے۔ اب علامہ وہاں سے چل پڑے، خانیوال جانا تھا اور وہاں سے لاہور واپسی تھی۔ راستے میں گاڑی کے ڈرائیور کو اونگھ آ گئی اور گاڑی نہر میں جا گری۔ اس حادثے میں ڈرائیور جاں بحق ہو گیا۔ جبکہ علامہ اور ساتھی تیر کر باہر نکل آئے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اس حادثے کو استعمال کرتے ہوئے الٹا علامہ پر ڈرائیور کے قتل کا مقدمہ بنا دیا۔

چند دن بعد مولانا پھر لاہور تشریف لائے کہ علامہ کی خیریت معلوم کر سکیں۔ علامہ بذلہ سنج آدمی تھے۔ مولانا کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا ''او میرے قاتل آ گئے'' جواباً مولانا کہاں چوکتے فوراً جواب دیا ''آرام سے بیٹھ او زندہ شہید!''

دیکھیے اللہ نے پھر علامہ کو شہادت کی موت عطا کی۔ مولانا عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ علامہ اچھا کھاتے اور اچھا ہی کھلانے والے انسان تھے۔ اوکاڑہ میں ایک

جنازے پر گئے۔ جنازے سے فارغ ہو کر یا شاید ابھی جنازہ ہونے میں کچھ وقت تھا کہ مولانا کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے گئے۔ایک ہوٹل لے جا کر کھانا کھایا۔ جب کھانے کا آرڈر دیا تو خاصا زیادہ اور پر تکلف تھا۔مولانا کہنے لگے ''یار احسان ہم جنازے پر آئے ہیں، شاید تمہیں یاد نہیں۔'' علامہ کہنے لگے ''بابا جی بھوکے تو رویا بھی نہیں جاتا۔'' اور مولانا سے فرمایا آپ نے بورے والا نہیں جانا، میرے ساتھ لاہور جانا ہے اور زبردستی مولانا کو لاہور لے آئے۔ لاہور آ کر اپنی اہلیہ سے فرمایا ''آپ کے والد محترم کے دوست تشریف لائے ہیں۔ان کے لیے بستر کا انتظام کروا دیجیے۔'' مولانا فرماتے ہیں ''میرے لیے بستر بچھوا کر علامہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ پھر قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔ مولانا کا بیان ہے رات کے پچھلے پہر اٹھ کر تہجد پڑھنے لگے اور میرا اس بنا پر گمان ہے کہ وہ تہجد گزار تھے۔''

مولانا عبداللہ نے ایک بہت خوبصورت بات فرمائی کہ ''علامہ سٹیج کے بادشاہ تھے۔ ان کے مخالف ان کے مقابلے میں گونگے تھے اور یہ بات ہی ان کی مخالفت کا سبب تھی۔''

''بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا''

یہ ان کی زندگی کی آخری عید قربان تھی۔ اس سے چند روز پہلے جمعیت کے دفتر لارنس روڈ پر ایک اجلاس میں انہوں نے پروگرام بنایا کہ قربانی کی کھالیں اہل حدیث کے اپنے پلیٹ فارم سے جمع کی جائیں۔ چونکہ عید میں دن بہت کم تھے، اس لیے بہت منظم اور مربوط پروگرام تو تشکیل نہ پا سکا لیکن اس کام کی ابتدا ہو گئی۔ مرکزی دفتر میں عید کا دن قربان کر کے کون بیٹھے گا؟ اس کے لیے ہم تین دوست تیار ہو گئے۔ ایک میں تھا، دوسرے دو ساتھی چونگی امر سدھو کے حافظ ذوالقرنین اور محمد ایوب تھے۔ دونوں ہی بڑے فعال اور پر جوش تھے۔

نمازِ عید حسب معمول منٹو پارک میں ادا کی۔ جہاں علامہ شہید نے اس فیصلے کا اعلان کیا اور یہ بھی بتایا کہ اس سلسلے کا مرکزی کیمپ 53 لارنس روڈ لگایا گیا ہے۔ نماز پڑھ کر ہم تینوں دوست وہاں پہنچ گئے اور لگے انتظار کرنے کہ اب کوئی کھال اتری اور ادھر آئی۔ آخر امید بر ہی آئی اور کہیں سے کوئی کھال اتر کر ہماری طرف چلی آئی۔ چند کھالیں اکٹھی ہو چلی تھیں اور سورج بھی بلند ہو چکا تھا۔

ہم تینوں دوست اب بھوک محسوس کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی سڑک سے گزرتی تو احساس ہوتا کہ ہمارے علاوہ بھی اس علاقے میں زندگی موجود ہے۔ اب اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ نہ اطراف میں کوئی ہوٹل نہ ہمارے پاس کوئی سواری، اس بھوک کا کیا کیا جائے؟ ہم انہی خیالوں میں تھے کہ اچانک ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی گاڑی جو علامہ شہید چلا رہے تھے، گیٹ میں داخل ہوئی۔ سوچا کہ دیکھنے آئے ہوں گے کہ کتنی کھالیں اکٹھی ہوئیں۔ لیکن جب وہ گاڑی سے نکلے تو ان کے ہاتھ میں کھانے کا تین منزلہ ڈبہ تھا اور چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ۔ ”میں نے سوچا تم لوگ بھوکے ہو گے، پہلے تمہیں کھانا پہنچا آؤں“ ہماری آنکھیں بھیگ رہی تھیں کہ کسی نوکر کو بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ ہمیں بھی فون پر حکم دیا جا سکتا تھا کہ بھئی پیدل کا راستہ ہے، ایک بندہ آ کر گھر سے کھانا لے جائے۔ خود کیوں آئے۔

میں پچیس سال بعد یہ واقعہ لکھ رہا ہوں اور آج پھر آنکھوں میں پانی اتر رہا ہے۔ شاید میری زندگی کا وہ بہترین کھانا ہوگا۔ علامہ آپ نے ہماری زندگی اپنی محبتوں کا اسیر بنا کر بہت مشکل بنا دی ہے۔

ہمیں کھال اتارنا نہ آئی

کھالیں بس مناسب سی اکٹھی ہوئیں لیکن ہماری توقع سے پھر بھی زیادہ تھیں۔ البتہ یہ ضرور اندازہ ہو گیا کہ کھالیں اکٹھی بھی وہ ہی زیادہ کر سکتے ہیں جنہیں کھال

اتارنے کا فن آتا ہے اور علامہ شہید کا یہ پہلو خاصا کمزور تھا نہ وہ روایتی مولوی تھے نہ چندہ اکٹھا کرنے کا فن انہیں آتا تھا۔ اگلے سال جب عید قربان آئی تو وہ اس دنیا میں نہ تھے اور ان کے قریبی ساتھی بھی اس فن میں بس ایسے ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب لارنس روڈ کے معاملات چل رہے تھے علامہ شہید نے ارادہ کیا کہ کویت کی جماعت کے پاس کسی کو بھیجا جائے تا کہ کچھ رقم مہیا ہو سکے۔ قرعہ فال میرے والد مولانا عبدالخالق قدوسی اور قاری محمد ادریس عاصم حفظہ اللہ کے نام نکلا۔

اب مسئلہ درپیش آیا کہ جمعیت کی کوئی خوبصورت سی رسید بک ہونی چاہیے۔ علامہ نے اپنے دوست اور مشہور خطاط عبدالرشید قمر کو فون کیا کہ جمعیت کی رسید بک تیار کرنی ہے۔ انہوں نے پوچھا کوئی ڈیزائن کوئی عبارت تو دیجیے حضور۔ آپ بے ساختہ بولے کہ ''پاکستان کے کسی سب سے بڑے ''چندے باز'' کی رسید بک کا تتبع کر لیں۔'' ایک قہقہہ بلند ہوا اور چند دن میں رسید بک تیار ہو گئی۔ اب کس چندے باز کی اتباع کی گئی، یہ میں نہیں بتاؤں گا۔

لوگ جملوں کا مزہ کہاں لیتے ہیں کہ مزاج نازک ہیں۔ جناب اسحاق بھٹی صاحب کے حالات پر ایک کتاب ہمارے مکتبے سے شائع ہوئی۔ اس کے ٹائٹل پر لکھا تھا ''مورخ اہل حدیث محمد اسحاق بھٹی۔'' بھٹی صاحب نے انکساری سے مجھے کہا کہ مورخ اہل حدیث لکھنا کوئی ضروری تو نہیں تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو بدل کر کے ''مورکھ اہل حدیث'' کر دیتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ گستاخی ہے۔ ممکن ہے نازک مزاج بزرگوں کے ہاں ایسا ہی ہو لیکن بھٹی صاحب کا قہقہہ مجھ سے بھی بلند تھا اور اُن کی محبت آج بھی ویسے ہی ہے اور ہمارا احترام پہلے سے سوا۔ ہاں لوگ جملوں کا مزہ کہاں لیتے ہیں۔

علامہ شہید طبیعت کے سادہ تھے، نہیں جانتے تھے کہ چندے بازی الگ فن ہے

جس میں رسید بک محض ایک پرزہ ہے۔ نتیجہ بھی ویسا ہی آنا تھا۔ دو شریف سے بندے یعنی قاری محمد ادریس عاصم اور میرے والد مولانا عبدالخالق قدوسی کویت گئے اور صرف 33 فیصد نمبر لے کر مشکل سے پاس ہو کر آئے اور یہ چندہ مہم تقریباً ناکام ''واپس'' آئی۔ اس کے بعد علامہ شہید نے بھی ان معاملات پر زیادہ توجہ نہ دی اور جمعیت کا خرچ ان کی ذاتی جیب اور ان کے ذاتی احباب کے تعاون سے چلتا رہا۔

بہترین جملہ تھا جو میں نے قاضی مقبول احمد صاحب سے سنا کہ پچھلے دنوں علامہ شہید کے حوالے سے ایک صاحب نے ایک ناقدانہ پمفلٹ شائع کیا۔ قاضی مقبول احمد میرے مکتبہ پر تشریف لائے، آپ علامہ شہید کے قریبی ساتھی تھے اور اس وقت جتنے لوگ زندہ ہیں، ان میں سے کوئی بھی قاضی صاحب جتنا باخبر نہیں۔ میں نے جب اس پمفلٹ کے مندرجات قاضی صاحب کے گوش گزار کیے تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ ''جماعت نے علامہ کو دیا کیا تھا کہ جس کا سوال کیا جائے۔ ساری زندگی تو وہ جماعت کو دیتے رہے۔''

آغاز شباب کا ایک واقعہ

رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے منعقدہ کسی تقریب میں بہت سے شیوخ جمع تھے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ جناب خلیل حامدی بھی موجود تھے۔ انہیں آپ کے احساسات کا اندازہ نہ تھا۔

حامدی صاحب نے جوش میں آ کر کہہ دیا کہ جماعت اسلامی ہی پاکستان میں امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی دعوت کا علم بلند کیے ہوئے ہے۔ علامہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ گرجدار آواز میں شیوخ کو مخاطب کیا اور فرمانے لگے ''مجھے حامدی صاحب کی بات سے اختلاف ہے۔ جماعت اسلامی اتنے بڑے مرکز کی مالک ہے، وسائل کی فروانی ہے حامدی صاحب بتلائیں کہ کیا ان کے مرکز کی طرف سے کوئی چھوٹا سا بھی کتابچہ امام محمد

عبدالوہاب رحمہ اللہ یا ان کی دعوت کے متعلق شائع ہوا ہے؟ یہ جماعت تو پاکستان میں توحید وسنت کی طرف دعوت دینے کو ''فرقہ واریت'' تعبیر کرتی ہے۔

شیخ الاسلام امام محمد عبدالوہاب کی دعوت کی نشر واشاعت کا بیڑہ ان لوگوں نے اٹھا رکھا ہے جنہیں پاکستان میں ''وہابی'' کہا جاتا ہے اور وہ اہل حدیث ہیں۔ ابن عبدالوہاب اور توحید باری تعالیٰ پر جتنا موثر لٹریچر بھی پاکستان میں دستیاب ہے، وہ اہل حدیث حضرات ہی کی کوشش وکاوش کا مرہون منت ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ حامدی صاحب کھسیانے ہو گئے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

علامہ صاحب تسیں سچ کہندے او

علامہ احسان الٰہی ظہیر فرصت کے اوقات میں جناب نواب زادہ نصراللہ خان صاحب کی ''محفل سیاست'' کو رونق بخشنے کے لیے اکثر اوقات تشریف لے جاتے تھے۔ آپ اس خالص سیاسی ماحول میں بھی مسلک اہل حدیث کی حقانیت وصداقت اور تاریخ وہابیت کے کارہائے نمایاں بیان کرنے کے لیے موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایسی ہی ایک مجلس میں بہت سے سیاسی زعماء موجود تھے۔ ان میں سابق نگران وزیراعظم پاکستان اور مشہور سیاسی راہنما معراج خالد بھی تھے۔

علامہ نے سلسلۂ گفتگو کو وہابی تاریخ کی طرف موڑتے ہوئے چند تاریخی واقعات کا ذکر کیا تو ملک معراج خالد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے کن الفاظ میں حضرت علامہ کی تائید کی، یہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ملک صاحب کہنے لگے:

''علامہ صاحب! تسیں بالکل سچ کہندے او، جے برصغیر دی تاریخ چوں وہابیت نوں کڈھ دتا جائے تے سوائے بت پرستی دے ساڈے کول کجھ نئیں رہ جاندا۔''

علامہ صاحب آپ بالکل سچ کہتے ہیں اگر برصغیر کی تاریخ میں سے وہابیت کو خارج کر دیا جائے تو سوائے بت پرستی کے ہمارے پاس کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔

اور ہم فاتح کی حیثیت سے نکلے

علامہ شہید کے معاون عطاء الرحمٰن ثاقب مرحوم بیان کرتے ہیں کہ "ایک دفعہ مجھے اپنے استاد قائد مرحوم کے ہمراہ ریاض میں ندوۃ الشباب کی کسی میٹنگ میں جانے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ رحمہ اللہ کے برادر اصغر ڈاکٹر فضل الٰہی جو ریاض یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، بھی ساتھ تھے۔ مذکورہ ادارے کے سربراہ سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی، حال احوال دریافت کرنے کے بعد سلسلہ کلام کا آغاز ہوا۔ بات سے بات نکلی۔ ادارے کے رئیس نے آپ کے اسلوبِ تحریر پر کوئی اعتراض کر دیا۔ آپ جلال میں آ گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ فصیح عربی میں علوم و معارف کے موتی بکھیرتے رہے۔ میزبان کی یہ کیفیت تھی کہ ہاتھ کا سہارا لے کر سر کو ایک طرف جھکائے قائد رحمہ اللہ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور "نعم، طیب" وغیرہ جیسے کلمات سے اپنی غلطی کا اعتراف اور آپ کے موقف کی تائید کرتا رہا۔ میزبان نے اور بھی کئی مواقف میں آپ سے اختلاف کیا مگر گفتگو کے اختتام پر وہ قائد عالم اسلام کی عظمت کا معترف اور اپنی "اخوانی" سوچ سے تائب ہو چکا تھا ...... اور جب ہم اس دکتور کے کمرے سے باہر نکلے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ایک عظیم فاتح کی سربراہی میں کسی دوسرے علمی و نظریاتی محاذ پر کسی اور مخالف کو فکری شکست دینے جا رہے ہیں۔"

و اللہ انک لمجاھد الاسلام

اسی طرح وہ مزید لکھتے ہیں: "مدینہ یونیورسٹی میں جب بھی آپ تشریف لے جاتے، عرب و غیر عرب تمام طلبہ اپنے قائد کی زیارت اور ملاقات کو اپنی تمام مصروفیات پر ترجیح دیتے اور آپ کے گرد ہمہ وقت پوری دنیا کی نمائندگی کرنے والے ہونہار طلبہ کا تانتا لگا رہتا ...... یہ منظر ہر اہل حدیث کے لیے بے حد خوشی کا باعث ہوتا۔ عرب طلبہ ایک عجمی کے سامنے بیٹھے ہوئے علمی پیاس بجھا رہے ہیں ...... کوئی تشیع کے متعلق آپ

سے آ گاہی حاصل کر رہا ہے اور کوئی بریلویت کی باتیں سن سن کر لاحول پڑھ رہا ہے...... کوئی قادیانیت کی سازشوں سے نقاب اٹھتے ہوئے دیکھ رہا ہے اور کوئی اسماعیلیوں کے عزائم سے مطلع ہو رہا ہے غرضیکہ ایک شمع روشن ہے اور ہر ایک اپنی بساط و استعداد کے مطابق روشنی حاصل کیے جا رہا ہے۔

ایک دفعہ آپ کسی بازار سے گزر رہے تھے...... ایک شخص (جنہوں نے بعد میں بتایا کہ وہ کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں) نے آپ کو روک لیا اور پوچھا "**لعلك احسان الٰهی ظهیر؟**" شاید آپ ہی کا نام احسان الٰہی ظہیر ہے؟ تصدیق ہو جانے پر بڑی عزت و احترام سے آپ رحمہ اللہ کا ہاتھ دبایا اور کہنے لگا "**و الله! انك لمجاهد الاسلام تجاهد شر أعداء الله فی الأرض**" "واللہ! آپ مجاہد اسلام ہیں، آپ اللہ تعالیٰ کے بدترین دشمنوں سے جہاد کر رہے ہیں" اور پھر ڈھیر ساری دعائیں دیں اور رخصت ہو گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قائد سے مل کر گویا اس کی زندگی کی بہت بڑی آرزو پوری ہو گئی ہو اور وہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب محسوس کر رہا ہو۔"

هاهنا و اللّٰه! شابّ

علامہ غیر ممالک میں بہت بڑے علمی و تحقیقی سکالر کی حیثیت سے معروف تھے۔ آپ رحمہ اللہ کے اسلوب تحریر کی پختگی اور کثرتِ تصانیف کی بنا پر اکثر معتقدین یہ تصور کرتے تھے کہ استاذ احسان الٰہی ظہیر کوئی معمر شخصیت ہیں۔ کسی کے تصور میں بھی نہ ہوتا کہ یہ علمی و فکری ورثہ کسی جواں سال شخص کی محنت و کاوش کا ثمرہ ہے۔ ایک دفعہ آپ ریاض کے ایک ہوٹل فندق قصر الریاض میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چند کویتی طلبہ نے آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ قائد مرحوم نے فرمایا کہ 5 بجے شام ہوٹل کی لابی Loby میں آ جائیں...... میں بھی وہاں ہوں گا...... ملاقات ہو

جائے گی ...... چنانچہ مقررہ وقت پر چند کویتی اور امریکی طلبہ ہوٹل پہنچ گئے ...... انہوں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ...... قائد مرحوم اپنے کمرے سے نیچے اترے ...... لابی میں پہنچے ...... اور ان طلبہ کے سامنے سے گزر گئے ...... قائد مرحوم کو شک تو گزرا کہ یہی وہ طلبہ ہیں جن سے فون پر بات ہوئی تھی مگر خود انہیں مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا ...... ادھر کیفیت یہ تھی کہ وہ کسی سفید ریش معمر شخصیت کا خاکہ ذہن میں تصور کیے اپنے آئیڈیل کی انتظار میں تھے ...... اسی تردد میں کچھ وقت گزر گیا ...... قائد مرحوم دو تین بار ان کے سامنے سے گزرے ...... بالآخر ان میں سے ایک نے ہمت کی اور آپ سے پوچھا تـعـرف الشيـخ احسان الٰهی ظهير هو أيضا باكستانی مقيم فی هذا الفندق ''کیا آپ شیخ احسان الٰہی ظہیر کو جانتے ہیں؟ وہ بھی (آپ کی طرح) پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

یہ سن کر آپ مسکرائے اور فرمانے لگے أنا هو ''میرا نام ہی احسان الٰہی ظہیر ہے'' ...... یہ سننا ہی تھا کہ کورس کی شکل میں فضا ماشاء اللہ کی آواز سے گونج اٹھی۔ پھر عالم یہ تھا کہ وہ طلبہ آپ رحمہ اللہ سے مصافحہ کرتے جاتے اور ''مـاشـاء الـلـه شابٌ'' [1] کہہ کر حیرت و استعجاب کا اظہار کیے جاتے۔

اس کا تو ڈاڑھی بہت چھوٹا ہے

علامہ کی ذات کا سب سے متنازعہ پہلو ان کی مختصر اور تراشیدہ ڈاڑھی تھا۔ کتاب و سنت کی مخالفت ...... اور وہ بھی ایک بڑے آدمی کی طرف سے یہ وہابیوں کو ہضم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے آپ کی ڈاڑھی عموماً ہدف تنقید رہتی تھی۔ مگر آپ کی خوبی یہ تھی کہ اس تنقید کا کبھی برا نہیں مناتے تھے اور نہ کبھی دفاع کرتے تھے۔ اگر کوئی بزرگ آپ کو روکتا یا ٹوکتا تو آپ کا عموماً یہ جواب ہوتا تھا کہ ''یہ میری کوتاہی ہے۔ دعا کریں کہ اللہ مجھے

[1] ماشاء اللہ...... یہ تو بالکل نوجوان ہیں۔

اپنی یہ کوتاہی دور کرنے کی توفیق عطا کرے۔'' ورنہ آج کل کے سے ''لیڈران گرامی'' اپنی کسی شخصی کمزوری پہ اعتراض کی اجازت نہیں دیتے اور معترض کی ایسی کی تیسی کر دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک جلسے میں اس وقت صوبہ سرحد اور اب خیبر پختون خواہ سے کچھ پٹھان موجود تھے جب آپ تقریر کے لیے تشریف لائے تو بے اختیار ایک خان صاحب کے منہ سے نکلا ''اوئے اس کا ڈاڑھی تو بہت چھوٹا ہے'' اور دائیں بائیں سننے والوں کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہو گیا۔

مولانا ابوالبرکات کی ڈانٹ

ایک بار گوجرانوالہ گئے۔ وہاں آپ کے استاد شیخ الحدیث مولانا ابوالبرکات بھی تشریف لائے۔ علامہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے آپ کو دیکھا تو ڈانٹ دیا ''یہ تم نے ڈاڑھی کا کیا حال کیا ہوا ہے'' شاگرد اب بڑا آدمی بن چکا تھا۔ اہل حدیث اس کو اپنا امام مانتے تھے، راہنما جانتے تھے۔ مگر علامہ سر جھکائے مؤدب کھڑے استاد کی ڈانٹ ڈپٹ سن رہے تھے۔ محض اظہار ندامت تھا۔

بابا جی کو مٹھائی کھلائی

رمضان کی راتوں کا ذکر ہے کہ ایک روز مسجد چینیانوالی کے صحن میں ایک بابا جی نے علامہ کو گھیر لیا۔ ''علامہ صاحب اے تسیں ڈاڑھی تے پوری کر لو'' پتا نہیں اس وقت حضرت علامہ کس کیفیت میں تھے کہ کچھ ''مائنڈ'' کر گئے۔ بابا جی کو نسبتاً تلخ جواب دیا اور آگے بڑھ گئے۔ بات زبان سے تو نکل گئی مگر علامہ کو بے چین کر گئی۔ اگلا روز آیا۔ بابا جی کے لیے مٹھائی لی اور مسجد میں آ گئے۔ اب بابا جی ایک طرف لاتعلق سے بیٹھے تھے۔ علامہ بابا جی کے پاس جا پہنچے۔ بابا جی کے گھٹنے پکڑ لیے۔ ''بابا جی معاف کر دو، آپ ٹھیک کہتے تھے میں ہی غلط ہوں۔'' اب بابا جی کو راضی کرنے لگے۔ مٹھائی پیش کی۔ ''بابا جی معاف کر دیو ناں'' آنکھوں میں ساون تھا۔ بابا جی کے

ہاتھ بلند تھے۔ ع

جگ تے توں جیویں
تے تیری آس تے میں جیواں

باپ تو اپنے بچوں کی آس پر ہی جیتے ہیں۔

علامہ نے پھر وعدہ کر ہی لیا

قبائے شہادت اوڑھنے سے پہلے علامہ شہید کا ارض حرم کا آخری سفر تھا۔ حسب معمول مدینہ یونیورسٹی گئے۔ طلباء و اساتذہ سے خطاب کیا۔ محفل جمی، کسے خبر تھی کہ مدینے کی گلیوں کا مسافر آخری باران راہوں کو تک رہا ہے۔ وہاں پر بھی طالب علموں نے گھیر لیا۔ ایک طالب علم نے علامہ کو ڈاڑھی بڑھانے کو کہا۔ آج قبولیت کا لمحہ تھا۔ علامہ کے منہ سے نکلا "لو میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ یہاں آیا تو اس ڈاڑھی کے ساتھ نہیں آؤں گا۔" پھر علامہ پاکستان آئے۔ نہیں جانتے تھے کہ اب جیتے جی دوبارہ مدینے نہیں جانا۔ وعدہ مگر یاد تھا۔ ارادہ بھی کر چکے تھے اور مدینے بھی جانا تھا کہ علامہ کا اس کے رب نے جنازہ وہیں طے کر رکھا تھا۔ سو اس کا سامان بھی تو کرنا تھا۔

آج آخری دفعہ ہے......

1987ء کا مارچ آ گیا تھا۔ حجام گھر پہ ہی آتا تھا۔ علامہ داڑھی ترشوانے بیٹھ گئے۔ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر آپ کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ حجام نے اپنا کام شروع کر دیا۔ علامہ نے باآواز بلند کہا "لے یار ابتسام آج کے بعد دوبارہ ڈاڑھی نہیں کٹوانی۔" اور پھر ایسا ہی ہوا۔ یہ علامہ کی زندگی کا آخری موقع تھا ڈاڑھی کٹوانے کا۔ ہمارا تو ایمان یہ ہی ہے نا "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" اور "الاعمال بالخواتیم۔"

علامہ شہید نے اس کے بعد ڈاڑھی کی تراش خراش نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر یہ موقع ہی نہ آیا، حتیٰ کہ چند روز بعد علامہ شہید کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا۔

یہ ہے مسلک اہل حدیث

ایک مرتبہ ہم نے میر خلیل الرحمٰن سوسائٹی روزنامہ جنگ کے ساتھ مل کر علامہ کی یاد میں الحمرا ہال میں ایک تقریب کا انعقاد کرنا طے کیا۔ جنگ فورم کے انچارج ان دنوں معروف شاعر حسن رضوی تھے مسلکاً اثنا عشری شیعہ تھے۔ کچھ انتظامی معاملات طے کرنے ان سطور کا راقم اور ابتسام الٰہی ظہیر ان سے ملنے ان کے دفتر پہنچے۔ علامہ کی باتیں شروع ہو گئیں۔ حسن رضوی اپنی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ ابتسام الٰہی ظہیر سے کہنے لگے:

"یار ابتسام علامہ تو بہت ماڈرن آدمی تھے۔ سو بندوں میں بیٹھے ہوتے تو پتا چل جاتا یہ احسان الٰہی ظہیر ہیں۔ کیا نفیس آدمی تھے اور لباس کا کتنا خیال رکھتے تھے تمہارے والد۔" پھر ابتسام کی ڈاڑھی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "آپ بھی ذرا تراش خراش کریں اس کی۔ علامہ تو بہت سنوار کر رکھتے تھے۔" ابتسام الٰہی ظہیر نے بے اختیار جواب دیا کہ "ضروری نہیں جو غلطی باپ کرے، بیٹا بھی کرے۔"

حسن رضوی ٹپٹا گئے بے اختیار پنجابی میں کہنے لگے "یار اک تے تسی وہابی بڑے ظالم او، پیو نو وی معاف نئیں کردے۔"

اب ابتسام الٰہی ظہیر نے جواب دیا "نہیں رضوی صاحب یہ بات نہیں میں اپنے والد کا جتنا احترام کرتا ہوں شاید ہی کوئی کرتا ہو، مگر ہمارے مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ اگر سگے باپ کی بات بھی نبی کریم ﷺ کی بات سے ٹکرائے گی تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا اور اس کا دفاع نہیں کیا جائے گا۔"

مرضی کا فتویٰ کیسے لیتے ہیں

علامہ شہید سعودی عرب کے دورے پر تھے۔ آپ کے برادر خورد حافظ عابد الٰہی

اور آپ سے بے حد بحث کرنے والے دارالسلام کے مدیر عبدالمالک مجاہد بھی ہمراہ تھے۔ عبدالمالک مجاہد کے دفتر میں آپ کی دعوت تھی۔ اس عمارت میں ایک انشورنس کمپنی کا دفتر بھی تھا۔ آپ کی نگاہ انشورنس کمپنی کے دفتر پہ پڑی تو بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہی بڑے اہتمام سے سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ بن باز رحمہ اللہ کا فتویٰ آویزاں تھا۔ اس فتوے کی رو سے انشورنش کو جائز کہا گیا تھا۔ آپ نے وہاں کے منتظم اعلیٰ سے پوچھا آپ کس طرح اس کو جائز قرار دیئے جا رہے ہیں؟ اس نے جواب میں شیخ بن باز رحمہ اللہ کے فتوے کا حوالہ دیا۔ آپ نے دل چسپ تبصرہ کیا کہ مفتی کو اپنی مرضی سے اور اپنے انداز میں سوال کیا جائے تو اپنی خواہش کے مطابق فتویٰ لینا کیا مشکل ہے۔ آپ لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔

میں وقت کے ہر لمحے سے کچھ چھین لینے کی فکر میں رہتا ہوں

علامہ کے نزدیک وقت کی بہت قدر تھی۔ آپ کی زندگی میں وقت ضائع کرنے کا تصور بھی نہ تھا۔ آپ کی نیند بمشکل تین سے چار گھنٹے تھی۔ معروف صحافی محبوب جاوید کے ساتھ انٹرویو میں آپ نے اپنے معمولات کا ذکر کیا اور ساتھ یہ تاریخی جملہ بھی بولا ''میں وقت کے ہر لمحے سے کچھ نہ کچھ چھین لینے کی فکر میں رہتا ہوں۔''

ایک مرتبہ آپ بیمار ہو گئے، نہر کنارے لاہور کے ایک معروف طبیب ڈاکٹر نصیر اے ناصر کا کلینک ہے۔ ان کے پاس مشورے کی غرض سے چلے گئے۔ ڈاکٹر نے اپنے مریض سے اس کے معمولات، کھانا پینا وغیرہ پوچھا۔ اس کے بعد کہنے لگا ''آپ کو کسی دوا کی ضرورت نہیں بس آپ اپنی نیند کا دورانیہ بڑھا لیں۔'' علامہ نے یہ سنا تو اپنا کوٹ اٹھایا اور یہ کہہ کر چل دیئے ''میں اپنی صحت قربان کر سکتا ہوں مگر اپنا وقت نہیں۔''

میں کسی پر ذاتی حملے نہیں کرتا

علامہ احسان الٰہی ظہیر اخلاق کی اعلیٰ بلندیوں پہ فائز تھے۔ کسی سے شدید اختلاف

بھی آپ کو اخلاقیات پر سمجھوتہ نہیں کرنے دیتا تھا اور آپ اس طرز عمل کے لیے ٹھوس وجوہات رکھتے تھے۔ آپ اپنے احباب اور کارکنان کے سامنے ان وجوہات کو بیان کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بہت پر جوش عرب نوجوان آپ کے پاس آیا۔ جذباتی نوجوان جانتا تھا کہ شیخ احسان کی نصف درجن کتب شیعہ کے عقاید ونظریات کی تردید میں آ چکی ہیں۔ عالم اسلام میں تشیع کے رد میں سب سے معتبر قلم آپ ہی کا ہے کہ جسے کوئی چیلنج نہیں۔ عقیدت سے آپ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔

''شیخ آپ نے کمال کر دیا ہے، دفاع صحابہ کا حق ادا کر دیا ہے، فرق باطلہ پر آپ کا کام کمال کا ہے۔ بس ایک کام اور کر دیں۔''

شیخ احسان نے اس پر گہری نگاہ ڈالی ''وہ کیا کام ہے جو کرنا چاہیے؟''

''آپ ذرا ایرانی قیادت کی ذاتی زندگی پر بھی کتاب لکھ دیں۔ متعہ کے نام پر جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں، سامنے آنا چاہیے۔'' جوش میں ڈوبی ہوئی فرمائش کی گئی۔

''میں لوگوں کے نظریات پر بات کیا کرتا ہوں، کسی کی ذات پر کیچڑ نہیں اچھالتا کہ وہ ذاتی زندگی میں کیا کرتا ہے۔'' شیخ احسان نے بات ہی ختم کر دی۔

حقیقت یہ ہی ہے کہ جو لوگ ذہنی افلاس کے شکار ہوتے ہیں اور اخلاقی جرأت اور بہادری سے محروم ...... ان کا معمول ہوتا ہے کہ وہ غیبت کرتے ہیں۔ اپنے مخالف کے سامنے تو بھیگی بلی بن جاتے ہیں اور اس کی غیر موجودگی میں منہ ماری کرتے رہتے ہیں۔ علامہ شہید ایک جرأت مند آدمی تھے۔ لیکن ان کی تنقید کا ہدف عموماً حکمران ہوتے تھے اور جو لوگ ان کی ذات پر ہمہ وقت تنقید کرتے اور اعتراضات کرتے، آپ ان سے صرف نظر کرتے تھے۔ آپ متنبّی کے اس شعر کی تصویر تھے ؎

و اکبر نفسی عن جزاءٍ بغیبةٍ

و کل اغتیاب من لا لہ جھدٌ

''کہ مخالف کی غیبت میرے لیے چھوٹا کام ہے کہ میرا مقام اس سے بلند تر ہے۔ جو بدلہ نہیں لے سکتا، وہ غیبت کرتا ہے جب میں انتقام لے سکتا ہوں تو غیبت کیوں کروں۔''

''شہادت کے خون میں ڈوبی ہوئی چادر''

یہ ہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی تقاریر میں اپنے مخالفین اور حاسدین کا اچھا برا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ صرف ایک بار ملتان کے باغ عام و خاص کے جلسۂ عام میں آپ جذباتی ہو گئے اور چند تاریخی جملے کہے۔ ہوا کچھ یوں کہ جلسے سے پہلے ''فاتح پاکستانی عوام'' جنرل ضیاء الحق سے اپنے تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے حاسدین نے انتظامیہ سے مدد چاہی۔ مختلف رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، پابندی لگوائی گئی اور دیگر ہتھکنڈے بروئے کار لائے گئے۔ لیکن جب کوئی بس نہ چلا اور جلسہ شروع ہو گیا تو گراؤنڈ سے ملحقہ مسجد کے لاؤڈ سپیکر تیز آواز سے کھول کر تقریر شروع کر دی گئی۔ یہ تقریر کرنے والے صاحب آج کل اپنی الگ جماعت بنا کر اسی کے ناظم اعلیٰ بنے بیٹھے ہیں۔ شاید امیر بھی وہ خود ہی ہیں۔ قصہ مختصر چند لڑکوں نے جا کر ان خطیب صاحب کی ''خطابت'' کا یہ مظاہرہ بند کروایا۔ لیکن اس اخلاق باختگی نے علامہ کو اس روز جذباتی کر دیا۔ فضا میں یہ جملے بکھرنے لگے:

''قیامت کا دن ہوگا
ہم بھی آئیں گے
اور............ صاحب[1]! آپ بھی آنا
رب پوچھے گا
نامۂ اعمال میں کیا لے کر آئے ہو

[1] یہ کون صاحب تھے، اگر آپ کو تجسس ہے تو آپ علامہ شہیدؒ کی تقریر سن سکتے ہیں۔

ہم کہیں گے

شہادت کے خون میں ڈوبی ہوئی چادر لے کر آئے ہیں

آپ کہنا

ساری عمر ضیاء الحق کے بوٹ پالش کرتے رہے۔"

خدا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ علامہ کی یہ بات آسمان کی دیواروں پر لکھ دی گئی۔ الفاظ نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اللہ نے آپ کے الہامی الفاظ کی لاج رکھ لی اور آپ کو اپنی مرضی کی موت ملی۔ آپ کی زندگی کا اختتام شہادت سے لے کر تدفین تک نہایت شاندار ہوا۔ ہم مولانا .... کے لیے بھی دعا گو ہیں اللہ ان کی مغفرت فرمائے کہ دنیا کے معاملات ہی تو ہیں، دنیا میں رہ جاتے ہیں۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

کہتے ہیں کہ جس نے کوئی گھر تعمیر کیا ہو، اس کو اس کی ایک ایک اینٹ کی قدر ہوتی ہے۔ اور بعد میں آنے والے عموماً اس قدر دانی سے محروم ہوتے ہیں۔ علامہ شہید نے بھی جمعیت اہل حدیث کی اس عمارت کی ایک ایک اینٹ کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ اسی لیے وہ اپنے ساتھیوں کی بہت قدر کرتے تھے اور اس معاملے میں خاصے جذباتی تھے۔ آپ کی طبیعت میں آخری دنوں میں رقت بھی بہت آ چکی تھی۔ آپ بیرون ملک سفر میں تھے کہ مولانا محمد حسین شیخوپوری تنظیمی اعتبار سے آپ کو "داغ مفارقت" دے گئے۔ جب آپ پاکستان واپس آئے اور معاملے کی خبر ہوئی تو میرے والد مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ کو ساتھ لیا اور مولانا کے گاؤں چل نکلے کہ ان کو منایا جائے۔ جب مولانا شیخوپوری کا گاؤں سامنے نظر پڑا تو علامہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور بے اختیار رونے لگ گئے۔ گاڑی آپ کے قابو سے نکل کر سڑک سے نیچے اتر گئی اور پانی کے "کھال" میں جا گری۔ گاڑی تو نکال لی لیکن اس واقعے میں ان "راہنمایانِ ملت"

کے لیے کتنا سبق ہے کہ جن کا مزاج یہ ہے کہ کوئی آئے یا جائے، ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جبکہ علامہ اس شعر پر ایمان رکھتے تھے۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

مجھے پڑھایا کیوں تھا پھر......

ماؤں کے دل بھی اللہ نے عجیب ہی بنائے ہیں۔ اولاد کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ماں کے دل میں درد اٹھتا ہے۔ چومکھی لڑائی لڑنے والے احسان الٰہی ظہیر کی ماں کا دل بھی ہر آن ان کے لیے فکرمند رہتا تھا۔ اس دن علامہ ماں کی دعائیں لینے گوجرانوالہ گئے ہوئے تھے۔ ماں کہنے لگیں ''احسان الٰہی تم نے دشمنیاں بہت بڑھا لی ہیں، ذرا ٹھہر جاؤ۔ دیکھو تم بچیوں والے ہو'' ......علامہ کہنے لگے اماں جی اگر ٹھہرانا ہی تھا تو مجھے پڑھایا کیوں تھا...... ماں کیا کہہ سکتی تھیں:

جگ تے توں جیویں
تے تیری آس تے میں جیواں

نصیب کے فیصلے......

ایسی ہی ایک وہ ماں بھی تھی جو ماحول سے بے نیاز صحنِ حرم میں ہاتھ بلند کیے عرض گزار تھی۔ اپنے رب سے مانگ رہی تھی۔ اس کی مرضی تھی جو چاہے مانگے۔ اللہ میرے بیٹے کو حرم کا امام بنا دے۔ اللہ اللہ...... ساتھ بیٹھی بوڑھی اماں نے ممتا کی پکار سنی تو بے اختیار مسکرا دی۔ اس خاتون کو متوجہ کیا ''میں تمہیں بتاؤں، میں نے بھی اسی رب سے ماہ و سال پہلے اسی طرح کی دعا کی تھی۔''

''تو پھر؟؟'' اس خاتون نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں اللہ نے میری سن لی، تیری بھی سنے۔ میں سعود الشریم کی ماں ہوں۔'' آنکھوں میں شکر گزاری کے موتی چمک رہے تھے۔

پھر ایک اور بندے نے بھی دعا دی تھی سعود الشریم کو۔ میرے عزیز دوست انجم وحید کے دادا حاجی عبدالرحیم رحمہ اللہ نے مدت گزار دی صحن حرم میں۔ گاہے جی چاہتا تو پاکستان آ جاتے پھر واپس چلے جاتے۔ حرم کے سارے امام جانتے تھے کہ بابا جی اس گھر کے مستقل مکین ہیں۔ ایک روز سعود الشریم سے باتیں کرنے لگے۔ ذکر آ گیا احسان الٰہی ظہیر کا۔ سعود کہنے لگے:

''آپ کیا بات کرتے ہیں وہ صحابہ کا دفاع کرنے والا تھا۔ اللہ کا ولی۔ میں ریاض کی ایک مسجد میں نماز پڑھا رہا تھا۔ استاذ احسان اس مسجد میں نماز کے لیے رکے۔ نماز کے بعد میرے پاس آئے، کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے: ''آپ بہت عمدہ قرآن پڑھتے ہیں، اللہ آپ کو حرم کا امام بنائے۔''

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

علامہ کی امانت اور دیانت......

چمگادڑ الٹا لٹک کر آرام کرتا ہے اور اپنے تئیں یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا الٹی ہے۔ اب اسے کون سمجھائے کہ دنیا تو سیدھی ہے۔ علامہ کے معاملے میں بھی بعض لوگوں کو یہی مغالطہ ہوا اور اپنی ذات پر آپ کو قیاس کرنے لگے۔ اور جنہوں نے اپنے دامن میں دنیا و آخرت کی رسوائیاں سمیٹی تھیں، انہوں نے تو حد ہی کر دی۔ جبکہ علامہ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ عبداللہ عبدالمحسن ترکی پاکستان کے دورے پر آئے اور مرکز اہل حدیث لارنس روڈ کا افتتاح مقصود تھا۔ انہوں نے کچھ پیسے علامہ کو پکڑانے چاہے۔ آپ نے چوہدری عبدالعزیز مرحوم کی طرف اشارہ کیا کہ ان کو دے دیں۔ چوہدری عبدالعزیز چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے اور جمعیت کے ناظم مالیات تھے۔ بہت امیر آدمی تھے اور مال روڈ پر ان کا بہت بڑا دفتر تھا۔

برابری کی سطح پر ملتے تھے

رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل اور سعودی وزیر عبداللہ عبدالمحسن ترکی جو خود بھی کئی کتب کے مصنف ہیں، علامہ شہید سے بہت پیار کرتے تھے۔ دوستی بھی تھی۔ ایک بار کہنے لگے کہ ''ہندوستان سے ابوالحسن علی ندوی بھی آتے ہیں مگر ان کے مزاج میں بہت انکساری ہوتی ہے اور بہت جھک کر ملتے ہیں۔ جبکہ استاذ احسان ہم سے برابری کی سطح پر بات کرتے اور ملتے ہیں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ ''جو بے غرض ہوتا ہے وہ بے پروا ہو جاتا ہے۔''

☆......☆......☆

حافظ عابد الٰہی بیان کرتے ہیں کہ ایسے ہی ایک بار آپ کی ملاقات کا وقت شیخ عبداللہ عبدالمحسن سے طے تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون تو ہوتے نہ تھے کہ پل پل رابطہ رہے۔ راستے میں علامہ کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا اور یوں منزل تک پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ ادھر وزیر صاحب آپ کے انتظار میں تھے۔ علامہ وزیر کے دفتر پہنچے اور استقبالیہ پر اپنے آنے کی اطلاع دی۔

شیخ عبداللہ عبدالمحسن نے بھی بلوانے میں تھوڑی تاخیر کی۔ اس پر علامہ کا مزاج تھوڑا برہم ہو گیا کہ تاخیر کا سبب اختیاری تو نہ تھا۔ آپ نے ایک کاغذ لیا اس پر حماسہ کا ایک شعر لکھا۔ شیخ کے سیکرٹری کے حوالے کیا اور وہاں سے نکل آئے۔ کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ علامہ کی ڈھنڈیا مچ گئی۔ ہوٹل سے پتا کرایا ادھر ادھر ہرکارے دوڑائے لیکن علامہ نہ ملے۔ آپ اپنے کام سے نکل گئے۔ اب شیخ کو اندازہ ہو چلا تھا کہ استاذ احسان خفا ہو گئے ہیں۔ اس پر وہ خود آپ کے ہوٹل آئے اور آ کر ساتھ لے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اپنی عزت نفس کا کتنا خیال کرتے تھے۔

انسان دوستی

عموماً لیڈر حضرات اپنے کارکنان کو مفت کے سپاہی سمجھتے ہیں۔ ان سے بیگار لی، اپنا کام نکالا اور فارغ! بالکل ٹشو پیپر کی طرح۔ ایسے ہی عام انسان جو کسی جماعت کا کارکن بھی نہیں، اس کی کیا اوقات ہو گی۔ لیکن علامہ احسان الٰہی ظہیر کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ آپ دردِ دل رکھنے والے انسان تھے۔ بے شمار لوگوں کی مدد کرتے۔ حتیٰ کہ یہ جو سبزی والے یا پھل والے آتے تو آپ اہلِ خانہ کو ان سے بھاؤ تاؤ کرنے سے منع کرتے تھے۔ خدا جانے وہ کیسے ''شیخ'' تھے۔

انسان دوستی کا ایک واقعہ سنئے! جو قاری عبدالغفار نے مجھے خود سنایا۔ قاری عبدالغفار کا نارنگ منڈی سے تعلق تھا اور آپ نے کچھ عرصہ علامہ کی خدمت میں گزارا۔

قاری صاحب بیان کرتے ہیں کہ وہ علامہ کے ساتھ راولپنڈی سے لاہور آ رہے تھے۔ گاڑی جی ٹی روڈ پر رواں دواں تھی۔ علامہ خود گاڑی چلا رہے تھے اور لازمی بات ہے کہ گاڑی کی رفتار بے حد تیز ہو گی۔ جہلم سے پہلے ایک چھوٹا سا قصبہ دینہ ہے۔ وہاں پولیس کا ''ناکہ'' لگا ہوا تھا۔ انہوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ علامہ نے گاڑی ایک طرف کر کے روک لی اور قاری صاحب کو اشارہ کیا کہ ان سے خود ہی بات کر لیں۔ قاری صاحب نے سپاہی کو بتایا کہ گاڑی میں علامہ احسان الٰہی ظہیر سفر کر رہے ہیں اور لاہور جا رہے ہیں۔ اب وہ سپاہی پوٹھوہاری تھا۔ اس نے مخصوص لہجے میں کچھ روکھے پن کا مظاہرہ کیا تو اس پہ قاری صاحب کی اور اس کی تکرار ہو گئی۔

علامہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے اور سر سٹیئرنگ سے ٹکائے اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''ریلیکس'' کر رہے تھے۔ باہر تکرار بڑھ گئی۔ اب یہ تو ہوتا ہے کہ بڑے آدمی کے ساتھ چلنے پھرنے والے خود کو کہاں چھوٹا سمجھتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اصل سے بڑے ہوئے جاتے ہیں۔

شاید اس روز بھی کچھ یہی ہوا کہ قاری صاحب نے علامہ کی مصاحبت کے زعم میں سپاہی کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا۔ اس پر علامہ جلدی سے گاڑی سے اترے۔ ادھر سے پولیس آفیسر بھی بھاگا آیا۔ اس کو صورت حال کا اور علامہ کا پتہ چلا تو اس نے معذرت کی۔ اپنے سپاہی کو ڈانٹا اور آپ سے کہا ''آپ جائیں کوئی مسئلہ نہیں۔''

آپ چل دیئے۔ زیادہ نہیں، دو کلومیٹر آگے آئے ہوں گے کہ آپ نے گاڑی روک لی۔ چند منٹ گہری خاموشی رہی۔ اب قاری صاحب نے پوچھا حضرت! کیا ہوا؟ آپ نے کہا ''نہیں کچھ نہیں'' اور پھر گاڑی واپس موڑ لی۔ واپس اسی پولیس ''ناکے'' پر پہنچے۔ گاڑی سے نیچے اترے۔ آپ کو دوبارہ دیکھ کر پولیس والے بھی گھبرا گئے کہ خدا جانے اب کیا ہو گیا کہ یہ پھر واپس آ گئے ہیں۔

ادھر آپ نیچے اتر کر کھڑے ہو گئے ''قاری صاحب آپ بھی نیچے آئیں اور سپاہی سے معافی مانگیں۔'' اب قاری صاحب حیران بھی اور متامل بھی کہ کیسے معافی مانگیں۔ قاری صاحب کی ہچکچاہٹ دیکھ کر علامہ نے ان کو مخاطب کیا ''قاری صاحب آپ معافی مانگتے ہیں یا آپ کی جگہ میں معافی مانگوں؟'' اس پر قاری صاحب کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ انہوں نے پولیس والے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''معاف کر دو یار۔'' سپاہی کی آنکھیں بھیگ رہی تھی۔ آج اس نے انوکھے مولوی اور لیڈر کا نظارہ کیا۔ علامہ نے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے۔ زبردستی سپاہی کے ہاتھ پر رکھے ''چل یار سب کچھ بھول جا، جو ہوا ہے۔ یہ اپنے بچوں کے لیے مٹھائی لے جانا۔'' پھر جب 23 مارچ 1987ء کو آپ کا حادثہ ہوا اور آپ شہید ہو گئے، اس سپاہی نے بھی یہ خبر سنی ہو گی تو اس کی آنکھ سے چند آنسو بھی گرے ہوں گے۔ اس کے ہاتھ ضرور اس روز دعائے مغفرت کے لیے اٹھ گئے ہوں گے۔

انوکھے مسافر

علامہ کے کارکنان بہت لاڈلے ہو گئے تھے کہ علامہ ان کے ناز بھی تو اٹھاتے تھے۔ اسی لاڈ پیار کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب علامہ رخصت ہوئے تو یہ کارکنان علامہ کو ڈھونڈتے۔ مگر اب علامہ کہاں؟ وہ تو گئے ؏

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

بعد میں ان انوکھے لاڈلوں کا حال بہت برا ہوا۔ اور یہ............ ؏

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند رے

کی مثال بن گئے۔ کچھ اس میں علامہ کا قصور بھی تو تھا۔ دیکھئے نا اس طرح کے کام تو وہ کرتے تھے، جیسے اس روز کیا۔ اہل حدیث یوتھ فورس کا کنونشن لارنس روڈ پر طے تھا۔ ہم سارے دوست وہاں تیاریوں میں مصروف تھے۔ علامہ بڑے شوق سے ہمیں کام کرتے دیکھتے اور آتے جاتے رہے کہ آپ کا گھر بھی پاس ہی تھا۔ نصف شب بیت چلی تھی۔ ہم نے علامہ سے درخواست کی کہ "جب آپ کا ارادہ بھی سارا دن سٹیج پہ بیٹھنے کا ہے تو اب گھر چلے جایے اور آرام کریں ہم کام سمیٹ کر لیں گے۔" آپ ہمارے اس پیار بھرے مطالبے پر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ آپ اپنی بڑی گاڑی پر پھر سے آ موجود ہوئے۔ گاڑی رکی تو اس میں سے پانچ یا چھ لڑکے دھم دھم کرتے اترتے چلے آئے۔ اس شعر کی تصویر بنے ؎

اترا کوئی تیرے آنگن میں یوں دھم سے نہ ہوگا
جو کام ہم سے ہوا رستم سے نہ ہوگا

ان کو اتار کر علامہ پھر مسکراتے ہوئے واپس چل دیئے۔ علامہ شہید کے نکلتے ہی ہم لڑکوں پر چڑھ دوڑے کہ تم لوگوں کو علامہ کے آرام کا ذرا بھی خیال نہ تھا کہ رات کے اس پہر ان کے گھر جا پہنچے اور انہیں تنگ کیا۔ اس پہ لڑکے بولے "پاجی ہتھ ہولا رکھو......

بھائی! ذرا ہماری بھی تو سن لو‘‘۔ جی فرمائیے؟۔ جب ان کی رام کتھا سنی تو تب اور آج پچیس سال بعد جب یہ واقعہ لکھ رہا ہوں، ایک ہی کیفیت ہے۔ نہ تب آنسو اپنے اختیار میں تھے نہ آج۔

اور یہ الفاظ لکھنے سے پہلے میں صبح اپنی بیٹیوں کو لارنس گارڈن لے کر گیا تھا۔ واپسی پر مرکز اہل حدیث کے سامنے سے گزرا تو بچیاں اپنے نانا کی باتیں کرنے لگ گئیں۔ ان کی ماں ان کو بتا رہی تھی کہ جب آپ علاج کی غرض سے سعودی عرب جا رہے تھے تو یہ ہدایات دے رہے تھے کہ مرکز کے فلاں فلاں کام کرا دینا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ابدی سفر ہے۔

بات دور نکل گئی۔ ہم نے ان لڑکوں سے پوچھا جی فرمائیے کیا کہتے ہیں آپ؟

اب باقی بات ان کی زبانی سنیے!

’’ہم اپنے شہر سے اہل حدیث یوتھ فورس کے تربیتی کیمپ میں شرکت کی غرض سے لاہور روانہ ہوئے۔ مرکزی دفتر کا پتا ہمارے پاس نہ تھا۔ لے دے کر ایک فون نمبر تھا علامہ صاحب کا۔ سو جب ہم لاہور کے ریلوے سٹیشن پر اترے تو کیا کرتے۔ چارو ناچار علامہ صاحب کو PCO سے ٹیلی فون کیا۔ ہم نے عرض کیا ’’علامہ صاحب ہم کنونشن میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ کو تنگ کر رہے ہیں مگر مجبوری ہے۔ آپ ہمیں مرکز کا پتا سمجھا دیں۔‘‘

اس پر علامہ بولے ’’آپ ایسا کریں کہ یہاں سے اکتیس نمبر ویگن پر بیٹھیں، وہ آپ کو چائنہ چوک اتارے گی۔ اس سے داہنے ہاتھ والی سڑک پر بائیں طرف شروع میں ہی ’’مرکز‘‘ ہے......لیکن ٹھہریں...... آپ کہاں کھڑے ہیں مجھے پہلے یہ بتائیں؟‘‘

ہم نے ان کو جہاں کھڑے تھے وہ جگہ بتائی۔ اس پر آپ بولے ''آپ لوگ یہیں رکیے'' اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔ ہم حیران و پریشان کہ اب کیا کریں۔ پتا بھی سمجھا دیا اور ساتھ ہی حکم بھی سنا دیا کہ ادھر ہی کھڑے رہیں۔ بہر حال مجبوری تھی۔ ابھی ان سوچوں میں غلطاں تھے کہ کچھ ہی دیر میں ایک بڑی سی گاڑی ہمارے آگے رکی، دیکھا تو علامہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

''یار میں نے سوچا رات کے اس پچھلے پہر اجنبی شہر میں آپ لوگ کہاں خوار ہوتے پھریں گے اور پھر ویگن بھی معلوم نہیں ملے یا نہ ملے۔''

دوست تو یہ سارا قصہ سنا کر خاموش ہو گئے۔ مگر ہم آج تک وہیں کھڑے ہیں۔ وقت کی تیز دھوپ کا سایہ اپنے ہی پاؤں پر پڑ رہا ہے۔ پاؤں جھلس رہے ہیں اور دل ہے کہ کب رات ہو، کب چاند نکلے۔ عادت جو خراب ہو گئی ہے کہ ؏

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند رے

کسی کا نام زبان پر مت لائیں کہ عزت سادات بچانا مشکل ہو جائے گی لیکن دل میں تصور کریں ...... آدھی رات کے وقت اپنے ورکروں کے ناز اٹھانے کا کسے حوصلہ ہے؟ کسی کو بھی نہیں۔

اسی طرح چوہدری عبدالسلام کا قصہ پڑھیے: چوہدری عبدالسلام میرے قریبی دوست ہیں۔ بہاولپور کے نواحی شہر احمد پور شرقیہ سے تعلق ہے، علامہ شہید سے ان جیسی محبت شاید ہی کسی نے کی ہو۔ تربیتی کیمپ میں ساتھیوں سمیت آئے تھے۔ تب ان کی عمر بمشکل بیس برس ہو گی۔ علامہ کی ان پر نظر پڑی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ عبدالسلام کہتے ہیں کہ:

''علامہ شہید نے اپنی ایک ٹانگ وہاں پڑی کچھ اینٹوں پر رکھی تھی اور ایک ہاتھ میرے کاندھے پر اور مجھ سے ریاست بہاولپور اور اس علاقے میں واقعہ دوسرے شہروں میں اہل حدیث کے حالات دیر تک پوچھتے رہے۔ میں بتاتا رہا۔ علامہ تقریباً پون گھنٹہ مجھ سے محو گفتگو رہے اور مسلسل مختلف افراد اور علاقے کی جماعت کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔''

چوہدری عبدالسلام یہ سب بتا رہے تھے اور خود ہی کہہ رہے تھے کہ ''میں صرف بیس سال کا تھا اور خاصا متحرک تھا۔ مگر آج تک جب یہ وقت یاد آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ انہوں نے مجھے کتنی اہمیت دی۔''

عجیب بات ہے کہ ۲۳ مارچ کے جلسے کے بعد علامہ کا اگلا سفر احمد پور شرقیہ کا ہی تھا۔ یعنی تیس مارچ ۱۹۸۷ء کو احمد پور شرقیہ میں علامہ شہید کا جلسہ تھا۔ عام طرز سے ہٹ کر بہت خوبصورت اشتہار شائع کیا گیا۔ مگر علامہ کا تیس مارچ کو جنت البقیع جانا طے ہو چکا تھا۔ جب عبدالسلام یہ واقعہ سنا رہے تھے تو خاصے جذباتی ہو گئے تھے کیونکہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید اپنے کارکنان کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے۔

اک باخبر راہنما

پھر اس غریب سے بندے کو بھی حضرت علامہ کتنے یاد آتے ہوں گے کہ جس کے ساتھ آپ نے عجب ہی شفقت و محبت کا معاملہ کیا۔ راولپنڈی کے صدر بازار سے آپ گزر رہے تھے، اس روز بھی قاری عبدالغفار آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ کی نگاہ سامنے سے گزرتے ایک بندے پر پڑی۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر لی۔ ''قاری صاحب یہ ہماری جماعت کا ایک غریب اور نہایت مخلص ساتھی ہے۔'' آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں قاری صاحب کو بتایا۔ پھر گاڑی سے نکل کر اس کو آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے قائد محترم کو کھڑا پایا۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت کے تحت آگے بڑھا۔

آپ نے گلے لگایا، حال احوال پوچھا۔ پھر کچھ کتب اس کے حوالے کیں کہ آپ یہ کتب فلاں صاحب کو اگر پہنچا دیں تو میرا وقت بچ جائے گا۔ اس کو بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا۔ یہ خدمت تو اس کی سعادت تھی۔ ساتھ ہی تاکید کر دی ''کتب دے کر یہیں آنا ہے، قاری صاحب کو بتا دینا کہ موصوف سے ملاقات ہو گئی ہے۔'' اب وہ صاحب تو چل دیئے کتابیں لے کر اور علامہ نے ایک لفافے میں پانچ سو روپے ڈال کر قاری صاحب کو وہاں کھڑا کر دیا کہ جب وہ آئیں تو ان کو دے کر آپ فلاں جگہ آ جانا اور دیکھئے لفافہ واپس نہیں آنا چاہیے۔ آپ واپس آ گئے اور قاری صاحب وہیں ان کے انتظار میں رک گئے۔ جب وہ واپس آئے تو قاری صاحب کو اپنا منتظر پایا۔

اب انہوں نے قاری صاحب کو بتایا کہ جی کتابیں دے آیا ہوں تو قاری صاحب نے لفافہ ان کے حوالے کیا کہ یہ علامہ صاحب نے دیا ہے۔ لفافہ چاک کیا تو اس میں سے پانچ سو روپے برآمد ہوئے۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں قاری صاحب سے بہتیرا کہا کہ میں یہ سب کچھ نہیں لوں گا۔ لیکن یہ معاملہ اب قاری صاحب کے بس کا تو نہیں تھا۔

کمال کا حافظہ

علامہ شہید کمال کا حافظہ رکھتے تھے۔ اپنے ہزار ہا کارکنان جو ملک کے طول وعرض میں بکھرے ہوئے تھے، آپ کو عموماً ان کے چہرے اور نام تک یاد ہوتے تھے۔ اسی طرح آپ اپنے جمعہ کے نمازیوں کے بارے میں باخبر رہتے۔ میری عمر ہی کیا تھی۔ لیکن ایک بار نماز جمعہ میں حاضر نہ ہوا اور محلے کی مسجد میں ہی جمعہ ادا کر لیا۔ اب نہ جانے کی وجہ کیا تھی، اس کا تجسس نہ کیجیے گا۔ مجھے پتنگ اڑانا نہیں آتی تھی، ویسے اسی روز بسنت تھی۔ یہ موجودہ بسنت نہیں پرویز مشرف والی، لچر پن اور گھٹیا پن کی انتہا۔ اگلے جمعے جب گیا اور نماز کے بعد سلام کیا تو معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہنے لگے کیوں بھئی کہاں تھے پچھلے جمعے کے روز؟؟

عبدالخالق آفریدی ہمارے دوست ہیں اور علامہ کی زندگی میں اہل حدیث یوتھ فورس سندھ کے سیکرٹری جنرل تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ کراچی گئے۔ وہاں جمعیت کے ساتھی آپ سے ملنے آپ کی قیام گاہ پہنچے۔ سب سے تعارف ہوا۔ ایک صاحب جو آفریدی کے دوست تھے وہ بھی ہمراہ تھے۔ اب وہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں کئی سال بعد اپنے کسی کام سے کراچی کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں گیا۔ سامنے سے علامہ صاحب آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں سبقت کرتا، علامہ نے زور دار طریقے سے آواز دی اور میرا نام لے کر مخاطب کرتے ہوئے بولے ''کہاں ہوتے ہیں، دوبارہ کبھی ملاقات ہی نہیں کی آپ نے۔'' وہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں علامہ کی طرف سے اپنی اس عزت افزائی پہ خوش بھی تھا اور آپ کے حافظے پر حیران بھی کہ برسوں پہلے ایک مختصر سی ملاقات کے بعد بھی آپ نے میرا نام تک یاد رکھا۔

بیچا نہیں تو نے، اپنا ضمیر، ظہیر

علامہ ان لوگوں میں سے تھے کہ زمانے بھر کی ترغیب اور تحریص ان کو اپنے موقف سے ہٹنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ علامہ کو کہیں بیرونِ ملک جانا تھا اور تب بین الاقوامی پروازیں کراچی سے ہی جاتی تھیں۔ علامہ کراچی گئے، کہیں آگے سفر کا ارادہ تھا۔ آپ کے چھوٹے بھائی محبوب الٰہی کاروباری سلسلے میں حیدرآباد رہتے تھے۔ آپ بسا اوقات انہیں فون کر دیتے کہ کراچی آ رہا ہوں، فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا، ملنے آ جانا۔ اس روز بھی آپ نے فون کیا کہ 'ہلٹن میں ٹھہرا ہوں، ملنے آؤ اور آتے ہوئے گھر سے کھانا بنوا لانا۔'' شیخ محبوب الٰہی مقررہ وقت پر ان کے پاس جا پہنچے۔ دیکھا آپ آلتی پالتی مارے بیڈ پر ہی بیٹھے ہیں اور دو سوٹڈ بوٹڈ آدمی صوفے پر موجود ہیں۔ علامہ کا مزاج تھا کہ پاس بیٹھے افراد کا تعارف ضرور کراتے تھے اور مجلس کی اخلاقیات بھی یہی ہوتی ہیں۔ دونوں افراد کراچی کی اسماعیلی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور بے حد نمایاں حیثیت کے مالک

تھے۔ یاد رہے کہ پاکستان میں شمالی علاقہ جات میں سکردو اور اس کے نواح میں اسماعیلی فرقے کے لوگ اکثریت میں ہیں۔ ان کے عقائد عجیب و غریب ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور خود ان کو بھی اسلام سے تعلق قائم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ باطنی قسم کی ایک تحریک ہے جس کا سربراہ آغا خان کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ آج سے سو برس پہلے ان کو ''مسلمان کمیونٹی'' کا حصہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی گول میز کانفرنس میں برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی سر آغا خان اول نے کی۔ 1906ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اس کے بانیوں میں آغا خان بھی تھے۔ پھر وقت کے ساتھ مسلمانوں کو اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

بات دور نکل گئی۔ علامہ نے ان کا تعارف اپنے بھائی محبوب الٰہی سے کرایا اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ علامہ صاحب! ہم آپ کے لیے پرنس کریم آغا خان کا پیغام لائے ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ دنیا بھر میں سفر تو کرتے رہتے ہیں، وہ بھی آپ کی میزبانی کا شرف چاہتے ہیں۔ علامہ نے نہایت وقار اور متانت سے جواب دیا۔ ''نہیں میں پیرس وغیرہ جاتا ہوں تو میری جماعت کے افراد میرے میزبان ہوتے ہیں۔'' اس پر وہ کہنے لگے کہ ''آمدم برسر مطلب'' آغا صاحب چاہتے ہیں آپ نے ہمارے (اسماعیلیوں کے) بارے میں جو کتاب لکھی ہے، اس کی اشاعت روک لی جائے۔ آپ نے فرمایا ''نہیں وہ تو طباعت کے لیے بیروت جا چکی ہے۔'' وہ اصرار کرتے رہے کہ دیکھئے! کس مرحلے میں ہے، کیا صورت ہے روکنے کی؟ جیسے علامہ روکنے کو تیار ہی ہو جائیں گے۔ علامہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو ٹالتے رہے حتیٰ کہ علامہ نے واضح طور پر انکار کر دیا۔ اس پر وہ ''پیش کش'' پر اتر آئے۔

''علامہ صاحب جس طرح آپ چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔'' یہ واضح اور کھلی پیش کش تھی۔ بالفرض علامہ مان جاتے تو میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی گناہ تھا۔ مگر وہ احسان الٰہی

ظہیر تھا۔ صاف انکار کر دیا۔ بلکہ ان کے علم میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ ''میری کتاب ''الاسماعیلیہ'' کا دوسرا حصہ بھی آئے گا جو جدید اسماعیلی حضرات کے حوالے سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ امید ہے آپ میری راہنمائی کریں گے۔'' مکمل مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ آغا صاحب تو حیران تھے، آپ پیرس میں قائم ان کی لائبریری سے بھی ہو آئے اور ان کو خبر نہ ہوئی۔ وہ رخصت ہوئے تو ان کے نکلتے ہی علامہ نے اپنے بھائی محبوب الٰہی سے پوچھا ''کا کے کُج سمجھ آئی اُو کی کہہ رہے سن۔''

محبوب الٰہی کہنے لگے ''میرا خیال یہ ہی ہے کہ کروڑ دو کروڑ لے لیں اور کتاب روک لیں۔'' علامہ جوش سے اپنے زانوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہنے لگے ''بالکل بالکل آج وہ اس طرح ہی پیسے دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن میں ان شاء اللہ ان کے بخیے ادھیڑ دوں گا۔''

کچھ دنوں بعد ''الاسماعیلیہ'' شائع ہوئی۔ پھر علامہ کا حادثۂ شہادت ہو گیا۔ ایک گمان یہ بھی تھا کہ علامہ کے حادثے کے پس منظر میں اس کتاب کی اشاعت بھی رہی ہو۔ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ باطنی تحریکوں کا پس منظر قتل و غارت اور سازشوں سے بھرا ہوتا ہے۔ آپ اندازہ کیجیے کہ حضرت علامہ کی کتاب "الاسماعیلیه" کچھ عرصے بعد منظر سے اس طرح غائب ہوئی کہ ڈھونڈنے سے اس کا ایک نسخہ بھی نہ ملتا تھا۔ آپ کی شہادت سے قریباً دس سال بعد مجھے ''الاسماعیلیہ'' کی ضرورت پڑی، تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔ حتیٰ کہ لائبریریوں سے بھی غائب کر دی گئی تھی۔ نہایت مشکل سے طائف کے قریب ایک عرب بزرگ سے اس کتاب کا ایک نسخہ دستیاب ہو سکا اور میرا مسئلہ حل ہوا۔

☆......☆......☆

علامہ شہید کے قاتل کے لیے ایک عجیب دعا...... جو شاید پوری ہو گئی۔

جب علامہ شہید ہوئے تو اس حادثے کے ذمے داروں کے متعلق ایک لمبی بحث

چل پڑی۔ ایک روز علامہ کی والدہ نماز کے بعد دعا کر رہی تھیں کہ ان کی آنکھیں رو رو کر ختم ہو چکی تھیں۔

تیرے ہجر میں اے فہم و ذکا کے یوسف
کتنی آنکھیں ہیں کہ یعقوب ہوئی جاتی ہیں

اب اماں جی با آواز بلند جنرل ضیاء الحق کے لیے بد دعائیں کر رہی تھیں۔ پاس سے ان کے بیٹے محبوب الٰہی بولے ''اماں جی وہ نہیں ہے قاتل، فلاں لوگوں ...... نے قتل کیا ہے بھائی جان کو'' اب اماں جی نے تھوڑا توقف کیا، کچھ سوچا، پھر یہ دعا مانگی:

''میرے اللہ! اگر وہ قاتل نہیں تو اسے کچھ نہ کہنا اور اگر وہ قاتل ہے تو اس کی بوٹی بوٹی کر دینا۔''

اب آپ ذرا ضیاء الحق کے انجام اور اس دعا کے بارے میں سوچیے۔ ہم نہیں کہتے، سنا ہے البتہ، کہ جہاں اس کی مبینہ قبر ہے وہاں چند جسمانی اعضاء ہی دفن کیے گئے تھے۔

آپ پابند ہیں، میں پابند نہیں

آل سعود میں آپ کو بے انتہا عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ 1985ء کا ذکر ہے آپ سعودی عرب کے دورے پر تھے۔ ایک روز پرنس سلطان بن عبدالعزیز کے ساتھ آپ کی ملاقات طے تھی۔ جو ان دنوں غالباً سعودی ولی عہد دوم تھے۔ اس مجلس میں ''امریکا'' زیر بحث آ گیا۔ آپ نے اپنے خاص انداز میں امریکا کے خلاف کھلی ڈلی گفتگو شروع کر دی۔ پرنس سلطان نے آپ کو ہاتھ ہولا رکھنے کو کہا۔ آپ نے کہا ''آپ پابند ہیں، میں پابند نہیں۔''

بندے تو ٹرک کے نیچے بھی آ کر مر جاتے ہیں

زندگی سے کس کو پیار نہیں ہوتا لیکن اپنے نظریات کے لیے زندگی کی پروانہ کرنا اور

مرنے کے لیے تیار رہنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ علامہ شہید کے بھائی شیخ محبوب الٰہی کہتے ہیں کہ حادثہ لاہور سے چند ماہ قبل وہ کراچی میں تھے۔ کسی مجلس میں بیرسٹر ثمین خان سے ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا کہ یہ علامہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بیرسٹر ثمین خان علامہ کے تحریک استقلال کے دنوں کے ساتھی تھے۔ کہنے لگے کہ "علامہ کو سمجھائیں کہ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال کریں۔ انہوں نے دشمنیاں بہت بڑھا لیں ہیں اور ان کی جان بہت خطرے میں ہے۔" ہم تیسری دنیا کے باسی جہاں عموماً فوج حکمران رہتی ہے کبھی برسر عام اور کبھی پس پردہ فوج ایجنسیوں کے ذریعے حکمرانی کرتی ہے۔ اور تیسری دنیا کی یہ ایجنسیاں کبھی بندے اٹھواتی ہیں اور کبھی آگے بڑھ کر ان کو ختم کرنے کے فیصلے بھی کرتی ہیں اور جو افراد ان ایجنسیوں سے براہ راست یا بالواسطہ رابطے میں ہوتے ہیں، گاہے ان کے کان میں ایسی خبریں پڑ جاتی ہیں کہ آج کسی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا فیصلہ ہوا اور ضیاء الحق کا دور تو "اسلامی" بھی تھا۔ ہمارے بعض سادہ دل و دماغ کے "صوفیوں" کو آج تک اس دور میں اسلام کی بلکہ خلفاء راشدین کی جھلک نظر آتی ہے۔ بھلا کور چشمی کا کیا علاج۔

شیخ محبوب الٰہی یہ خبر سن کر پریشانی کے عالم میں لاہور آئے۔ سیدھے علامہ کے گھر گئے۔ علامہ لائبریری میں تھے مگر شیخ محبوب الٰہی سیدھے گھر کے اندر چلے گئے اور لابی میں بیٹھ کر زار و قطار رونے لگے۔ اندر سے علامہ کی اہلیہ محترمہ ان کی آہ و بکا سن کر باہر آئیں اور پوچھا کیا ہوا۔ اب جواب ندارد اور آہیں کراہوں میں بدل گئیں۔ انہوں نے لائبریری کی طرف منہ کر کے آواز دی کہ "علامہ صاحب دیکھیں محبوب الٰہی کیوں روئے جا رہا ہے اور بات کچھ نہیں بتاتا۔" علامہ اندر آئے اور شفقت آمیز ڈانٹ میں پوچھا "اوئے کی گل ای۔" شیخ محبوب الٰہی نے بتایا کہ بیرسٹر ثمین خان یوں کہتا ہے۔ آپ ہنسنے لگ گئے۔ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے اور کہا "بندے ٹرک کے نیچے بھی تو آ کر

مر جاتے ہیں۔ اگر میری موت اللہ کے راستے میں آ جائے تو اس سے بڑی سعادت کی بات کیا ہو گی۔“

اپنے والد کا احترام

علامہ شہید اپنے والد کا بے انتہا احترام کرتے تھے اور حاجی ظہور الٰہی خود بھی ایک دبنگ آدمی تھے۔ علامہ اپنے والد کے سامنے کبھی ننگے سر نہ جاتے تھے۔ ہمیشہ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ ان کے سر پر ٹوپی موجود ہو۔ ایک بار گوجرانوالہ گئے۔ والد کا گھر قریب آیا تو ڈیش بورڈ کھولا جس میں ٹوپی نہ تھی۔ آپ نہایت پریشان ہوئے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ کچھ خفا بھی کہ میں کس طرح ان کے سامنے جاؤں گا، میرے پاس تو ٹوپی بھی نہیں۔

علامہ کو اپنے والد سے عجیب طرح کا پیار تھا۔ اس کا ادراک حاجی ظہور الٰہی صاحب کو بھی تھا۔ اپنی اہلیہ سے کہا کرتے تھے کہ ”دیکھنا اگر میں مر گیا تو سب سے زیادہ احسان الٰہی نے رونا ہے۔“ لیکن حاجی ظہور الٰہی یہ کب جانتے تھے کہ ان کو تو خود احسان الٰہی کی جدائی میں رونا پڑے گا۔ پھر جب حاجی ظہور الٰہی صاحب کو دل کا دورہ پڑا تو وہ ریاض میں تھے، بے ہوش تھے، ایسے میں بولنا شروع ہو گئے وہ احسان الٰہی کا، میرے بیٹے کا جنازہ آ رہا ہے، صفیں سیدھی کر لو، میں جنازہ خود پڑھاؤں گا اور پھر جنازہ پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح حاجی صاحب نے بے ہوشی کی حالت میں مکمل جنازہ پڑھایا۔ بیٹے کی محبت باپ کے لاشعور پر بھی حاوی تھی۔

حاجی صاحب مرحوم کو اس بات کا قلق تھا کہ زندگی میں وہ علامہ کے بہت قریب نہ رہ سکے۔ اس کی ایک وجہ حضرت علامہ کے بعض حاسد بھی تھے، جو ہر وقت حاجی صاحب کے کان بھرتے رہتے تھے۔ حاجی صاحب علامہ کے طرزِ سیاست سے متفق نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علامہ تدریسی زندگی اختیار کریں اور حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی

مسند حدیث سنبھالیں۔ اسی نیت سے انہوں نے علامہ کو پڑھایا تھا۔ لیکن قدرت کو آپ سے اس سے زیادہ اور بلند تر کام لینا مقصود تھا۔ اللہ نے علامہ کو مسلک اہل حدیث سے وابستہ افراد کی سوچ وفکر کا دھارا بدلنے کے لیے چنا تھا۔ سو علامہ اس میدان عمل میں نکل گئے۔ حاجی صاحب سیدھے سادے مسلمان تھے۔ مسلک اہل حدیث کے لیے مزاج میں شدت تھی، ایسی شدت کہ جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے کہ ؎

یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لیے ہے

حاجی ظہور الٰہی کے اس مزاج سے لوگ یوں فائدہ اٹھاتے کہ ان سامنے علامہ کی داڑھی، آپ کی سیاست اور اس جیسے دوسرے اعتراضات اٹھاتے جو صریحاً بدنیتی پر مبنی ہوتے۔ جواباً حاجی ظہور الٰہی مرحوم کے غیرت ایمانی پر مبنی ردعمل کو لوگوں نے عجیب رنگ پہنانے شروع کر دیئے۔ جیسے علامہ سے ان کے والد زندگی میں ناراض رہے اور یہ کہ جیسے رابطہ ہی نہ رکھا۔ یہ طبقہ حسود کی پھیلائی غلط فہمیاں اور جھوٹ تھے۔ وگرنہ جب حاجی صاحب علامہ کی زندگی میں بیمار ہوئے تو علامہ کے گھر ہی ٹھہرے۔ بلکہ ایک دل چسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ حاجی صاحب ہسپتال میں داخل تھے۔ علامہ صبح و شام انہیں دیکھنے آتے۔ ایک روز شام ڈھلے آئے اور محسوس کیا کہ جیسے ڈاکٹر لاپرواہی سے کام لے رہے ہیں۔ اس پر علامہ نے ڈاکٹروں کو ڈانٹ دیا۔ حاجی صاحب اس پر علامہ صاحب سے خوب ناراض ہوئے کہ "تم تو چلے جاؤ گے تو یہ مجھے نقصان پہنچا دیں گے۔"

رات عشاء کے بعد گھر سے باہر نہیں رہنا

علامہ کا معمول تھا کہ رات دیر سے ہی گھر آتے اور اگر کبھی جلسہ وغیرہ ہوتا تو مزید تاخیر ہو جاتی۔ ہسپتال سے فارغ ہو کے حاجی صاحب چند روز علامہ کے ہاں ٹھہرے۔ وہی معمول کہ رات کو دیر گئے گھر آتے اور آنے کا انداز بھی اپنا ہی تھا کہ ابھی گھر دور ہوتا تو گاڑی کا ہارن دینا شروع کر دیتے اور آنے تک دروازہ کھل گیا ہوتا۔ ایک آدھ روز تو

حاجی صاحب نے اس معمول کو دیکھا۔ پھر علامہ کو بلایا ''اگر چاہتے ہو کہ میں چند روز یہاں ٹھہروں تو رات عشاء کی نماز کے بعد گھر سے باہر نہیں رہنا۔'' اور اس کے بعد جتنے روز حاجی صاحب اُدھر رہے علامہ بہت سعادت مندی سے ان کی ہدایات کے مطابق رہے۔ رہا کسی ایک آدھ معاملے میں اختلاف تو یہ ہلکا پھلکا معاملہ تھا، یاروں نے فسانے بنا لیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب احسان الٰہی ظہیر غیر متوقع طور پر دنیا سے چلے گئے اور پاکستان اور دنیا بھر میں اہل علم اور اہل دنیا نے جس طرح حاجی ظہور الٰہی سے تعزیت کی اور جس طرح ان کی عزت افزائی کی اور سب سے بڑھ کر جس طرح علامہ کی اسلام کے لیے خدمات اور بلند مقام کا تذکرہ کیا، اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کا بیٹا کس رتبے کا حامل تھا ورنہ اس سے پہلے انہیں اس کا ادراک نہیں تھا کہ وہ کس بڑے بیٹے کے باپ ہیں۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ ایک روز اپنی اہلیہ سے کہنے لگے ''مجھے نہیں علم تھا کہ احسان الٰہی دین کے لیے اتنا کچھ کر رہا ہے۔ میں تو جدھر جاتا ہوں اسی کے تذکرے ہی سننے کو ملتے ہیں۔'' شاید اس لیے ہی ایک روز رکشہ کروایا اس پر ''سپیکر'' نصب کروایا اور خود ہی گوجرانوالہ میں حافظ ابتسام الٰہی ظہیر کے جلسے کا اعلان کرنے نکل گئے۔ اب حاجی صاحب خود اعلان کر رہے ہیں کہ ''آج گوجرانوالہ میں فلاں مسجد میں ابتسام الٰہی ظہیر کا خطاب ہوگا۔''

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی

ہمارے ملک کی انتظامیہ کا عجیب حال ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دب جائے تو یہ اس کے اوپر چڑھ دوڑتے ہیں اور جو کوئی ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جائے، یہ اس کے آگے بھیگی بلی بن کر اس کے پاؤں پڑ جاتے ہیں۔ رمضان کے دن تھے، نماز تراویح کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ مرکز لارنس روڈ کے دروازے پر لاہور کا ڈپٹی کمشنر مودب انداز میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ علامہ کا منتظر تھا۔ اتنے میں آپ تشریف لے آئے۔ وہ آگے بڑھا، آپ نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور پوچھا ''آج آپ

بھولے سے کہاں نکل آئے؟۔'' "میں آج ادھر......" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر آپ کو دیا۔ آپ نے اپنی عینک پیشانی پر رکھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ آپ کے پڑھنے کا خاص انداز تھا کہ آپ کی دور کی نظر کمزور تھی اور قریب کی ٹھیک تھی۔ اس لیے کوئی شے پڑھنے کے لیے عینک اوپر ماتھے پر کر لیتے تھے۔ ہم اس کو آپ کا سٹائل سمجھتے تھے لیکن آج جب اپنی عمر چالیس سے اوپر ہو گئی ہے تو ہم بھی یہ "سٹائل مارنے" لگ گئے ہیں کہ عینک کے ساتھ پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ آپ جوں جوں پڑھتے جا رہے تھے، توں توں آپ کے ماتھے پر شکنیں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں اور چہرے پر غصے کے تاثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ اصل میں یہ ایک درخواست تھی جو مرکز لارنس روڈ کی عقبی بستی کے کچھ "با اثر" مکینوں نے ڈپٹی کمشنر کے نام لکھی تھی۔

مدعا ان کا یہ تھا کہ اس مسجد کے سپیکر بند کروائے جائیں جن سے ابھرنے والی اذان کی آواز کی وجہ سے ان کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ اصل میں تو بہانہ تھا ورنہ تکلیف ان کو اہل حدیث مرکز کی تھی کیونکہ اس محلے کے اکثر مکین شیعہ تھے اور کھاتے پیتے، اثر و رسوخ والے تھے۔ اب علامہ نے درخواست ڈپٹی کمشنر کے سامنے ہی پرزے پرزے کر دی اور کسی حد تک ڈانٹنے کے انداز میں اسے کہا کہ "آپ نے درخواست وصول ہی کیوں کی تھی۔ آپ نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ مسجد احسان الٰہی ظہیر کے زیر انتظام ہے؟۔" وہ بے چارہ لجاجت آمیز لہجے میں معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ "جی درخواست تو ہم کو سب کی وصول کرنا ہی پڑتی ہے۔" اب اس سے رخصت ہو کر آپ اندر تشریف لائے۔ ہم سب دوست قریب کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے "اوئے لڑکو! چلو اوپر برآمدے کی چھت پر چڑھو اور یہ نیچے والے ہارن اٹھا کر اوپر والی چھت پر رکھ دو اور ان کا رخ پچھلی طرف کر دو۔" اور ایسا

ہی کر دیا گیا۔ پھر ان کی زندگی میں کسی کو جرأت نہ ہوئی کسی بھی قسم کا نامعقول مطالبہ کرنے کی اور آپ کے بعد؟؟

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

لگے ہاتھوں یہ تلخ قصہ بھی سن لیجئے شاید کہ کوئی آپ کو نہ سنا سکے۔ اِدھر حضرت علامہ کی غم ناک شہادت کے بعد پہلا رمضان المبارک آیا اور اُدھر علاقے کا پولیس انسپکٹر بھی آ گیا۔ اس نے باہر والے سپیکر بند کرنے کا مطالبہ کر دیا کہ جی اوپر سے آرڈر آیا ہے۔ اس ''اوپر کے آرڈر'' کا لفظ سن کر کچھ لوگوں کی ٹانگیں کانپنا شروع ہو گئیں۔ حکم کی فوری تعمیل کی گئی اور سارے بیرونی سپیکر اتار دیئے گئے۔ محض اندرونی سپیکر رہنے دیئے۔ تب ابھی مسجد کی تعمیر شروع نہ ہوئی تھی۔ لوہے کے ستونوں پر عارضی چھت ڈالی گئی تھی۔ ہم ابھی چھوٹے تھے مگر ''کبر نی موت الکبریٰ'' [1] اتنی عقل ضرور آ گئی تھی کہ اس معاملے کو سمجھ سکتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مسجد کی انتظامیہ کے بعض افراد کو علامہ شہید کا واقعہ سنا کر عرض کیا کہ آپ سپیکر نہ اتاریں ورنہ یہ لوگ یہیں نہ ٹھہریں گے۔ ان کے مطالبے بڑھتے جائیں گے لیکن

ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

وہی ہوا، جس کا ہمارے ایسے نو آموزوں کو اندیشہ تھا۔ سپیکر اتر گئے۔ اس کے بعد مرکز کا نقشہ منظور کرانا ہی ایک عذاب بن گیا اور جب منظور ہوا تو انتظامیہ کی شرائط پر۔ صرف مسجد بنانے کی اجازت مل سکی۔

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ

---

[1] بڑوں کی جدائی نے مجھے بڑا کر دیا۔

تمہاری پابندی میرے جوتے کی نوک پر

رات بھیگ چلی تھی۔ میں اور ذلفی سڑکوں پر خاموش گھوم رہے تھے نہ وہ مجھ سے کوئی بات کر رہا تھا نہ میرا بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کے پاس ''سیبر و'' گاڑی تھی۔ ذلفی نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیر آن کر دیا۔ اداس سی فضا میں ایک توانا آواز ابھرنا شروع ہوگئی:

''تم نے کہا اس کی کتاب بریلویہ پر پابندی ہے،
تمہاری پابندی میرے جوتے کی نوک پر،
میں نے اس پابندی کے بعد اس کے دس ایڈیشن شائع کیے۔''

اس توانا آواز کا مخاطب اس وقت کا ڈکٹیٹر غاصب جرنیل ضیاء الحق تھا۔ ہماری آنکھوں میں بہتے آنسو تھے اور چہرے گاڑی سے باہر کی طرف تھے کہ کہتے ہیں کہ مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے لیکن کوئی ایک غم ہوتا تو شاید ہمیں بھی قرار آ جاتا۔ متنبّی نے صدیوں پہلے کہا تو تھا ؏

رمانی الدھر بالارذاء حتیٰ
فوادی فی غشاءٍ من نبالِ

جرأت اور بہادری کی معراج ...... یہ الفاظ ''حرمین شریفین کانفرنس'' کے تھے۔ جو مسجد قدس (چوک دالگراں، لاہور) میں اہل حدیث جماعتوں کا مشترکہ پروگرام تھا اور ''یا رسول اللہ کانفرنس'' کا ردعمل اور جواب تھا۔ معلوم نہیں بریلوی طبقے کے دونوں بڑے لیڈروں شاہ احمد نورانی اور عبدالستار خان نیازی کو کیا سوجھی کہ ''یا رسول اللہ کانفرنس'' کا انعقاد کر دیا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ مکہ اور مدینہ دونوں شہر چونکہ مسلمانوں کا مشترکہ اثاثہ ہیں، اس لیے ان کو سعودی وہابی کنٹرول سے آزاد کر دیا جائے اور ''کھلا شہر'' قرار دیا جائے۔ تاکہ ہم وہاں اپنا مخصوص رنگ نمایاں کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے ان دونوں

حضرات نے یکے بعد دیگرے دو تین کانفرنسیں مختلف شہروں میں منعقد کر دیں۔ اس وجہ سے اہل حدیث اور بریلوی حضرات میں جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ماحول تھا، وہ خاصا خراب ہو گیا۔ نہیں معلوم ان کی پشت پر کون تھا لیکن مقصد نہایت مذموم تھا۔ اس کے جواب میں علامہ شہید نے حرمین شریفین کانفرنس کے انعقاد کا منصوبہ بنایا اور اختلافات کے باوجود اس کانفرنس میں تمام اہل حدیث دھڑوں کی شمولیت کو یقینی بنایا۔ معروف عراقی محقق الشیخ بشار عواد معروف ان دنوں آپ کی دعوت پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ انہیں بھی آپ کانفرنس میں لے کر آئے۔ وہ دلچسپی اور حیرانی سے یہ کانفرنس دیکھتے رہے۔ بغیر ڈاڑھی کے شیخ بشار کا علامہ شہید نے تعارف بھی بڑا دل چسپ کروایا کہ ''آج کے دور کا ایک بڑا محدث ہمارے درمیان بیٹھا ہے، اگرچہ بغیر داڑھی کے ہے۔'' علامہ شہید نے اس دن تاریخی تقریر کی۔

مشرک کی دوائی نہیں کھائی جا سکتی

اہل حدیث کے گھر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے یہ سبق سب سے پہلے پڑھایا جاتا ہے کہ بیٹا کٹ جانا، مر جانا لیکن اللہ بزرگ و برتر کی ذات سے کبھی شرک نہ کرنا اور جب بیٹا بھی حاجی ظہور الٰہی جیسے بندے کا ہو۔ سو علامہ شہید توحید کی غیرت کے معاملے میں ایسے ہی تھے۔

وزیر آباد میں کوئی حکیم تھا اور اپنے فن میں مہارت کے حوالے سے خاصا شہرت یافتہ تھا۔ علامہ اس کے پاس گئے، اپنی صحت کے حوالے سے اس سے مشورہ کیا۔ اس نے دوا دی۔ اب حکیم صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ حکیم صاحب نے اپنی ''رشحات فکر'' پر مبنی کچھ لٹریچر علامہ کو دیا۔ آپ ادھر سے اٹھے اور واپس سیالکوٹ کے لیے عازم سفر ہوئے۔ راستے میں حکیم کا کتابچہ پڑھنا شروع کیا اور حکیم کے گمراہ کن عقائد کو دیکھا اور یہ کہتے ہوئے دوائی گاڑی کی کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دی کہ

''صحت پر سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے، کسی مشرک کی دوائی نہیں کھائی جا سکتی۔''

میں ہر شخص کو اس کی جگہ پر ہی رکھتا ہوں

لوگوں کو ان کی حیثیت اور اہمیت کے حوالے سے ان کا مقام دینا آپ پر ختم تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب آپ شہید ہوئے تو آپ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کا گمان تھا کہ آپ اس سے دوسروں سے ہٹ کر پیار کرتے تھے اور تعلق رکھتے تھے اور بسا اوقات ایسا سلوک مصلحت کی وجہ سے بھی ضروری ہوتا ہے، جیسے اس روز ہوا کہ جب بھائی عبدالمجید شاکر حضرت علامہ کے ساتھ کہیں کام نکل رہے تھے کہ لاہور کے ایک اہل حدیث مولوی صاحب آ گئے۔ ان کا نام لینے کا کیا فائدہ؟ آج کل بڑے عہدے پر ہیں، آپ نے ان کو خاصی ''لفٹ'' کروائی۔ رخصت ہوئے تو بھائی عبدالمجید نے شکوہ آمیز انداز میں کہا کہ ''آپ نے اس کو ایسی اہمیت کیوں دی؟ یہ کبھی آپ کے ساتھ ہو جاتا ہے، کبھی ادھر کبھی ادھر'' علامہ نے محبت بھرے اس شکوے کا متبسم لہجے میں جواب دیا ''یار عبدالمجید میں ہر پرزے نوں اودی جگہ اتے فٹ رکھنا آں'' پھر مزید محبت سے سمجھاتے ہوئے کہنے لگے ''یار بات یہ ہے کہ یہ بندہ سارا دن بیس جگہ پر جائے گا، اگر میں اس کے ساتھ ترش روئی سے پیش آتا تو اس نے جس جگہ بیٹھنا تھا میرے خلاف ہی بات کرنی تھی اور اب جس جگہ میرا ذکر کرے گا یا تو اچھا کرے گا اور نہ بھی کرے تو کم از کم ''برائی'' تو نہیں کرے گا۔'' اندازہ کیجیے کس ذہانت اور سمجھ داری کا شاہکار تھا یہ شخص۔

اب میرے پاس آپ کے لیے وقت نہیں

میرا آبائی گاؤں کوٹ رنجیت سنگھ ہے۔ جہاں سے میرے والد مولانا عبدالخالق قدوسی کا تعلق تھا۔ میرے والد تو طالب علمی کے زمانے میں ہی وہاں سے نکل آئے اور یوں ہم ''لاہوریے'' بن گئے لیکن میرے تایا اور چچا اور ان کی اولاد وہیں آباد ہے۔ والد

محترم کی شہادت سے چند سال قبل میرا خاندان گاؤں میں کچھ تنازعات میں الجھ گیا اور قتل و غارت گری کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں ایک دفعہ شیخوپورہ کے ایک جج سے سفارش کرنے کی ضرورت آن پڑی۔ والد نے بھائی عبدالمجید کو علامہ کی طرف بجھوایا۔ اب حضرت علامہ شہید کو سارے حالات و واقعات کا علم تھا اور ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ ہم لوگ حق پر ہیں۔ آپ فوراً شیخوپورہ چلنے کو تیار ہو گئے۔ آپ بھائی عبدالمجید کے ساتھ نکلنے کے لیے 475 شادمان کے دروازے پر کھڑے تھے کہ ایک بڑی سی سرکاری گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے محکمہ ٹیلی فون کے بڑے صاحب برآمد ہوئے۔ وہ بھی کسی کام سے آپ کو ملنے آئے تھے لیکن ان کا مقررہ وقت گزر چکا تھا۔ وہ خاصی تاخیر سے آئے تھے۔ آپ نے ان سے کہہ دیا کہ "جائیے صاحب آپ کے ساتھ طے شدہ وقت گزر چکا ہے۔ اب میرے پاس آپ کے لیے کوئی وقت نہیں۔ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔" اس بے چارے نے لجاجت سے چند منٹ مانگے۔ کچھ عبدالمجید شاکر بھائی نے کہا کہ ان کی بات سن لیں تو آپ نے اس کو وقت دیا۔ آپ اپنے وقت کی بے انتہا قدر کرتے اور بڑے سے بڑے عہدے کے مالک سے مرعوب بھی نہ ہوتے لیکن دوسری طرف جماعت کے عام کارکن کو کسی سے بھی زیادہ اہمیت دیتے۔

شیر کی لاش پہ تصویریں

جب ٹیپو سلطان میدان جنگ میں بہادری سے لڑتے مارے گئے اور اللہ نے (ان شاء اللہ) انہیں شہادت دے دی تو ان کی لاش پر دھوکے سے مروانے والے بڑے خوش ہو کر کھڑے تھے۔ ایسے ہی جب شیر کو، ہانکے سے گھیر کر یا چھپ کر فائر کر کے شکار کر لیا جاتا ہے تو شکاری بڑے فخر سے اس کی لاش پر فوٹو سیشن کروا رہا ہوتا ہے۔

اس طرح علامہ شہید جب تک زندہ رہے بہت سے ایسے لوگ جو آپ کی غیر موجودگی میں بھی آپ کے خلاف ہوتے ہوئے ڈرتے تھے، اب بزعم خویش بقراط بنے

بیٹھے ہیں۔ یعنی وہی لاش پر فوٹو سیشن۔ ایسے ہی ایک دن میں مشہور خطاط عبدالرشید قمر کے پاس بیٹھا تھا اور ایک مولانا ''بقراط'' وہاں تشریف فرما تھے۔ اب لگے درفطنیاں چھوڑنے۔ میں نے حوصلے سے ان کی بات سنی اور پھر آرام سے ایک جملہ بولا اور اس کے بعد تو چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ فوراً ہی ''منتوں ترلوں'' پر آ گئے۔ ''نہیں یار اب ایسا تو نہیں کرتے نا'' یہ کہا اور اپنے جوتے اٹھائے اور اٹھ بھاگے۔ جی ہاں میرا جملہ یہ تھا ''ٹھیک ہے مولانا آج ہی میں آپ کے حوالے سے ابتسام الٰہی ظہیر سے اس بات کی تصدیق کر لیتا ہوں۔''

اصل میں ان کور چشموں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ علامہ تو دنیا سے گئے، اب اپنی کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاف کیجیے میں جذباتی ہو رہا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کوئی غیر مسلک کا بندہ حتیٰ کہ وہ اہل حدیث بھی جس کا ان سے تعلق نہ رہا ہو، ان پر تنقید کرے تو ہم مسکراتے رہتے ہیں کہ یہ ان کی علامہ سے ''بے خبری'' کا بھی فیضان ہے۔ اندازہ کیجیے کہ محترم جناب اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب 'ہفت اقلیم' میں علامہ پر مضمون لکھا۔ اس میں چند جملے نقد کے بھی تھے اور اس پر بھٹی صاحب کو شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا اور اس کتاب کا ناشر بھی میں تھا۔ جناب اسحاق بھٹی صاحب نے کس دن علامہ زندہ باد کے نعرے لگائے۔ کس دن علامہ شہید سے فائدے اٹھائے کہ وہ محض علامہ کی تعریف کرتے لیکن وہ لوگ جن کو معاشرے میں کوئی جانتا تک نہ تھا محض علامہ کے دست شفقت کے سبب اعلیٰ حیثیتوں پر براجمان ہو گئے اور اب لوگ انہیں جاننے لگے ہیں۔ جب اس طرح کے ''احسان فراموش'' علامہ کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

میں کہا کرتا ہوں کہ دنیا میں باقی صرف دو چیزیں رہ جاتی ہیں۔ ایک وہ کارہائے نمایاں جو تلوار کے زور پر انجام دیئے جائیں کہ دنیا آج بھی فاتحین کے کارناموں پر

داد و تحسین کے آوازے بلند کرتی ہے۔ دوسرے وہ کام جو لوگوں نے اپنے قلم کی سیاہی کو اپنا خون جگر پلا کر لکھے ہیں کہ آج بھی ان لوگوں کے نام زندہ ہیں جو تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اور علامہ شہید نے اپنی کتب کے ذریعے اپنی حیات جاوداں کا مکمل سامان کر لیا ہے۔

کاش احسان الٰہی ظہیر اہل حدیث نہ ہوتا

عراق اور ایران کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو بظاہر تو یہ شط العرب کا جھگڑا تھا۔ برسوں پر محیط یہ جنگ دونوں ملکوں کے لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار گئی۔ عراق اور عرب معیشتیں اس سے بری طرح لرز گئیں۔ اگر پس پردہ حقائق پر نظر رکھی جائے تو یہ محض زمین کے ایک ٹکڑے کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ معاملہ اس سے کہیں آگے کا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ عراق ایران جنگ تب ختم ہو گئی تھی مگر جو جنگ اس کے بطن سے نکلی ہے وہ آج بھی جاری ہے اور روز بروز اس کی شدت و حدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جب ایران میں آیت اللہ خمینی اور ان کے حواری شاہ ایران کا تختہ الٹ کر حکومت پر قابض ہوئے تو انہوں نے اپنے اس قبضہ کو اسلامی انقلاب کا نام دیا۔ حالانکہ یہ ایک فرقے کا انقلاب تھا، اسلام سے اس کا کیا تعلق۔ معاملہ اگر ایران کی حدود تک رہتا تو گوارا تھا۔ ایرانی مولویوں کی اس متعصب مذہبی حکومت نے اپنے ارادوں کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس انقلاب کو ایرانی سرحدوں سے باہر تک لے جائیں گے۔ اس کے پس پردہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے ساتھ ساتھ قدیم ایرانی حکمرانی کا تصور بھی کارفرما تھا۔ اور یہ ہی وجہ تھی اسلامی انقلاب نے قدیم ایران کے جشن نوروز کو بھی سینے سے لگائے رکھا جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایران کے ان فکری توسیع پسندانہ عزائم نے عرب حکمرانوں کو پریشان کر دیا اور جب صدام حسین کی ایران سے لڑائی چھڑ گئی تو سارے عرب صدام کی پشت پہ کھڑے ہو گئے اور یہ شیعہ سنی جنگ بن گئی۔ یہ جنگ آج تک

چل رہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایران کی اس جنگ میں امریکہ اس کا ہم نوا ہے۔ رہی بیانات کی جنگ سب نورا کشتی تھی اور اب تو کھل کر تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ عراق پر موجودہ شیعہ حکومت امریکہ کے زیر سایہ قائم ہوئی جس میں ایران کی مکمل ہم نوائی اس کو حاصل تھی۔ افغانستان میں طالبان حکومت قائم کرانے یا گرانے میں دونوں اکٹھے تھے۔ شام میں سنی اکثریت پہ اقلیت کی غاصبانہ حکمرانی ہے۔ کرنل قذافی نے کہیں کم مظاہرین مارے تھے اور امریکہ کے طیارے اس پر انسانی حقوق کے نام سے چڑھ دوڑے تھے۔ مگر شام میں لاکھوں سنی افراد ایران کی ہمنوائی میں بشار الاسد نے قتل کر دیئے۔ امریکہ انسانی حقوق یہاں بھول گیا۔ ابھی آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا۔ یہ سارا پس منظر اور پیش منظر ہے اس جنگ کا جو عالم عرب میں ایران اور امریکہ مل کر لڑ رہے ہیں۔ اسی پس منظر میں وہ کانفرنس بغداد میں منعقد ہوئی جس میں ساری دنیا سے اہل سنت کے علماء اکٹھے ہوئے اور صدام حسین اس کے مہمان خصوصی تھے۔ اس کانفرنس کا میلہ علامہ احسان الٰہی ظہیر نے لوٹ لیا۔ نہ کانفرنس کے شرکاء کو اور نہ میزبانوں کو اندازہ تھا کہ اتنا بڑا عربی زبان کا مقرران کے درمیان موجود ہے۔ علامہ نے خطاب شروع کیا جیسے ہر چیز ساکت ہوگئی ہو اور دلوں کی دھڑکن تھم گئی ہو۔ صدام حسین اور اس کے قریبی ساتھی حیرت کے ساتھ دانتوں میں انگلیاں دبائے علامہ کو تک رہے تھے اور علامہ تھے کہ ایک تاریخ رقم کر رہے تھے۔ آج بھی یہ ولولہ انگیز خطاب انٹرنیٹ پر آپ دیکھ سکتے ہیں۔

مجھے ہی پیر بنا لیا ہوتا

علامہ شہید صدر صدام حسین کی دعوت پر موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے عراق تشریف لے گئے۔ پاکستان سے تمام مکاتب فکر کے علماء اور اہم افراد کو اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں آپ نے تاریخی تقریر کی۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے تمام افراد کراچی میں اکٹھے ہوئے۔ جماعت غربا اہل حدیث کے امیر مولانا

عبدالرحمٰن سلفی حفظہ اللہ نے سارے وفد کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد مولانا عبدالرحمٰن سلفی نے علامہ شہید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ احباب جمع ہیں اگر ہلکا پھلکا درس ہو جاتا تو کیا حرج ہے۔ اب ان کو نہیں معلوم تھا کہ حرج تو بہت تھا کہ سارے لوگ اپنی اپنی جگہ ''امام زمان'' اب درس کون دے۔ اب یہ مولانا سلفی کی سادگی اور خلوص تھا کہ ایسی محفل میں درس کی فرمائش کر دی۔ علامہ نے (مولانا) شاہ احمد نورانی صاحب کو مخاطب کیا کہ حضرت آپ بزرگ ہیں، آپ درس دیں گے۔ وہ کہنے لگے آپ جیسے قادر الکلام کے ہوتے ہوئے ہم کیسے بولیں اور معذرت کر لی۔ اس پر علامہ نے مولانا محمد حسین نعیمی کو مخاطب کیا کہ یہ درس دیں گے کہ لاہور کے بڑے شیخ الحدیث ہیں۔ انہوں نے بھی معذرت طلب کی۔ اس پر ہنستے ہوئے محفل میں موجود مولانا عبدالقادر آزاد کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ''امام السلاطین'' بیٹھے ہیں۔ یہ ایک لطیف کنایہ تھا۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کی طرف، جس میں مولانا آزاد نے سارے سربراہان کی موجودگی میں نماز پڑھائی تھی۔ مگر یہاں اقلیم خطابت کے سلطان کی موجودگی میں مولانا آزاد نے بھی معذرت کی اور علامہ کو کہا آپ ہی آج درس ارشاد فرمائیں۔ اور حاجی ظہور الٰہی کے غیور بیٹے نے مختلف مکاتب فکر کے اکابر علماء کی موجودگی میں اس روز بھی مسلک اہل حدیث کی حقانیت پر درس دینا شروع کر دیا۔ علامہ شوخ طبیعت تھے ہی، بذلہ سنج بھی تھے۔ آخر میں کہنے لگے کہ ''شیخ عبدالقادر جیلانی نے احناف کو ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے کے حوالے سے انکار کے سبب گمراہ کہا ہے اگر آپ لوگوں نے مجھے ہی اپنا پیر بنا لیا ہوتا تو کم از کم میں آپ کا اتنا لحاظ تو کرتا کہ گمراہ نہ کہتا۔'' اور محفل ایک بے ساختہ اور بلند آہنگ خوش گوار قہقہے میں برخاست ہوگئی۔

علامہ کا یہ عمل اصل میں ان کے اپنے قول کے مطابق تھا کہ ایک بار حاجی سعید ریشم والے جو کورٹ روڈ کی مسجد سے تعلق رکھتے تھے، علامہ کو اصرار کے ساتھ اپنی مسجد

درس کے لیے کر گئے۔ آپ نے درس دیا۔ بعد میں مولانا عبداللہ ناصر رحمانی کہنے لگے کہ آپ ہمیں نصیحت فرمائیں۔ علامہ نے فرمایا ''اس تقریر کو تقریر نہ سمجھنا جس میں مسلک اہل حدیث کی بات نہ کی گئی ہو۔''

جو بے غرض ہو جاتا ہے وہ بے پناہ ہو جاتا ہے

سعودی شاہی خاندان اور حکومت کے ذمہ داران میں علامہ شہید کی بے انتہا عزت کی جاتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا کہ ''جو بے غرض ہوتا ہے وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔'' علامہ بھی بے غرض ہو گئے تھے۔ عمر بھر بہترین انداز میں کاروبار کیا۔ بے تحاشا کمایا اور جو کچھ کمایا، اس کا بہت سا حصہ جماعت پہ خرچ کر دیا۔ کچھ مزاج بھی شاہانہ رکھتے تھے۔ کھلے دل اور کھلی جیب کے مالک تھے۔ مجیب الرحمٰن شامی نے لکھا ہے کہ ''اچھا کھلاتے اور اچھا کھاتے تھے اور پھر دوستوں کو اچھا کھلا کر خوش ہوتے تھے۔'' عربوں سے اتنے تعلقات تھے کہ اگر چاہتے تو اس دور میں بھی کروڑوں بنا سکتے تھے لیکن کبھی عزت نفس پہ سمجھوتہ نہ کیا۔ چندے اکٹھے کیے نہ ہاتھ پھیلائے۔ جتنا خرچ کرنا پڑا اپنی جیب سے کر لیا، جب جیب نے اجازت نہ دی تو گزارا کر لیا۔ مرکز اہل حدیث 53۔ لارنس روڈ کی جگہ خریدنے کا فیصلہ کیا تھا اور پیسے اکٹھے کرنے تھے۔ اس وقت بھی آپ نے اپنے قریبی دوستوں اور ٹرسٹ کے اراکین تک ہی خود کو محدود رکھا۔ پھر بھی کام نہ بنا تو مجلس شوریٰ کے اجلاس میں اپیل کی۔ جب عبداللہ عبدالمحسن ترکی افتتاح کے لیے آئے تو غالباً دس لاکھ روپے کا اعلان کیا۔ یہ پہلا اور آخری چندہ تھا جو عربوں نے دیا اور وہ بھی بن مانگے۔ آپ تھوڑے مایوس بھی ہوئے کہ پیسے پھر بھی پورے نہ ہوئے اور لطیفے کی بات ہے کہ اس سے زیادہ پیسے آپ نے اپنی گرہ سے ڈال دیئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب آج سے غالباً دس سال پہلے علامہ کی وراثت تقسیم ہوئی تو پہلی دفعہ آپ کی الماریوں سے آپ کی ذاتی ڈائریوں کو نکالا گیا۔ علامہ کے سب سے

چھوٹے بیٹے ہشام الٰہی ظہیر تھوڑا سا حیران، کچھ اترے چہرے کے ساتھ کہ ماشاء اللہ ذہین کاروباری ہیں، کہنے لگے بھائی جان! ابو نے تو سارا کچھ ہی جماعت پر خرچ کر دیا۔ ہم حیران ہیں اتنا کمایا اور بچایا ہی کچھ نہیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ علامہ کی جماعت کا بے شمار خرچ تھا اور علامہ کو چندے مانگنے کی عادت نہ تھی اور پھر صاف بات ہے، لگی لپٹی رکھے بغیر آپ کو بتاؤں ایک مستقل مسئلہ ''بلیک میلر'' مولوی بھی تھے۔ جو مانگتے رہتے تھے اور علامہ منہ دوسری طرف کر کے دیتے رہتے تھے کہ خود کو بھی پتہ نہ چلے۔ کچھ سال قبل ایک خود ساختہ معزز نے علامہ کے حوالے سے اپنی دریدہ ذہنی کا اظہار کیا تو میں نے پروفیسر قاضی مقبول احمد، جو علامہ کے قریبی دوست تھے، سے اس گھٹیا حرکت کا ذکر کیا تو انہوں نے بے ساختہ کہا کہ ''علامہ کو جماعت نے دیا کیا تھا ساری عمر تو وہ جماعت کو دیتا رہا۔''

اصل بات یہ ہے کہ کوئی اس کو علامہ کی غلطی کہے یا کمزوری، ان کی مجبوری تھی کہ وہ چندے باز نہ تھے۔ جو اخراجات ہوتے تھے جماعت کے جلسوں کے اور دفتر کے ''ملازموں'' کے وہ اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ مل کر اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔

بات دور بلکہ بہت دور نکل گئی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ علامہ عربوں کے ساتھ برابری کی سطح پر ملتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہی تھی۔ اندازہ کیجیے یہ برابری کی سطح کیا تھی کہ ایک روز اس وقت کے سعودی وزیر داخلہ نائف بن عبدالعزیز سے ملنے گئے۔ پرنس نائف نے آپ کو خوش آمدید کہا اور پھر آپ کا ہاتھ پکڑ کر عمارت کی چھت پر واقع ہیلی پیڈ کی طرف لے گئے۔ وزیر داخلہ نے آپ کو اپنے ذاتی ہیلی کاپٹر میں بٹھایا اور دیر تک ریاض کی فضاؤں میں اڑتے رہے۔

مولانا یوسف انور 1979ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سال حضرت

علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی وہیں تھے۔ رابطہ عالم اسلامی کے ایک اجلاس اور اپنی دیگر مصروفیات میں مولانا کو بھی علامہ نے اپنے ہمراہ رکھا۔ اسی حوالے سے وہ اپنے مضمون میں علامہ کے بارے میں اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے فاضل دوست علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی خداداد صلاحیتوں سے کون واقف نہیں، دبنگ و دلیر اور جرات مند عالم دین تھے، وعظ و تبلیغ اور تحریر و تقریر میں اتنی کم عمری میں بہت کم علماء اس قدر شہرت کے آسمان پر پہنچے، علامہ رحمہ اللہ سیاسیات سے لے کر عالمی علمی دنیا میں جانے پہچانے لگے۔

''1973ء میں جب مجھے پہلی بار فریضہ حج کی ادائیگی کی سعادت حاصل ہوئی تو علامہ صاحب سے دوستی تھی کہ انہوں نے بعض اہل علم کے حلقوں اور محفلوں میں مجھے ہمراہ رکھا۔ مکہ معظّمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے ایک اجلاس میں خصوصی دعوت نامہ میرے نام انہوں نے جاری کروایا اور اجلاس میں مجھے بھی کارروائی کی سماعت کا موقعہ ملا اور انہوں نے عالم اسلام کی ممتاز شخصیات سے بھی روشناس کرایا۔ اس اجلاس کے اسٹیج سیکرٹری شہزادہ نائف بن عبدالعزیز تھے، وہ جوان رعنا اور شاہی خاندان کی شاہانہ شخصیت کے مالک تھے مگر ان میں شاہی فخر و غرور کی بجائے اپنے شہید بھائی شاہ فیصل رحمہ اللہ کا سا عجز و انکسار دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے علامہ صاحب کو اونچے اونچے القابات سے عالم اسلام کا ایک ابھرتا ہوا قائد و سیاستدان جیسے الفاظ کے ساتھ مائیک پر آنے کی دعوت دی، چنانچہ علامہ صاحب نے اپنے مخصوص عربی طرز تخاطب اور شعلہ نوائی سے سامعین کو کچھ ایسے گرویدہ کیا کہ وہ عش عش کر اٹھے اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگے۔ کارروائی کے آخر میں رابطہ کے زیر انتظام بہت سی ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جن میں

چند ایک کے ممبر کے طور پر علامہ صاحب کو بھی ان میں شامل کیا گیا۔"

"اجلاس کے اختتام پر کھانے کی ایک بڑی میز پر شہزادہ نائف کی قریبی کرسیوں پر علامہ صاحب اور مجھے بھی بیٹھنے کی سعادت حاصل رہی۔ نامی گرامی عالمی شخصیتوں کی موجودگی اپنے مقام پر تھی مگر شہزادہ نائف کے زیادہ تر مخاطب علامہ صاحب ہی رہے اور دونوں انتہائی بے تکلفی اور شستہ عربی میں عالمی مسائل پر بھی اور پاکستان وسعودی عرب کے پیش آمدہ مسائل وحالات پر بھی گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں شہزادہ نائف نے علامہ صاحب کی عربی کتاب کے سیٹ مندوبین میں تقسیم کیے۔ میرے قریب ہی فیصل آباد کے مشہور بزرگ دیوبندی عالم دین جو ان دنوں اسلامی کونسل کے بھی رکن تھے، میری مراد مولانا مفتی سید سیاح الدین مرحوم سے ہے، انہوں نے مجھے کہا کہ بھئی! آپ کے علامہ صاحب کا بڑا مقام اور شان ہے کہ وہ سب کی توجہات وترجیحات کے مرکز ہیں۔"

علامہ کی علمی حیثیت

یہ تو علامہ کی شخصیت کے حوالے سے چند واقعات تھے۔ علامہ کی علمی حیثیت کا اندازہ بھی کیجیے۔ عبدالخالق آفریدی نے یہ واقعہ ذکر کیا کہ علامہ باب بلال سے نکل رہے تھے۔ سامنے سے ان کے استاد محترم شیخ بن باز رحمہ اللہ تشریف لا رہے تھے۔ مودب شاگرد ٹھہر گئے، سلام کی اور گفتگو شروع ہوگئی۔ علامہ کا ایک پاؤں سیڑھی کے اوپر تھا اور ایک نیچے، اسی حالت میں علمی بحث کا سلسلہ چل نکلا۔ شیخ بن باز کہہ رہے تھے کہ برصغیر کے اہل حدیث بعض مسائل پر غیر معمولی شدت سے کام لے رہے ہیں، مثلاً تقلید وغیرہ۔ اس پر علامہ احسان الٰہی ظہیر نے شد ومد سے پاک و ہند کے علماء کا دفاع کیا۔ باوجود اپنے استاد کے بے حد احترام کے، ذرہ بھر بھی مرعوبیت نہ تھی۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کا حدیث نبوی ﷺ سے شغف

جناب عبدالرشید عراقی کتنی ہی کتب کے مصنف ہیں اور مدت سے قلم و قرطاس کے میدان میں ہیں یہ واقعہ انہوں نے مجھے لکھ کر بھیجا ان کے قلم سے ہی ملاحظہ کیجئے:

سنہ یاد نہیں رہا۔ لیکن جولائی کی کوئی تاریخ تھی کہ پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی مرحوم و مغفور کی دعوت پر علامہ احسان الٰہی ظہیر سوہدرہ تشریف لائے اور جامع مسجد اہلحدیث گئے ریاں میں سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ آپ کے ہمراہ مولانا عطاء الرحمٰن شیخوپوری رحمہ اللہ اور شاعر اہلحدیث مولوی نذیر احمد سبحانی حفظہ اللہ بھی تھے۔ رات کا کھانا حکیم صاحب مرحوم و مغفور کی طرف تھا۔ حکیم صاحب نے راقم آثم کو بھی کھانے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

راقم ترجمان الحدیث میں مضامین بھیجا کرتا تھا اور علامہ صاحب ان مضامین کو وقتاً فوقتاً رسالہ میں شائع کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ راقم نے مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ پر ایک مضمون ترجمان الحدیث میں اشاعت کے لیے تقریباً دو ماہ قبل بھیجا ہوا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا۔ کھانے کے دوران راقم نے علامہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے ابھی تک مولانا فراہی پر مضمون شائع نہیں کیا۔ اس تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ علامہ صاحب نے فرمایا:

''عراقی صاحب مولانا فراہی پر آپ کا مضمون ترجمان الحدیث میں شائع نہیں ہوگا۔ کیا آپ نے شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمہ اللہ کا رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' نہیں پڑھا؟ اس میں مولانا سلفی رحمہ اللہ نے ''منکرین حدیث'' کے گروہ کی تفصیل لکھی ہے اور لکھا ہے کہ

''مولانا شبلی، مولوی چراغ مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید مودودی،

مولانا امین احسن اصلاحی اور عام فرزندان ندوہ ...... مولانا سیّد سلیمان ندوی منکرین حدیث کے گروہ میں شامل نہیں لیکن ان کی تحریروں سے حدیث کا استحقار معلوم ہوتا ہے۔"

اس لیے میں یہ مضمون شائع نہیں کر سکتا۔ مضمون لاہور جا کر آپ کو واپس بھیج دوں گا آپ یہ مضمون عبدالرحیم اشرف صاحب کو بھیج دیں۔ وہ اپنے رسالہ "المنبر" میں شائع کر دیں گے۔

چنانچہ علامہ صاحب نے مضمون مجھے واپس بھیج دیا اور میں نے عبدالرحیم اشرف صاحب کو بھیج دیا اور انہوں نے "المنبر" میں شائع کر دیا۔

حدیث نبوی ﷺ سے علامہ شہید کو عشق تھا اور سنت اور عاداتِ رسول ﷺ کے بارے میں علامہ شہید کا مسلک واضح تھا۔

مجھے آپ سے امیدیں ہیں

ایک روز قاضی عبدالقدیر خاموش اور محمد خان نجیب کسی کام سے حضرت علامہ کے گھر گئے۔ کام کی بات کرنے کے بعد آپ نے پند و نصائح کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر کہنے لگے "مجھے آپ سے کچھ امیدیں اور توقعات ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ اتنی محنت کرتا ہوں۔ آپ نوجوان ہیں۔ آپ نے ہی بعد میں جماعت کی قیادت سنبھالنی ہے۔"

افسوس محمد خان نجیب تو 23 مارچ 1987ء کے حادثے میں ہی شہید ہو گئے اور قاضی عبدالقدیر خاموش شہدائے اہل حدیث کے حوالے سے طویل تحریک چلانے کے بعد تنگ نظری کا شکار ہو گئے، انہیں جمعیت سے نکال دیا گیا بلکہ کتنے ہی ساتھیوں سمیت نکالا گیا۔ یہ ایک ایک کارکن کسی جماعت میں ہوتا تو اس کے ماتھے کا جھومر ہوتا لیکن کسی عمارت کی قدر وہی جانتا ہے جس نے اس کی بنیادوں میں اپنی جوانی کا لہو ڈالا ہوتا

ہے۔ علامہ شہید نے موچی دروازے کے جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"راتوں کو اذانیں دینے کے لیے ہم تھے، پکی ہوئی فصلیں کاٹنے کے لیے تو بہت آ جاتے ہیں۔"

اہل حدیث مطالبات کمیٹی سے جمعیت اہل حدیث تک کا سفر اور پھر 35 شاہ جمال سے 53 لارنس روڈ کا فاصلہ میں نے اپنے لڑکپن کی آنکھوں سے سمٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو شریک سفر بھی نہ تھے، وہ ایک حادثے کے نتیجے میں معتبر ٹھہرے۔ لیکن علامہ شہید نے اس فاصلے کے طے کرنے میں جو صعوبتیں اور کٹھنائیاں برداشت کیں، وہ کسی کو نہیں پتا۔ انہوں نے اس منزل کے حصول کے لیے اپنے تن من پہ جو سہا، لوگ اسے چھو بھی نہیں سکتے ؎

جنیاں تن میرے تے لگیاں
تینوں اک لگے تے توں جانے

اس تمام تر محنت کا صلہ اللہ نے ان کو دنیا میں بھی دیا اور انشاء اللہ جنت الفردوس میں بھی مزے کر رہے ہوں گے ؎

لاکھ ستارے ہر طرف، ظلمت شب جہاں جہاں
اک طلوع آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

جا یار! گول گپے لیا

اچھا کھانا کھانے اور کھلانے کے شوقین تو تھے ہی، ان کو چٹ پٹی چیزیں بھی بہت پسند تھیں۔ قاری حفیظ الرحمٰن ماموں کانجن والے بتاتے ہیں کہ ایک بار ملتان آئے۔ جلسے سے پہلے آرام کر رہے تھے۔ قاری صاحب اور ان کے بڑے بھائی علامہ شہید کو دبانے لگ گئے۔ آپ نے قاری صاحب سے کہا "جا یار گول گپے تے لے کے آ" قاری حفیظ الرحمٰن کہنے لگے علامہ صاحب آپ نے ابھی تقریر بھی کرنی ہے، گول گپے

کھانے سے کہیں گلا نہ خراب ہو جائے۔ آپ مسکرا دیئے اور کہنے لگے "سنا ہے کہ نور جہاں گانا گانے سے پہلے پاؤ بھرا چار کھاتی ہے، نہیں یار گلا خراب ہوتا تم جا کر گول گپے لاؤ" قاری حفیظ الرحمٰن گول گپے لائے اور آپ نے مزے سے کھائے اور پھر شاندار تقریر بھی کی۔ یہ گول گپے کا لفظ بھی اہل پنجاب کے مزاج کے مطابق ہے ورنہ اتنی نازک سی چیز کو اہل کراچی تو "پانی پوری" بولتے ہیں۔

پتہ نہیں گول گپے کے لفظ کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ ویسے یہ لکھتے ہوئے میرا دل چاہ رہا ہے نسبت روڈ نکل جاؤں، جہاں دیال سنگھ لائبریری کے کونے پر بیسیوں سال سے کالے چنے کے ساتھ گول گپے فروخت ہوتے ہیں۔ لارنس روڈ پر بھی گول گپے ملتے ہیں لیکن وہ لوگ تو نہ جانے کیا کچھ نازک سے گول گپے میں ڈال دیتے ہیں آلو، پکوڑیاں، دہی ...... انہوں نے تو گول گپے میں کتنی ہی "بدعات" شامل کر دی ہیں۔

کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

علامہ شہید کے "حاسدین" نے آپ کو تکلیف دینے کا اور بدنام کرنے کا کوئی موقع بھی ضائع نہ ہونے دیا۔ قاضی عبدالقدیر خاموش ان دنوں خانیوال عدالتوں کے چکر لگاتے رہے اور علامہ شہید کے اس معاملے کو نمٹانے میں خوب معاونت کی۔ نومبر 1981ء کا ذکر ہے کہ ان مہربانوں نے ایک عورت "کرائے" پر لی اور نہ جانے کتنے روپے دے کر اس سے عدالت میں یہ دعویٰ دائر کروا دیا کہ علامہ نے اس سے نکاح کیا ہوا ہے اور آپ کا اس سے ایک عدد بچہ بھی ہے اور یہ کہ عدالت اس کا گھر بسائے اور اسے خرچ دلوائے۔ اس سارے کھیل کا بنیادی مقصد علامہ شہید کو بدنام کرنا تھا لیکن یہاں پر بھی سازشی عناصر کو منہ کی کھانی پڑی۔ جب علامہ شہید نے کہا کہ چلیں ٹھیک ہے، اگر میں نے اس سے نکاح کیا ہوا ہے تو پھر میری یہ "بیوی" میرے ساتھ چلے۔

اس پر اس عورت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی حقیقت بیان کر

دے۔ چنانچہ اس نے بھری عدالت میں اقرار کیا کہ اس نے پیسے لے کر یہ کام کیا تھا اور اس نے معافی مانگی اور علامہ شہید نے اس عورت کو معاف کر دیا۔ رہا یہ سوال کہ اس گھٹیا سطح تک اترنے والے آپ کے ''مہربان'' کون تھے اور آپ کی مقبولیت سے خائف ہو کر اس طرح کی چھچھوری حرکتوں کا سہارا لینے والے کون تھے؟ ہم اس کا جواب بھی آج تحریر نہیں کر رہے۔ بس اتنا کہے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہی تھے کوئی غیر نہ تھے۔ لیکن ان کا معاملہ اب اللہ کے ہاں ہے مدعی اور مدعا علیہ دونوں ہی اپنے رب کے حضور جا چکے ہیں۔ دیکھیے وہاں کیا ہونے والا ہے۔ اللہ معاف فرمائے۔

میں یہ سطور لکھ چکا تھا اور ارادہ بھی تھا کہ اس تکلیف دہ اور شرم ناک معاملے کا مختصر سا ذکر ہی کافی ہے۔ اس ذکر سے یہ بیان کرنا بھی مقصود تھا کہ علامہ نے اپنی جماعت کی خاطر کیا کیا مشکلیں اور اذیتیں برداشت کیں وگرنہ خانیوال کی اس عدالت سے عبداللطیف انور نے اس مقدمے کی کاروائی کی ساری فائل نکلوا لی اور مجھے بھجوا دی تھی۔

خانیوال کا یہ سارا قصہ اخبارات میں بھی اہتمام سے شائع کر دیا گیا۔ مقصد صرف علامہ رحمہ اللہ کی بدنامی تھی۔ ضمناً ایک واقعہ نامور خطاط جناب عبدالرشید قمر نے سنایا۔ آپ بھی ان کی زبانی سنیے:

''میں ان دنوں روزنامہ جنگ میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک روز جنگ کے ایڈیٹر اور مالک میر شکیل الرحمٰن نے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا باہر علامہ احسان الٰہی ظہیر اپنے سو کے لگ بھگ ساتھیوں سمیت موجود ہیں اور شدید غصے میں ہیں۔ کل کوئی خبر ان کے خلاف شائع ہو گئی ہے۔ آپ کے تعلق والے ہیں پہلے آپ ان کو ٹھنڈا کریں۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔ میں باہر گیا تو دیکھا علامہ واقعی بہت غصے میں تھے۔ ان کے ساتھ بہت سے لوگ بھی تھے۔ پتا چلا کہ ان کے بارے میں کوئی نامناسب خبر لگی ہے۔ میں

سارا قصہ سمجھ گیا۔ ان کو لے کر میر شکیل کے دفتر میں آ گیا۔ وہیں بیٹھ کر تحقیق شروع ہوئی کہ یہ خبر شائع کس ذریعے سے ہوئی؟ مطلوبہ رپورٹر ڈھونڈا گیا۔ جب وہ سامنے آیا تو جیسے بجلی کا کوندا میرے ذہن میں لپکا۔ میں نے صاف صاف میر شکیل کو بتا دیا کہ چند روز پہلے میں نے اس کو رات کے وقت باہر ''فلاں'' بندے سے جو علامہ کا مخالف ہے، پیسے لیتے دیکھا تھا۔ میر شکیل کا غصہ عروج پہ تھا۔ انہوں نے اسی وقت اس کو نوکری سے فارغ کر دیا اور علامہ سے بھی معذرت چاہی۔''

ابھی پچھلے دنوں ہی یہ ''فلاں'' بندہ بھی اللہ کے پاس چلا گیا ہے اس لیے میں نے اس کا نام اپنی مرضی سے حذف کر دیا ہے وگرنہ عبدالرشید قمر صاحب نے نہ مجھ سے چھپایا تھا نہ چھپانے کی پابندی لگائی تھی۔ بس قارئین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ علامہ نے کسی طرح اپنی جان، مال، عزت ہر شے کو اس جماعت کے لیے قربان کر دیا۔

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت
چھوڑی نہیں غیروں نے کوئی طرز دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت

عبدالرحمٰن 302 نمبریا

شیخوپورہ سے گوجرانوالہ کی طرف جائیں تو تین کلومیٹر کے فاصلے پر میرا گاؤں کوٹ رنجیت سنگھ واقع ہے۔ جو میری ''جنم بھومی'' تو نہیں لیکن میرے اجداد کا مسکن ہے اور میرے والدِ محترم اسی گاؤں سے زندگی کا سفر طے کرنے نکلے تھے۔ اس گاؤں سے نصف کلومیٹر پہلے ایک چھوٹی سی بستی ہے جس میں عبدالرحمٰن نامی ایک شخص رہتا تھا اور قتل و غارت کے لیے مشہور تھا حتیٰ کہ اس کا عرفی نام ہی ''عبدالرحمان 302 نمبریا''

تھا۔ جی ہاں انہی مہربانوں نے جنہوں نے خانیوال کی ایک عورت کو عدالت میں کھڑا کیا تھا اور منہ کی کھائی تھی، اب عبدالرحمٰن کے ذمے لگایا کہ آپ کا کام ختم کر دے تا کہ یہ قصہ ہی تمام ہو جائے۔ عبدالرحمٰن اب اپنے کام کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ آپ تک پہنچتا اور کوئی نقصان ہوتا آپ کو خبر ہو گئی۔ علامہ نے میرے والد کو بتایا کہ یہ معاملہ ہے۔ میرے والد نے کسی طریقے سے عبدالرحمٰن سے رابطہ کیا اور اس کو شرم دلائی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اور اس کو شرم بھی آ ہی گئی اور وہ اس برے ارادے سے باز آ گیا۔

عبدالرحمٰن کو تو شرم آ گئی مگر......

جی ہاں عبدالرحمٰن کو تو میرے والد کے سمجھانے سے شرم آ گئی مگر جو اس معاملے کے محرک تھے، وہ پرلے درجے کے بے شرم ٹھہرے۔ ہوا یوں کہ آپ ایک روز شرقپور اپنی زمینوں پہ گئے ہوئے تھے کہ اوٹ سے چند افراد اسلحہ تانے نکلے۔ بس ان سے غلطی ہو گئی کہ عجلت کر گئے۔ چونکہ فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے آپ کو موقع مل گیا۔ آپ ڈرائیور تو کمال کے تھے۔ گاڑی ریورس گیئر میں ڈالی اور بہت تیز بھگائی اور اس طرح اللہ نے آپ کو بچا لیا۔

امریکہ کے دورے میں قاتلانہ حملہ

اسی طرح جب آپ امریکہ کے دورے پہ گئے تو وہاں آپ کی کئی ایک تقاریر ہوئیں۔ ان دنوں عراق اور ایران کی جنگ جاری تھی۔ ایران میں خمینی کی قیادت میں اثنا عشری شیعہ علماء کی حکومت تھی، جس کا بنیادی مقصد ایرانی شیعہ انقلاب کو دوسرے اسلامی ممالک میں برپا کرنا تھا اور ابھی تک ایرانی حکومت اس مقصد پہ عمل پیرا ہے اور اس کا ہدف حرمین شریفین پہ قبضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حرمین شریفین کی حفاظت فرمائے۔ ایران عراق جنگ میں عرب حکومتیں عراق کی پشت پناہ تھیں کیونکہ یہ جنگ سیاسی سے زیادہ مذہبی بن چکی تھی۔ علامہ شہید کی شیعہ سے متعلق کتب بھی منظر عام پہ آ چکی تھیں۔ ان کتب اور تقاریر کی وجہ سے ایرانی حکومت آپ کی دشمن تھی۔ اس پس منظر

میں کچھ شیعوں نے امریکہ میں آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ فلسطینی طلباء ان کے آڑے آئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی جان بچا لی۔ لیکن فلسطینی طلباء اور چند مخلص احباب کے اصرار کی وجہ سے آپ کو امریکہ کا دورہ مختصر کر کے واپس آنا پڑا۔

چھوٹوں کی رائے کو اہمیت

علامہ شہید اپنے سے عمر میں چھوٹے بھائیوں، دوستوں اور کارکنان کی رائے بھی پوری توجہ سے سنتے، اہمیت دیتے اور مانتے بھی۔ آپ کی کتاب الشیعہ والسنہ طبع ہو چکی تھی۔ انہی دنوں کی بات ہے، ایک روز آپ ’’ہفت روزہ اہل حدیث‘‘ کے دفتر واقع ایبک روڈ پر بیٹھے تھے جو معروف ناشرِ کتب شیخ محمد اشرف کی عمارت میں تھا اور وہیں پر شیخ محمد اشرف کے دفاتر بھی تھے۔ الشیعہ والسنہ کے بارے میں علامہ شہید نے کراچی کے ایک بڑے عالم سے تقریظ لکھوائی۔ یہ تحریر آپ کتاب کی اگلی طباعت میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ تقریظ آپ کے برادر خورد ڈاکٹر فضل الٰہی نے دیکھی۔ ڈاکٹر فضل الٰہی کی رائے تھی کہ آپ کی کتاب کو اس تقریظ کی حاجت نہیں اور نہ یہ کتاب کی شان میں اضافے کا موجب ہوگی۔ علامہ نے اپنے بھائی کی بات نہایت توجہ سے سنی اور تسلیم بھی کر لی اور وہ وقت بھی آیا کہ علامہ شہید کی کتاب کے دنیا کی اٹھائیس زبانوں میں تراجم ہوئے اور جن عالم سے تقریظ لکھوائی گئی تھی وہ اگرچہ اپنے حلقے اور مسلک میں نہایت محترم تھے لیکن علامہ شہید اس کے بعد شہرت اور تعارف میں ان سے کہیں آگے نکل گئے۔

چھوٹے بھائی کی خوشی

علامہ کو اپنے چھوٹے بھائیوں سے بے حد پیار تھا۔ ان کی کسی بھی کامیابی پر حضرت علامہ کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ کی تقرری بطور لیکچرار ریاض یونیورسٹی میں ہوگئی۔ علامہ کے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی۔ شاید اس خوشی کا ایک سبب یہ بھی رہا ہو کہ ریاض یونیورسٹی میں تعینات ہونا بہرحال معمولی

بات نہ تھی۔ علامہ شہید نے اس خوشی میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔

اب ڈاکٹر فضل الٰہی کو بھی اطلاع دی کہ آپ نے بروقت آ جانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے گمان میں نہ تھا کہ دعوت کس پیمانے کی ہوگی۔ وہ خلاف معمول اور غیر متوقع طور پر کچھ تاخیر سے پہنچے۔ آپ ناراض ہوئے کہ ''تمہارے اعزاز میں دعوت ہے اور تم ہی دیر سے آ رہے ہو، جب کہ مہمان آ چکے ہیں۔'' اب ڈاکٹر فضل الٰہی بیان کرتے ہیں کہ ''جب میں نے دعوت کا اہتمام اور رنگ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ گھر کے باہر شامیانے لگے ہوئے ہیں اور لاہور کے سب اہم سیاسی راہنما موجود ہیں۔ نواب زادہ نصر اللہ خان خصوصی طور پر آئے ہوئے تھے اور بہت سے دیگر احباب بھی۔''

علامہ شہید نے اس طرح ڈاکٹر فضل الٰہی کی خوشی میں خود کو شریک کیا۔ ایک بار میں ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب سے ملنے گوجرانوالہ گیا۔ علامہ شہید کا ذکر چل نکلا۔ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کہ ''کئی فضل الٰہی مل جائیں تو ایک احسان الٰہی نہیں بنتا۔''

پھر وہ وقت بھی آیا کہ لیکچرار فضل الٰہی یونیورسٹی میں پروفیسر، کے مقام تک پہنچے اور آج وہ عربی اور اردو میں پچاس کے قریب کتب کے مصنف ہیں اور ان کی کتب کے بنگالی، انگریزی، فارسی، انڈونیشی اور دیگر زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ ان کی کتب بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں اور فروخت اور مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔

نفس کے غلام نہ تھے

علامہ شہید گاڑیوں اور پراپرٹی کا کاروبار بھی کرتے تھے اور اس کاروبار میں بڑا روپیہ اور نام کمایا۔ ان کا حلقہ احباب بے حد متنوع تھا۔ ہر مسلک اور مکتب فکر کے افراد ان کے حلقہ اثر میں تھے۔ لیکن ان ساری چیزوں کے ساتھ ساتھ دینی غیرت بدرجہ اتم موجود تھی۔ مرعوبیت تو نام کو بھی نہ تھی۔

کسی معاملے میں ایک بڑے پراپرٹی ڈیلر کے دفتر جانا ہوا۔ وہ علامہ کا بے تکلف دوست تھا۔ ڈاکٹر فضل الٰہی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ گفتگو کا دور شروع ہوا۔ اب وہ پراپرٹی ڈیلر صاحب کچھ زیادہ ہی بے تکلفی پر اتر آئے اور ڈاکٹر فضل الٰہی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "فضل الٰہی صاحب! آپ بھی ذرا جدید بنئے۔ یہ دیکھئے علامہ کتنے ماڈرن ہیں۔ آپ نے کیا شلوار اونچی چڑھائی ہوئی ہے، ذرا داڑھی کی تراش خراش کیجیے۔" وہ صاحب بولے جا رہے تھے اور علامہ کے چہرے پر تلخی اور سرخی نہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک دم جیسے علامہ پھٹ پڑے اور اس کو تلخ لہجے میں بری طرح ڈانٹ دیا "فضل الٰہی کا حلیہ درست ہے، میرا حلیہ غلط ہے۔ آج کے بعد ایسی بات نہ کہنا۔"

احسان الٰہی دی چھت......

علامہ احسان الٰہی ظہیر کے دادا احمد دین (لالہ جی) کی جان آپ کے اندر تھی کیونکہ حاجی ظہور الٰہی اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اب اکلوتے بیٹے کا پہلا بیٹا، دادا کی آنکھ کا تارا تو ہو گا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر جب مسجد چینیانوالی کے خطیب مقرر ہوئے تو مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر ایک گھر کی بالائی منزل پر رہائش مل گئی۔ اندرون شہر کے مکان صدیوں کے فاصلے طے کرتے ہوئے خستگی کی طرف گامزن ہیں۔ لکڑی کی چھت کہ جس کے بارے میں دادا کو گمان ہوتا اب گری کہ تب گری۔ سیالکوٹ میں جس روز شدید بارش ہوتی، آپ کے دادا کا دل بیٹھ جاتا۔ وہ گمان کرتے کہ لاہور میں بھی ایسی ہی بارش برسی ہو گی، یہ کہتے ہوئے رخت سفر باندھ لیتے "اج احسان الٰہی دی چھت ڈِگ گئی ہوئے گی" لاہور آتے، پوتے کو سلامت دیکھتے تو جان میں جان آتی۔

کاگا تن کھائیو، من کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نینن نہ کھائیو کہ ان کو پیا ملن کی آس

میری تگ ودو کا ایک ہی مقصد

حقیقی بات یہ ہے میری ایک ہی خواہش ہے، میری ایک ہی آرزو ہے، میری تگ ودو کا ایک ہی مقصد ہے، میری جدوجہد کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ اہلحدیث کے جوان اپنے آقا ﷺ کی شجاعت کو اپنے سینوں میں بھرلیں اور خدا کی قسم ہے کہ اگر یہ آقا ﷺ کی شجاعت کے وارث بن جائیں پورے پاکستان کی کوئی قوت اِن کے مقابل کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کرسکتی۔

مرکز اہل حدیث، لارنس روڈ

لارنس روڈ پر علامہ شہید نے آخری سال رمضان میں تراویح اور درس قرآن کا اہتمام کیا۔ کیونکہ مسجد چینیا نوالی میں لوگوں کے لیے جگہ کم پڑ جاتی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ متبادل جگہ کا انتظام ہو۔ جہاں جمعیت کے دفاتر بھی بن جائیں اور مسجد بھی۔

ایک خالی قطعہ زمین سروسز ہسپتال کے سامنے زیر غور آیا۔ اس طرح راوی روڈ پر بھی ایک جگہ میرے والد نے دکھائی۔ لیکن رقیبوں کا قرب اور وہ بھی وہابی، اتنا اچھا نہیں تھا۔ سو اس وجہ سے اس جگہ کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ آخر 53۔ لارنس روڈ پر یہ جگہ پسند آئی۔ آٹھ کنال پر مشتمل پرانی طرز کی کوٹھی جس کے چاروں طرف کھلی جگہ چھوڑی گئی تھی۔ تقریباً دو کنال کا پلاٹ سامنے چھوڑا گیا تھا۔ پرانی طرز کی اس کوٹھی میں کتنے ہی کمرے تھے۔ عین وسط میں داخلی برآمدہ تھا جس کی چھت قدرے نیچی تھی جب کہ ساری عمارت زرد رنگ کی تھی۔

یہ جگہ خریدنے کے فوراً بعد ہی جمعیت کے دفاتر 35۔ شاہ جمال کالونی سے اٹھ کر یہاں منتقل کر دیے گئے۔ اس خریداری کے لیے علامہ شہید کو بہت محنت کرنا پڑی۔ ستر لاکھ روپے میں اس جگہ کا سودا ہوا۔ اس میں سے 10 لاکھ روپیہ علامہ شہید نے اپنی جیب

سے دیا جو کہ اس زمانے میں ایک بہت بڑی رقم تھی۔ باقی انہوں نے اپنے قریبی احباب سے جمع کی۔ اس تمام کدو کاوش کے باوجود رقم کا انتظام نہ ہو سکا اور سات لاکھ روپیہ کم پڑ گیا۔ چنانچہ یہ سات لاکھ روپیہ بھی علامہ شہید نے بطور قرض ساتھ شامل کر دیا۔ بعد میں یہ روپیہ بھی آپ نے چندے کی مد میں لکھوا دیا۔ اس طرح خالص آپ کی جیب سے سترہ لاکھ روپے اس جگہ کی خرید میں شامل ہوئے۔

اس پرانی عمارت کے ساتھ تھوڑے ہی عرصے میں بہت ساری یادیں وابستہ ہو گئیں۔

جمعیت کے دفاتر یہاں مختصر مدت کے لیے رہے اور بہت جلد علامہ نے پرانی عمارت گرا دی تاکہ دفاتر کی باقاعدہ تعمیر شروع کی جائے۔ جبکہ جمعیت کے دفاتر عارضی طور علامہ کی ذاتی عمارت 50 لوئر مال منتقل ہو گئے۔

اہل حدیث یوتھ فورس

جمعیت اہل حدیث پاکستان کی تشکیل کے وقت ہی علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ نوجوانوں کو منظم کیے بغیر کسی تحریک کی کامیابی بہت مشکل ہے۔نوجوانوں کی تنظیم وتربیت میں علامہ کی دل چسپی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ کو پاکستان آئے ہوئے چند سال ہوئے تھے کہ پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ یونین کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ پروفیسر عبداللہ کلیم تب پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ انہوں نے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا لیکن کچھ روز بعد ہی اپنے اس فیصلے کو واپس لے لیا۔ علامہ کو پتا چلا تو بہت تاسف کا اظہار کیا اور کہا کہ ''آپ مجھ سے بات کرتے، میں آپ کے الیکشن کے تمام اخراجات کا انتظام کر دیتا۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دنوں میں جب آپ خود نوجوان تھے، علامہ کو کتنی دل چسپی تھی نوجوانوں کی قوت کو بروئے کار لانے کی۔ یہی وجہ تھی کہ جب علامہ باقاعدہ جمعیت اہل حدیث قائم کر چکے تو سب سے پہلے اس طرف توجہ کی۔

جنرل ضیاء الحق نے طلبہ یونین اور تنظیموں پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس وجہ سے جمعیت طلبہ اہل حدیث بھی اس پابندی کی زد میں آ چکی تھی۔ جمعیت طلبہ اہل حدیث بہت متحرک اور باصلاحیت نوجوانوں کی تنظیم تھی۔ اگرچہ یہ تنظیم جماعتی معاملات میں

آزاد تھی اور باقاعدہ کسی خاص گروپ سے وابستہ نہیں تھی مگر ان دنوں اس کی قیادت ایسے نوجوانوں کے ہاتھ آ چکی تھی جو طبعاً علامہ احسان الٰہی ظہیر کی تحریک کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے اور مسلسل آپ سے رابطے میں رہتے تھے۔ ان حالات میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید نے اہل حدیث یوتھ فورس کے قیام کا ارادہ کر لیا اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ تنظیم جمعیت طلبہ اہل حدیث کا جدید ایڈیشن تھا۔ محمد خان نجیب اس کے پہلے صدر اور قاضی عبدالقدیر خاموش جنرل سیکرٹری مقرر کیے گئے۔ دونوں نوجوان اور باصلاحیت تھے اور کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار۔

محمد خان نجیب کا تعلق سیالکوٹ کے نواحی گاؤں گڑھی گوندل سے تھا اور وہ مسجد چینیانوالی میں زیر تعلیم تھے۔ جب کہ قاضی عبدالقدیر خاموش کا تعلق گجرات سے تھا۔ یہ ان دنوں کے واقعات ہیں جب جمعیت اہل حدیث ابھی قائم ہوئی تھی اور برانڈرتھ روڈ پر شہزادی مارکیٹ کے اوپر اس کا پہلا دفتر قائم کیا گیا۔ 14 اگست 1984ء کو اہل حدیث یوتھ فورس کا پہلا باضابطہ کنونشن 35 شاہ جمال والے دفتر میں منعقد ہوا۔ جو حاضری اور وقت دونوں اعتبار سے خاصا مختصر تھا۔ میں اپنے والد کے ہمراہ اس میں شامل ہوا۔ اس کنونشن کے دو اہم واقعات یاد رہ گئے ہیں۔

دوران اجلاس مولانا عبدالغفور جہلمی رحمہ اللہ نے یہ اعتراض اٹھایا کہ اہل حدیث یوتھ فورس کا نام انگریزی ہے اور اس فرنگی نام سے غلامی کی بو آتی ہے۔ قاضی عبدالقدیر خاموش نے بہتیرے دلائل دیے۔ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام کا حوالہ دیا۔ صورتِ حال اس وقت دل چسپ ہو گئی جب ''جامعہ اثریہ فری ڈسپنسری'' کا ذکر آیا۔ خاصا وقت اس بے مقصد بحث کی نذر ہو گیا۔ مگر مولانا نے مان کے نہ دیا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ جہلم میں مدت تک جمعیت شبان اہل حدیث قائم رہی اور انہوں نے اہل حدیث یوتھ فورس کا نام اختیار کیا، نہ یونٹ قائم کیے۔ مگر علامہ نے اس معاملے سے مصلحت کے تحت صرفِ نظر کیا۔

دوسرا واقعہ خاصا اہم اور سنگین تھا کہ عصر کی نماز سے کچھ ہی دیر پہلے خبر آئی کہ مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ شدید زخمی ہیں۔ تفصیل اس حادثے کی یہ تھی کہ مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی کنونشن میں شرکت کے لیے بس سٹاپ پر کھڑے تھے اور سواری کا انتظار کر رہے تھے کہ ''جنت کے حصول کے لیے'' چند بریلوی نوجوانوں نے خنجروں سے مولانا پر حملہ کر دیا۔ مولانا یزدانی شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ ان کو خنجروں سے کتنے ہی گہرے زخم لگے تھے۔ مولانا کو لاہور کے میو ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا اور یوں یہ کنونشن ختم کر دیا گیا۔

دوسرا سالانہ کنونشن

ایک سال مزید گزر گیا۔ 1985ء آ گیا تھا۔ اہل حدیث یوتھ فورس بہت ترقی کر چکی تھی۔ ہر طرف ایک جوش اور جذبہ تھا۔ 14 اگست 1985ء کو پھر کنونشن رکھا گیا۔ اب کے یہ دو روزہ تھا۔ میں نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ کالج میں داخل ہو چکا تھا اور ان دنوں چھٹیاں تھیں فراغت کے دن تھے۔

کنونشن کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سو ایک روز اپنے والد محترم سے دفتر کا پتا پوچھا۔ تب تک اپنی دنیا سکول سے گھر کے راستے کے علاوہ نہ تھی۔ میرے والد نے راستہ سمجھایا کہ اچھرے سے آگے چند گلیاں چھوڑ کر شاہ جمال کالونی میں جمعیت کا دفتر ہے۔ دفتر تو میں پہلے آ چکا تھا مگر اکیلا پہلی بار آیا۔ جولائی کی شدید گرمیاں، اچھرے سے 35 شاہ جمال کا فاصلہ کافی طویل محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی آغاز تھا نا

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیال یار کی چادر ہی لے چلیں

لیکن یہ فاصلہ ایسی کسی چادر کے بنا ہی طے کر کے دفتر میں داخل ہوئے۔ مسکراتے چہرے اور کسی قدر استعجاب کے ساتھ محمد خان نجیب رحمہ اللہ نے ہمیں خوش آمدید کہا اور

پوچھا آج آپ کدھر؟ ہم نے ہنستے ہوئے کہا: ''بھرتی ہونے آیا ہوں۔ فراغت کے دن رات تھے۔ سوچا آپ کی نذر کر دوں۔'' وہ اس وقت کنونشن کے دعوت نامے لکھ رہے تھے اور لفافوں میں ڈال رہے تھے۔ میں بھی اس کام میں ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ کنونشن ہو رہا تھا، اس لیے سب بہت جوش وخروش میں کام کر رہے تھے۔ ہر کسی کو نت نئے ''آئیڈیاز'' سوجھ رہے تھے اور کام کرنے کا مزہ آ رہا تھا۔ زندگی میں مقصدیت کا ہونا بھی عجیب نعمت ہے۔ سرخ اور سبز رنگ کا خوبصورت اشتہار۔ معروف خطاط عبدالرشید قمر کے ہاتھوں کا کتابت کردہ یہ اشتہار بہت خوبصورت دکھائی پڑتا تھا۔

کنونشن کا آغاز ہو گیا تقاریر جاری تھیں۔ پہلے روز کی بات ہے کہ عبداللطیف انور میرے پاس آئے اور کہنے لگے یہ ہمارے خطیب صاحب ہیں۔ آج ان کی تقریر ضرور کروانی ہے۔ عبداللطیف انور سے میری دوستی اور محبت کے سفر کو ابھی چند روز گزرے تھے اور آج 27 سال گزرے ویسے ہی تازہ ہے۔ اسی طرح عبدالسلام سے بھی تب ہی ملاقات ہوئی اور یہ تعلق ایسے مضبوط ہوئے کہ کسی شجر کی گھنی چھاؤں کی طرح کہ جس سے تازہ ہوا بھی ملتی ہے اور سکون بھی۔ خاصے جوش و جذبے سے خطیب صاحب نے تقریر فرمائی۔ لیکن کچھ عرصے بعد معاملہ عجیب ہوا۔ جیسے ایک کھلاڑی سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لیتا ہے۔ سو میٹر کا فاصلہ تمام ہو جاتا ہے مگر اس کا جوش اور جذبہ اس کو رکنے نہیں دیتا۔ سو وہ صاحب بھی سو میٹر تو کب کے ختم ہو گئے مگر دوڑتے ہی چلے گئے اور آج تک دوڑتے جا رہے ہیں اور جو تب کسی شمار اور قطار میں نہ تھے آج اپنی الگ جماعت بنائے بیٹھے ہیں اب عبداللطیف انور کا مسئلہ ہے کہ سوچے کہ کیوں ان کی تقریر کروائی۔

پہلا دن ختم ہوا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ بستر کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جس کو جہاں جگہ ملی سو گیا۔ صبح ناشتہ شروع ہوا۔ نان چنے بنائے گئے تھے۔ ساتھ حلوہ بھی تھا۔ اب لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ برتن کم پڑ گئے۔ ایک دم شور ہوا۔ قاضی عبدالقدیر خاموش آ گے

بڑھے کہ معاملہ کیا ہے۔ جب سمجھ آئی تو میں نے اور قاضی عبدالقدیر خاموش نے استعمال شدہ برتنوں کا ڈھیر اٹھایا اور پیچھے کی طرف بھاگے حالانکہ ایک بندہ کیٹرنگ والوں کا وہاں موجود تھا مگر وہ آہستہ آہستہ اپنی دھن میں مگن کام کر رہا تھا۔ میں نے اور قاضی عبدالقدیر خاموش نے مل کر برتن دھونے شروع کر دیئے تا کہ لوگ انتظار کی مشکل سے بھی بچیں اور شور شرابا بھی ختم ہو۔ بظاہر چھوٹا سا واقعہ میں نے لکھا ہے نا؟ اور یہ ایسا کوئی قابل ذکر بھی نہ تھا۔ لیکن رکیے! آپ سمجھتے ہیں کہ اہل حدیث یوتھ فورس کا جو ایک دم ہی اتنا نام بن گیا تھا۔ محض کلف لگے کپڑے اور جوش و جذبے سے کی گئی تقاریر تھیں؟ محض ہنگامہ اور شور تھا کہ جس کے بل بوتے پر ہر طرف اس تنظیم کا نام گونجنے لگا تھا۔ جی نہیں! اصل یہ جذبہ تھا کہ نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز۔ نہ کوئی لیڈر تھا نہ ورکر۔ سب لیڈر تھے اور سب کارکن۔ آج کسی گروپ کے صدر سے کہیں کہ جھاڑو پکڑے اور دفتر کی صفائی ہی کر دے یا ذرا ایک کپ ہی دھو دے۔ جانے دیں یار! لڑ پڑے گا کہ جیسے ''جماندرو'' لیڈر تھا۔ اور ادھر کیا معاملہ تھا۔ سرائیکی میں کہا گیا ہے نا

آ ماہی بھٹ پئی شاہی

تے اڑیے میں یار دا دامن پھڑ ساں

مول نہ ہٹ ساں

یہ تو عشق کے معاملے ہوتے ہیں جہاں اپنی ذات ختم ہو جاتی ہے اور اہل حدیث یوتھ فورس ہمارا عشق تھا۔ اپنی ذات کہاں رہی تھی۔ اب ہر طرف لیڈر بکھرے پڑے ہیں ورکر بہت کم ملتے ہیں۔ اور خاص بات کہ اس دو روزہ کنونشن میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید شامل نہ ہو سکے۔ وہ پاکستان سے باہر تھے۔ اتنا بنیادی پروگرام ہوا۔ نوجوانوں نے آزادی سے اپنا کنونشن منعقد کیا۔ نہ ان پر کسی نے اعتراض کیا نہ یہ کہا کہ تم لوگ اتنے آزاد اور خود مختار کب سے ہو گئے۔ ہاں جب علامہ پاکستان واپس تشریف لائے اور

ساری روداد سنی تو نہایت خوش ہوئے۔

تیسرا سالانہ کنونشن

ستمبر 1986ء میں اہل حدیث یوتھ فورس کے تیسرے سالانہ کنونشن کا انعقاد کیا گیا۔ اب کے یہ ایک روزہ تھا اور اس کو ''تربیتی کیمپ'' کا نام دیا گیا۔ سبز رنگ کے خوبصورت اشتہار حسب سابق استاد عبدالرشید قمر کی خطاطی میں ہر سو اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس بار علامہ احسان الٰہی ظہیر پاکستان میں موجود تھے۔ لارنس روڈ کی بلڈنگ میں جمعیت اور یوتھ فورس کے دفاتر منتقل ہو چکے تھے۔ اس کے سبزہ زار میں اس کیمپ کا منعقد کرنا طے کیا گیا تھا۔ بہت پر فضا مقام تھا۔ سامنے باغ جناح تھا کہ جس کی مثال کم کم ہی پائی جاتی ہے۔ باغ جناح کہ جس کو میں اس کے اصلی نام لارنس گارڈن سے پکارنا پسند کرتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ جناح صاحب نے اس میں ایک بھی پودا نہیں لگایا ہوگا۔ تو جس نے اتنے شوق سے یہ باغ لگایا اس کا حق ہے کہ اسی کا نام ہی پکارا جائے۔ اس لارنس گارڈن سے میرا خاص تعلق رہا ہے۔ عبدالرحمٰن سیٹھی جو حاجی محمد صادق مرحوم کے بیٹے ہیں اور حاجی صادق صاحب علامہ شہید کے رشتے میں ماموں لگتے تھے۔ میرا ان سے بہت پیار تھا۔ بالکل باپ جیسی شفقت۔ علامہ بھی آپ سے بہت محبت کرتے۔ عبدالرحمٰن اور میں روزانہ رات کو ایسے باغ جناح میں آتے جیسے روز مرہ عبادت کا حصہ ہو اور اس میں ناغہ جیسے کوئی گناہ ہو۔ رات دیر تک بیٹھے کتنا سمے بیت جاتا اور پتا ہی نہ چلتا۔ حتیٰ کہ کبھی گارڈ ڈھونڈتے آ جاتے کہ حضور جایئے گھر تشریف لے جائیں، آپ کی سواری کی حفاظت میں ہم تھک گئے ہیں۔ ایسے ہی ایک روز چاند کی چودھویں تھی اور ہلکے ہلکے بادلوں کے ٹکڑے ہوا میں جھول رہے تھے۔ پورا چاند اور بادل جیسے آنکھ مچولی ہو رہی ہو، تب بے اختیار یہ شعر ہوا تھا:

بادلوں کی اوٹ میں یہ چھپتا چھپاتا چاند
پہلو میں بیٹھ کے جیسے وہ مسکرا رہے ہیں

اس شان دار مقام کے عین سامنے 53 لارنس روڈ کی یہ پرانی کوٹھی علامہ نے جمعیت کے دفاتر کے لیے خریدی جس کی تفصیلات میں لکھ چکا۔ اس پرانی کوٹھی کے سامنے کے لان میں کیمپ کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

صبح تقریباً دس بجے کے بعد تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان بھر سے اہل حدیث یوتھ فورس کے جوان اپنی مقامی قیادت کے ساتھ شریک تھے۔ حسب مراتب خطابات شروع ہو گئے۔ حضرت علامہ نے ایک روز پہلے کہہ دیا تھا کہ ''میں سارا دن سٹیج پر آپ کے ساتھ بیٹھوں گا۔'' سو علامہ صبح صبح ہی تشریف لے آئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نوجوان نسل سے ان کی امیدوں اور دلچسپی کا عالم کیا تھا۔ آپ سب کی گفتگو سنتے رہے یا یوں کہیے آج خطیب کو سب کی سننا پڑ رہی تھی۔ جب نماز ظہر کے بعد کے سیشن کا آغاز ہوا تو سٹیج سیکرٹری نے عبداللطیف انور کو پکارا کہ وہ آ کر ایک قرار داد کا متن پڑھیں۔ عبداللطیف انور مائیک پر آئے تو علامہ نے ان کو پرے ہٹایا اور خود مائیک پر آ گئے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی اور جذبات سے بوجھل۔

''عبداللطیف میرا وہ بیٹا ہے کہ لاہور میں مجھے کوئی تکلیف آتی ہے تو سب سے پہلے خانیوال سے اس کا فون آ جاتا ہے کہ آپ خیریت سے ہیں؟''

عبداللطیف کہ جسے ہم سب پیار سے بوٹا کہتے ہیں، اس کے لیے اس سے زیادہ عزت کا کیا مقام ہو سکتا ہے کہ علامہ اس کا تعارف کروا رہے تھے۔ ویسے آج کل خانیوال پریس کلب کا صدر بن کر بڑا بندہ بن چکا ہے۔

آخر میں قاضی عبدالقدیر خاموش اور محمد خان نجیب کی تقاریر ہوئیں۔ میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ نے بھی خطاب فرمایا۔ آپ کا موضوع تھا ''جمعیت اہل حدیث کا جمہوریت کے حوالے سے موقف؟'' آپ نے جمہوریت کے اس نقطہ نظر کو تفصیل سے بیان کیا کہ جس کے جواز کے اہل حدیث علماء قائل تھے۔ دل چسپ امر

یہ ہے کہ تب اہل حدیث حضرات کے جمہوریت کے بارے میں خیالات آج کی نسبت بالکل مختلف تھے۔ عموماً جمہوریت کے قائل تھے۔ اس کو کلیتاً حرام نہیں کہتے تھے۔ اگرچہ بعض تحفظات تھے۔ اب معاملہ مختلف ہو گیا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے جمہوریت کو حرام اور کفر تو کہتے ہیں مگر نواز شریف کا معاملہ آئے تو چپکے سے جا کر ووٹ ڈال آتے ہیں۔

حتیٰ کہ ہم نے ان مرحوم بزرگوار کو بھی دیکھا ہے کہ جو اس ملک میں جمہوریت کے خلاف سب سے توانا آواز بن کر اٹھے تھے۔ جنہوں نے خود اور ان کے شاگردوں نے ''جمہوریت کفر ہے'' کو زبان زد عام و خاص کر دیا اور اس تعصب میں اس حد تک گئے کہ ایک مجلس میں یہ تک کہہ دیا کہ ''علامہ کہاں کا شہید ہے کہ جمہوریت کے لیے لڑتا مارا گیا۔'' لیکن وہ بزرگ بھی اس روایت سے محفوظ نہ رہ سکے کہ کوٹ ادّو میں مسلم لیگی امیدوار کی انتخابی مہم میں شریک ہونے کے لیے پہنچ گئے۔

استدلال اس ''کفر'' میں شریک ہونے کا یہ تھا کہ اگر اس مسلم لیگی کو سپورٹ نہ کیا گیا تو بڑی برائی پیپلز پارٹی جیت جائے گی اور دل چسپ امر یہ ہے کہ مقابلے میں اہل حدیث عالم مولانا عبداللہ سلفی الیکشن لڑ رہے تھے اور حضرت مولانا...... کو خدشہ تھا کہ ان کی وجہ سے مسلم لیگی امیدوار کو نقصان پہنچے گا۔

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

ہم کچھ دور ہی نکل گئے، واپس کنونشن میں چلتے ہیں جہاں آخری خطاب علامہ شہید کا تھا دن ڈھلنے کو تھا۔ علامہ شہید مائیک پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ یہ اہل حدیث یوتھ فورس کے کسی بھی اجتماع سے علامہ کا آخری خطاب تھا اب یہ تو اہل حدیث یوتھ فورس چاہے وہ کوئی بھی گروپ ہو کی ذمے داری ہے کہ وہ اس خطاب کی روح اور پیغام کے مطابق اپنی تنظیم سازی کریں۔

رمضان کی راتیں

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کے ساتھ

آسمانی رنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہنے، راستے میں خوشبوویں بکھیرتے، وہ مسجد چینیاں والی کے صحن میں داخل ہوئے۔ سارا صحن جیسے روشن ہو گیا۔ ہر سو جیسے خوشبو بکھر گئی۔ ع

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

گرمیوں کی ٹھنڈی ہوتی شام، مسجد چینیاں والی کے صحن کا یہ منظر وہاں کے پرانے نمازیوں کی یادوں کا حصہ ہے۔ وہ مسجد میں داخل ہوتے۔ لوگ ان سے ملنے کو آگے بڑھتے۔ وہ ہاتھ ملاتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے حتیٰ کہ اپنے مقام پر جا پہنچے۔ جس منبر و محراب نے کبھی مجاہدین کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ جی ہاں! جب دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا رسمی اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ ایسے میں مجاہدین لڑتے لڑتے واپسی پر مجبور ہو گئے۔ ان کا سالار بخت خان مایوسی کے عالم میں دلی سے نکلا، سیدھا مسجد چینیاں والی آیا اور پھر تاریخ کے جھروکوں

میں کہیں کھو گیا۔

اس مسجد کی محراب غزنوی بزرگوں کی تنہائیوں کی سرگوشیوں کی امین ہے، جب امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ رات کے اندھیروں میں اس مسجد کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور مناجات کر رہے ہوتے۔ اسی مسجد کے منبر ومحراب سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی جرأت کے بھی شاہد ہیں۔ اسی منبر ومحراب پر شہید حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے قدم رنجہ ہوئے اور آپ کے بعد......

وہ سجدۂ روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

بہادری کا وارث یہ شخص جب سے اس مسجد سے رخصت ہوا ہے، یہ مسجد نہ جانے کیوں اداس سی لگتی ہے۔ اس کو اپنے خطیب کے کھو جانے کا دکھ ہے۔ جیسے ابھی بھی انتظار میں ہے۔

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کمال کے حافظ تھے۔ آپ نے بچپن میں حفظ کیا تھا اور نو سال کی عمر میں ہی ''مصلیٰ'' سنانا شروع کر دیا اور اس کا اس طرح پابندی سے اہتمام کیا کہ اس میں کبھی ناغہ نہ کیا حتیٰ کہ پیغام اجل آ گیا۔ اس طرح آپ نے سینتیس سال مسلسل قرآن سنایا۔ مصلی سنانا ہمارے ہاں کا ایک روزمرہ کا لفظ ہے۔ مراد نماز تراویح میں قرآن کریم سنانا ہوتا ہے۔

آپ کے والد محترم جناب حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ نے آپ پر بڑی محنت کی۔ انہیں اپنی اولاد کو حفظ کروانے کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے میں حاجی صاحب اپنی اولاد پر نہ صرف سختی کرتے بلکہ خود بھی بہت وقت دیتے۔ اگرچہ آج کل ہمارے ماحول میں والدین کو حفظ کروانے کا شوق تو بہت ہوتا ہے مگر عموماً وہ اس کے تقاضوں

اور ذمے داری سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب جب جوان ہوتے ہیں تو اکثر و بیشتر قرآن بھول چکے ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست حافظ صاحب تھے عین جوانی میں بلڈ کینسر کے سبب عالم بالا کو رخصت ہو گئے۔ اگر چہ ان کی جوانی کو ہم نے الائشوں سے پاک دیکھا، لیکن اپنے بچپن یا لڑکپن کی بیتی سنایا کرتے کہ جب وہ نماز تراویح سے فارغ ہوتے تو اپنے دوستوں کے ساتھ سینما ہال چلے جاتے تھے۔ لیکن حاجی صاحب نے اپنی اولاد کو قرآن کریم نہ صرف یاد کروایا بلکہ اس کا تقدس بھی ان کے دل و دماغ میں اتار دیا۔

حاجی صاحب کا اپنی اولاد کے معیارِ حفظ کو پرکھنے کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ بیٹا سویا ہوا ہے۔ آپ آئے اور آ کر بیٹے کو اٹھایا۔ وہ بیچارا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور آپ نے اس کو ایک آیت سنا دی۔ اب یہ نہیں پوچھا بیٹا اس سے آگے کیا ہے۔ بلکہ سوال کیا کہ اس سے پہلے کیا آتا ہے۔ ظاہر ہے جب ایسا کڑا امتحان کرنے والا باپ ہو تو قرآن کیوں نہ انسان کے رگ و پے میں اتر جائے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت حاجی ظہور الٰہی صاحب کے تین بیٹے کمال درجے کے حافظ تھے۔ حضرت علامہ کے چھوٹے بھائی حافظ شکور الٰہی کی ''منزل'' تو اس طرح پختہ تھی کہ غلطی کا تصور بھی محال تھا...... منزل سے مراد قرآن کا حفظ ہونا ہے۔

حافظ شکور الٰہی مرحوم عمرے کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں حرم شریف میں مصر سے آئے ہوئے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ باتوں کا رخ حفظ قرآن اور ''منزل'' کی پختگی کی طرف چل نکلا۔ بزرگ نے قرآن کریم کے مشکل مقامات سے تلاوت شروع کر دی اور اس کے بعد حافظ شکور الٰہی سے کہنے لگے آپ بھی کچھ سنائیے۔ حافظ صاحب نے قرآن کریم کو ترتیب صعودی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ اب مصری بابا جی حیران اور مبہوت حافظ شکور الٰہی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کیا ایسا کمال بھی ممکن ہے؟

ہم نے دیکھا کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کی منزل بھی بہت پختہ تھی۔ آپ کی اقتداء میں چند سال مسجد چینیاں والی اور ایک سال مرکز اہل حدیث لارنس روڈ میں تراویح پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ حقیقت ہے کہ اگر حافظہ خطا نہیں کھاتا تو مجھے ان کی کوئی غلطی یاد نہیں پڑتی۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جب بچپن میں پہلی دفعہ قرآن سنایا تو دل میں اللہ سے وعدہ بھی کیا اور دعا بھی کی ''اے اللہ تعالیٰ مجھے بہت پختہ منزل عطا کر، میں کبھی اس کے سنانے میں ناغہ نہیں کروں گا۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کر لی اور آپ نے بھی اپنا وعدہ پورے طور سے نبھایا۔

بھٹو دور میں آپ نے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ پتوکی آپ کا حلقہ انتخاب تھا۔ مسجد چینیانوالی سے آپ کا حلقہ انتخاب تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر تھا لیکن اللہ سے کیے گئے اپنے وعدے کا آپ کو اس طرح پاس تھا کہ آپ روزانہ پتوکی سے عین تراویح کے وقت مسجد میں ہوتے اور کبھی اس میں کوتاہی نہ کی۔

غلطی نکالنے سے دل نہ توڑنا اہم ہے

دل توڑنا بڑا گناہ ہے۔ علامہ شہید رحمہ اللہ نے بڑی خوب صورت بات کہی۔ جی چاہتا ہے کہ ہر مسجد میں اس کو آویزاں کیا جائے۔ ایک دفعہ ایک سامع نے آپ کی غلطی نکال دی۔ آپ نے اس کو درست خیال نہ کیا اور اپنی منزل کے مطابق پڑھا۔ دونوں جانب سے ہلکی سی تکرار ہوئی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو اس سامع کو مخاطب کر کے فرمایا:

> ''حافظ صاحب غلطی نکالنے اور درست کرنے سے بڑا گناہ دل توڑنا ہے۔ اگر حافظ آپ کا لقمہ قبول نہیں کرتا تو اسے جانے دیں کہ تالیف قلب بڑے ثواب کا کام ہے۔''

پھر قرآن منگوایا۔ غلطی والا مقام دیکھا تو جیسا علامہ پڑھ رہے تھے، ویسا ہی تھا۔

مدینہ یونیورسٹی میں بھی ''منزل'' نہ چھوڑی

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ جب مدینہ یونیورسٹی میں طالب علم تھے، آپ نے قرآن کریم سنانے میں تب بھی کبھی تعطل نہیں آنے دیا۔ آپ پاکستانی احباب کے ساتھ قیام اللیل کرتے اور اپنی ''منزل'' جاری وساری رکھتے تھے۔ آپ قرآن پاک اتنے جذب سے اور ڈوب کر پڑھتے تھے کہ سامعین کے دل میں اتر جاتا۔ آپ کا پڑھا ہوا ہر لفظ سمجھ آتا۔

مسجد چینیاں والی میں رمضان المبارک کی راتوں میں یوں محسوس ہوتا جیسے انوار و تجلیات کے نازل ہونے کا منظر دکھائی دیتا ہو۔ آپ کا خوب صورت لہجے میں قرآن کریم پڑھنا، چینیاں والی کا بے حد پرسکون اور روحانیت میں ڈوبا ہوا ماحول اور کچھ پا لینے کے خواہشمند نمازی، غرض سارا کچھ دل ودماغ کو مسخر کر لینے والا ہوتا۔

جب آپ نے قرآن کریم کا خلاصہ شروع کیا

۱۹۶۷ء میں آپ نے مسجد چینیاں والی کی خطابت سنبھالی اور اس طرح پاکستان میں جماعت اہل حدیث کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ آپ نے نماز تراویح میں پڑھے گئے قرآن کا خلاصہ بیان کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور شاید پاکستان میں یہ اس بات کا آغاز تھا کہ نمازیوں کو قرآن پاک کے معانی ومفہوم سے بھی آشنا کیا جائے۔ وگرنہ ہمارے ہاں تو قاری صاحب ''سپیڈ وسپیڈ'' قرآن کریم پڑھتے ہیں اور بے چارے نمازی کے پلے میں تلاوت کا لطف بھی نہیں آتا۔ جب کہ شہید علامہ کا معمول تھا کہ چار رکعت نماز پڑھاتے اور اس میں پڑھی گئی منزل کا خلاصہ پندرہ سے بیس منٹ میں بیان کرتے اور اس کے بعد بقیہ چار رکعت نماز ادا کرتے اور پھر آدھے سے پون گھنٹہ اور بعض اوقات ایک گھنٹے تک درس دیتے تھے۔

آپ کے اس درس میں لوگ دور دور سے بلکہ بیرون شہر سے بھی حاضر ہوتے۔

آپ رنگ محل چوک کے قریب شاہ عالم مارکیٹ کے برآمدوں کے باہر اپنی گاڑی کھڑی کرتے اور کوچہ چابک سواراں کی پر پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے مسجد پہنچتے۔ نمازی حضرات وفور شوق سے آپ کی راہ تکتے ہوتے۔ مسجد چینیاں والی کا ٹھنڈا ٹھنڈا ماحول دل ودماغ کو فرحت اور تازگی بخشتا تھا۔ آپ کے مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی بڑا ہال اور صحن بھر چکا ہوتا۔ تنگ گلیوں کے بیچ میں مسجد چینیاں والی کا دامن بہت وسیع تھا، میرے تایا زاد بھائی عبدالمجید شاکر جن سے علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ کا بہت پیار تھا۔ ان کی دکان مسجد کے قریب ہی اس مکان سے بالکل متصل تھی، جس میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ نے پاکستان آمد کے بعد کچھ عرصہ سکونت رکھی تھی۔ آج سے تین چار سال قبل تک تو اس مکان کے صدر دروازے پر باقاعدہ نیم پلیٹ آویزاں تھی۔ جس پر ''حافظ احسان الٰہی ظہیر ایم اے'' کے الفاظ سفید رنگ میں سیاہ زمین پر لکھے ہوئے تھے اور اس طرح روشن تھے جس طرح لاہور کی سیاہ راتوں میں آپ مانند زہرہ چمک رہے ہوتے تھے۔ اس مکان کے مالک عبدالمتین ملک جو کہ معروف ادیب اور صحافی عبداللہ ملک کے قریبی عزیز اور اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، کتب کے ناشر ہیں۔ اس لیے میرے ہم پیشہ ہیں۔ چند برس پہلے انہوں نے مکان کی تعمیر نو کی تو نہ جانے انہوں نے اپنے گھر کے ماتھے کا جھومر کیوں اتار دیا۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات

ہم تین، چار دوست ہوتے اور راوی روڈ پر واقع اپنے گھر سے سائیکلوں پر نکلتے۔ میرے ماموں زاد رانا جاوید رفیق، میرے قریبی دوست محمد یعقوب انصاری، میرے بھائی عمر فاروق قدوسی اور چند دیگر دوست بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ بادشاہی مسجد کے میناروں کے پہلو سے گزرتے ہوئے آنکھوں اور دامن کو بچاتے تاریک راہوں سے

باہر نکلتے پانی والا تالاب سے گزرتے، اور مسجد چینیاں والی جا پہنچتے۔ اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ خیریت سے مسجد آ پہنچے ہیں، وگرنہ سنتے ہیں کہ یہیں قریب ہی حسن کا بازار بھی ہے اور آج تک حیرت ہے کہ بچپن کی معصومیت کا دل کے حسن کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارا کوئی ایسا بچپن بھی نہ تھا۔ الحمد للہ سیاہ وسفید کی تمیز رکھتے تھے لیکن گھریلو ماحول اس قدر ''مولویت'' میں ڈوبا ہوا تھا کہ کبھی خبر ہی نہ ہوئی کہ ہمارے راستے میں ''تاریک باطن بازاروں میں روشنی'' کا کتنا ہجوم ہوتا تھا نہ کبھی کسی نے بتانے کی زحمت کی۔ رات گئے اس روشن بازار میں سیاہ دل کے کالے لوگ اپنے ہاتھوں سے گھر کی جنت اجاڑ کرتن اور من خریدنے آتے ہیں۔ یہاں حسن نہیں حوا کی بیٹیاں نیلام ہوتی ہیں۔

ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہتے ہیں۔ حرمین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد بیت اللہ الحرام کی بیٹی کے میناروں کے سائے بھی مقدس، میں اور میرا وجود بھی مسجد کے لیے قربان...... یہ نہیں ہوسکتا۔ سانحہ لاہور کے چند سال بعد اس بازار میں، جہاں سے گزر کے کوچہ چابک سواراں جایا کرتا تھے، پیپلز پارٹی کا بہت بڑا انتخابی جلسہ تھا۔ مسلم لیگ وہاں جلسہ کر چکی تھی۔ مقابلے کی ٹھن چکی تھی، ہم بھی جلسہ دیکھنے چلے گئے۔ جس راستے سے گزرے اس نے دل ودماغ کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ میرے ملک پاکستان کی بیٹیاں شاید اس طرح ۱۹۴۷ء میں سکھوں کے درمیان نہیں بانٹی گئی تھیں، جس طرح اپنے بھائیوں میں سیم وجواہر کے عوض ایک رات کے لیے بلکہ رات کے بھی کچھ حصے کے لیے تقسیم ہو رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم میں اور سکھوں میں کیا فرق ہے۔

بات دور نکل گئی، بچپن تک رہتی تو اچھا تھا۔ ہم سارے دوست مل کر علامہ شہید کی اقتداء میں نماز تراویح کی ادائیگی کے لیے مسجد جاتے اور حقیقت یہ ہے کہ لاہور میں اس

طرح نماز تراویح کا لطف پھر کبھی نہ آیا۔ آپ اس قدر خوب صورت اور سادہ لہجے میں قرآن پڑھتے کہ دل کی وہ تہیں جو بے حد زنگ آلود ہو چکی ہوتیں، وہ بھی قرآن کی برکت سے شفاء یاب ہو جاتیں۔

ہم لوگ شہروں کے پیچھے نہیں چلتے

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حضرت علامہ پہلے چار رکعت نماز تراویح ادا کرتے اور مختصر سا خلاصہ قرآن بیان کرتے اور پھر آٹھ رکعت کے بعد مزید درس دیتے تھے۔ اگرچہ آپ کے دروس قرآن تو روزانہ ہی سامعین کے لیے پرکشش ہوتے تھے لیکن بعض خاص موضوعات سامعین کے لیے خاصے پرکشش ہوتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ، سورہ حجرات کا درس، دعا کے موضوعات اور چند دیگر موضوعات پر آپ کے دروس خاصے مقبول تھے۔ دوران درس آپ کے خطاب کا انداز بیک وقت پر جوش اور دھیما ہوتا۔ آپ کے جلسہ ہائے عام کے اندازِ خطابت سے نسبتاً جدا اور سامعین سے آپ کا رویہ ہلکا پھلکا اور بے تکلفانہ ہو جاتا۔ مستقل نمازی ویسے بھی خود کو بہت حد تک گھر کے افراد خیال کرنے لگتے ہیں اور بعض اوقات بڑی دل چسپ صورت حال دیکھنے میں آتی ہے کہ دور سے آنے والے احباب خود کو اجنبی محسوس کر رہے ہوتے ہیں اور مستقل مقامی نمازی خود کو مسجد سمیت ہر چیز کا مالک خیال کر رہے ہوتے ہیں۔

ایک دن آپ کو دوران درس ایک رقعہ ملا کہ آپ اہل حدیث حضرات یوں تو مکے اور مدینے سے محبت کے بہت دعوے کرتے ہیں لیکن وہاں بیس رکعت نماز تراویح ادا کی جاتی ہے، یہاں پر آپ کی محبت کے دعوے کیا ہوئے؟ اس پر آپ نے اپنے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بھی ہمارے مسلک کی صداقت کا جواب موجود ہے اور آپ لوگ بتائیں کیسے؟ لوگ ہاتھ کھڑا کر کے باری باری جواب دینے لگے لیکن بات نہ بنی۔ آخر آپ نے خود ہی جواب دیا کہ:

”ہم لوگ شہر کے پیچھے نہیں چلتے بلکہ اس کے پیچھے چلتے ہیں جو شہر والا ہے۔ جس بات پر مدینے والے کی مہر نہ ہو چاہے وہ عمل مکے مدینے میں کیوں نہ ہو وہ ہمارے لیے قابل حجت نہیں۔“

رمضان المبارک کی طاق راتیں اور خصوصی دعا

رمضان المبارک کے سلسلے میں علامہ شہید مسجد چینیاں والی میں طاق راتوں کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ طاق راتوں میں آپ نسبتاً طویل درس ارشاد فرماتے تھے۔ جب کہ آپ کے مقتدی بھی ان راتوں میں بہت اہتمام کے ساتھ آتے۔ ان راتوں کا لطف اپنی مثال آپ تھا۔ آج بھی مسجد چینیاں والی کے نماز جب مل بیٹھتے ہیں اور یونہی برسبیل تذکرہ ان راتوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں لیکن کیا کریں۔ ع

یاروں نے بہت دور بسائی ہیں بستیاں

آخری چند سالوں کے رمضان جو مسجد چینیاں والی میں حضرت شہید رحمہ اللہ نے گزارے وہ گرمیوں میں آئے تھے اور شدید گرمی کا دن بھر پور روزے کے ساتھ گزار کر خوشگوار رات میں ایک مزید لطف اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر مناجات کا بھی تھا۔

جی ہاں علامہ شہید رحمہ اللہ کی دعا کا انداز بے ساختہ، سادہ اور بے مثال تھا۔ طاق راتیں آپ دعا کے لیے مخصوص کرتے۔ ستائیسویں رات کو آپ خصوصی طور پر دعا کرتے۔ انتیسویں رات آپ قرآن پاک ختم کرتے اور بعد از درس آپ دعا کا آغاز کرتے۔ آپ درس کے اختتام پر احباب کو وضو کے لیے کہتے تا کہ جن کا وضو نہیں ہے، وہ وضو کر لیں۔ اس کے بعد آپ دعا اور اس کے مسائل اور خشوع و خضوع کے حوالے سے مختصر گفتگو کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ دو زانو ہو کر بیٹھنے کے لیے کہتے کہ اس میں عاجزی کا اظہار ہے۔

اس کے بعد آپ دعا کا آغاز کرتے اور روشنیوں کو گل کر دیا جاتا۔صحن کے اندر ایک ہلکی سی روشنی ہوتی وگرنہ ہر طرف ملگجا سا اندھیرا ہوتا۔ جبکہ محراب کے قریب خاصا گہرا اندھیرا ہوتا تھا۔ آپ تقریباً پون سے ایک گھنٹہ تک دعا کرتے اور یہ ساری دعا آہوں اور سسکیوں کے درمیان ہوتی اور آپ خود بھی رو رہے ہوتے اور آپ کے مقتدی بھی رو رہے ہوتے۔ اپنی غلطیاں، خطائیں اور گناہ سامنے آ رہے ہوتے۔ رب سے معاف کروانے کا شوق بھی بیدار ہوتا۔ گناہ کے احساس سے سر ندامت سے جھکے جا رہے ہوتے اور دل میں معافی کی امید بھی زندہ ہو رہی ہوتی۔ ایک طرف جبار وقہار کا ڈر اور دوسری رحیم وکریم کی رحمت کی امید۔ سسکیاں اور کراہیں آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہوتیں اور آخر دل اتنے ہلکے پھلکے ہو جاتے کہ یوں محسوس ہوتا شاید اللہ تعالیٰ نے ہم عاصیوں کے گناہ معاف کر کے اپنے دامن رحمت میں جگہ دے دی ہے۔

بعض ناقدین آپ کے اس انداز پر تنقید کرتے اور بعض روشنیوں کے گل کر دینے پر اعتراض کرتے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ لوگ شاید حاضرین کے بلند آواز سے رونے اور سسکیاں بھرنے کو بھی قابل اعتراض گردانتے۔ ویسے عجیب بات ہے کہ ملک پاکستان ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے کہ جو اللہ کو عجیب انداز سے مخاطب کرتے اور بسا اوقات توہین تک پر اتر آتے۔ یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو رب کو رونے یا دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر منانے کی بجائے وجد اور حال کی کیفیت میں جا کر کہتے ہیں۔ ؏

میں تے نچ نچ کے یار منانا نی

کوئی اس حد تک چلا جاتا ہے کہ اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ؏

تم اک گورکھ دھندا ہو

ایسے لوگوں کے دیس میں توحید پر کاربند رہتے ہوئے صرف ایک اللہ کو رو کر منانا کیوں قابل اعتراض ٹھہرتا ہے؟ اور کیا روشنیاں گل کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ حلال حرام کا

مسئلہ بن جائے۔ بہر حال ؎

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حاسدین کے چھوڑے ہوئے شوشے ہوتے ہیں۔ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتا ہوا اپنے رب کے حضور میں دو آنسو بہا لے کہ جن کے سبب ایک موحد مسلمان جہنم سے آزاد ہو جائے تو اس میں کیا برائی تھی اور ناقدین کو اس پر کیا اعتراض تھا اور مزے کی بات ہے کہ یہ سب لوگ جانتے تھے کہ علامہ شہید کا بتیاں بجھانا محض ایک انتظامی معاملہ تھا نہ کہ وہ اسے دعا کی قبولیت کا کوئی ذریعہ خیال کرتے تھے۔ بہر حال یاروں کی موشگافیاں ہیں، کوئی کہاں تک الجھے۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے تو حد ہی کر دی۔ کہنے لگے چونکہ بظاہر علامہ صاحب زار وقطار رو رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کو رلا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں آنسو وانسو تو ہوتے نہیں اس لیے روشنیاں گل کر دیتے ہیں۔ ادھر ہم کو تحقیق احوال کا شوق چرایا اور معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے ''ثبوت'' کے حصول کے لیے علامہ شہید کے بالکل اس طرح آگے بیٹھ گئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی شے نہ تھی سوائے ایک ٹیپ ریکارڈ کے۔ دعا شروع ہوئی، دس پندرہ منٹ گزر گئے، مسجد میں رب کے حضور آہ وبکاہ کا شور بلند تھا۔ اب مجھے یہ خیال تھا کہ میں علامہ شہید کو دعا مانگتے آنسو بہاتے ہوئے دیکھوں اور اپنی اس ''تحقیق'' سے ان کے معترضین کے منہ بند کر سکوں۔ میں تمام نمازیوں سے آگے اور علامہ شہید کے بالکل پاس بیٹھا بھائی عبدالمجید کے لیے دعا کی ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ ان کے پاس ایک پرانے دور کا ٹیپ ریکارڈر تھا جس میں ۸ بینڈ کا ریڈیو تھا۔ اس کی بڑی سی سکرین تھی جس میں چھوٹا سا بلب تھا۔ اندھیرے میں اس چھوٹے سے بلب کی روشنی بھی بہت تیز محسوس ہوتی تھی۔ اچانک

میں نے اس کا بٹن ایک لمحے کے لیے دبا دیا۔ میں نے دیکھا میرے مرشد و مخدوم ہلکا آسمانی لباس پہنے ہیں۔ آنسو چہرے پر بہے جا رہے ہیں، آپ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دامن اپنے رب کے حضور پھیلایا ہوا ہے۔ میں نے فوراً روشنی بند کر دی اور اپنے ہاتھ رب السموات والارض کے حضور بلند کر دیئے کہ اتنا قیمتی وقت اس قسم کی ''تحقیق'' میں مزید ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ حاسدین کا کیا ہے، ان کی زبانیں تو قبر کی مٹی ہی بند کر سکتی ہے۔ مسجد میں صدائیں گونج رہی تھیں۔

''اللہ ہماری جھولیوں کو بھر دے۔

اللہ ہم فقیروں کو غنی کر دے۔

اللہ ہمیں خیرات دے دے۔

اللہ......اللہ......اللہ''

علامہ کے اخلاق کا بلند معیار

مفتی عبیداللہ عفیف مدت تک مسجد چینیانوالی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے، یہ مدرسہ علامہ شہید کی نگرانی میں تھا۔ مفتی صاحب راتوں کی اس دعا کے حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ بیان کرتے ہیں اور اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شہید کس اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مخالفین ان کے بارے میں کس قدر بغض اور حسد اپنے دلوں میں لیے بیٹھے تھے۔ مفتی صاحب ایک روز مدرسے میں تشریف فرما تھے کہ چند افراد ان سے ملنے آئے۔ ملاقات کا مقصد ایک سوال کا جواب لینا تھا مگر جواب لینے کا مقصد شاید نیک نہ تھا۔

وہ لوگ مفتی صاحب کے پاس تشریف لائے اور آ کر سوال پوچھا کہ جی بتائیں کہ یہ روشنیاں گل کر کے اندھیرے کا سماں بنا کے دعا مانگنا کیسا ہے؟'' مفتی صاحب نے کہا ''بھئی میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔'' وہ کہنے لگے ''اپنا یہ موقف دلائل کے ساتھ

لکھ دیں۔" مفتی صاحب نے کہا "یار یہ مناسب نہیں۔ میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کے مدرسے میں پڑھاتا ہوں، میرا ان سے برسوں پرانا اور بہت گہرا تعلق ہے اور دوسرے وہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اس طرح کروں اور ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دوں۔" مگر وہ کہنے لگے "اس کا مطلب ہے کہ آپ حق کو چھپاتے ہیں۔"

یہ سن کر مفتی صاحب کے اندر کا بلوچ بیدار ہو گیا اور آپ نے اپنے موقف کے حق میں تحریری جواب دینے کا وعدہ کر لیا، اور پھر حسب وعدہ مفصل تحریری جواب فتوے کی صورت میں ان کے حوالے کر دیا۔ ادھر وہ دوست سوال کا جواب لینے آئے ہی اس لیے تھے کہ اس فتوے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔

سو انہوں نے چند روز بعد ہی حضرت مفتی صاحب کے اس فتوے کو کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا۔ اس فتوے کا شائع ہونا تھا کہ علامہ شہید کے ناقدین اور حاسدین کے ہاتھ موقع آیا اور انہوں نے بھی اس "جہاد بالقلم" میں اپنا حصہ ڈالنا کارِ ثواب جانا اور اپنے اپنے خرچ پر اس فتوے کو شائع کر کے لاہور میں تقسیم کرایا۔ صرف لاہور میں تقسیم ہونے والے اس فتوے کی تعداد ہزاروں میں تھی۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ "علامہ احسان الٰہی ظہیر انتہائی ذہین اور بہت باخبر انسان تھے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ انہیں اس فتوے کے بارے میں خبر نہ ہو اور وہ اس کی وسیع پیمانے پر تشہیر سے ناآشنا رہے ہوں۔ لیکن یہ ان کے اخلاق کی بلندی تھی کہ 23 مارچ 1987ء کے بم دھماکے کے دن تک انہوں نے کبھی ایک بار بھی میرے سامنے اتنا سا جملہ بھی نہ بولا کہ "یار عبید اللہ اگر تم یہ فتویٰ نہ بھی دیتے تو کیا نقصان ہو جانا تھا۔" انہوں نے اس فتوے کے بارے میں لاعلمی کا انداز اپنایا اور میری عزت رکھی۔ حتیٰ کہ اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کا پہلا عمل یہی ہوتا کہ مجھے مسجد چینیانوالی سے فارغ کر دیتا۔"

میں نے اس کا بٹن ایک لمحے کے لیے دبا دیا۔ میں نے دیکھا میرے مرشد ومخدوم ہلکا آسمانی لباس پہنے ہیں۔ آنسو چہرے پر بہے جا رہے ہیں، آپ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دامن اپنے رب کے حضور پھیلایا ہوا ہے۔ میں نے فوراً روشنی بند کر دی اور اپنے ہاتھ رب السموات والارض کے حضور بلند کر دیئے کہ اتنا قیمتی وقت اس قسم کی ''تحقیق'' میں مزید ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ حاسدین کا کیا ہے، ان کی زبانیں تو قبر کی مٹی ہی بند کر سکتی ہے۔ مسجد میں صدائیں گونج رہی تھیں۔

''اللہ ہماری جھولیوں کو بھر دے۔

اللہ ہم فقیروں کو غنی کر دے۔

اللہ ہمیں خیرات دے دے۔

اللہ......اللہ......اللہ''

علامہ کے اخلاق کا بلند معیار

مفتی عبیداللہ عفیف مدت تک مسجد چینیانوالی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے، یہ مدرسہ علامہ شہید کی نگرانی میں تھا۔ مفتی صاحب راتوں کی اس دعا کے حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ بیان کرتے ہیں اور اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شہید کس اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مخالفین ان کے بارے میں کس قدر بغض اور حسد اپنے دلوں میں لیے بیٹھے تھے۔ مفتی صاحب ایک روز مدرسے میں تشریف فرما تھے کہ چند افراد ان سے ملنے آئے۔ ملاقات کا مقصد ایک سوال کا جواب لینا تھا مگر جواب لینے کا مقصد شاید نیک نہ تھا۔

وہ لوگ مفتی صاحب کے پاس تشریف لائے اور آ کر سوال پوچھا کہ جی بتائیں کہ یہ روشنیاں گل کر کے اندھیرے کا سماں بنا کے دعا مانگنا کیسا ہے؟'' مفتی صاحب نے کہا ''بھئی میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔'' وہ کہنے لگے ''اپنا یہ موقف دلائل کے ساتھ

مسئلہ بن جائے۔ بہر حال ؏

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حاسدین کے چھوڑے ہوئے شوشے ہوتے ہیں۔ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتا ہوا اپنے رب کے حضور میں دو آنسو بہالے کہ جن کے سبب ایک موحد مسلمان جہنم سے آزاد ہو جائے تو اس میں کیا برائی تھی اور ناقدین کو اس پر کیا اعتراض تھا اور مزے کی بات ہے کہ یہ سب لوگ جانتے تھے کہ علامہ شہید کا بتیاں بجھانا محض ایک انتظامی معاملہ تھا نہ کہ وہ اسے دعا کی قبولیت کا کوئی ذریعہ خیال کرتے تھے۔ بہر حال یاروں کی موشگافیاں ہیں، کوئی کہاں تک الجھے۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے تو حد ہی کر دی۔ کہنے لگے چونکہ بظاہر علامہ صاحب زار وقطار رو رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کو رلا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں آنسو وانسو تو ہوتے نہیں اس لیے روشنیاں گل کر دیتے ہیں۔ ادھر ہم کو تحقیق احوال کا شوق چرایا اور معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے ''ثبوت'' کے حصول کے لیے علامہ شہید کے بالکل اس طرح آگے بیٹھ گئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی شے نہ تھی سوائے ایک ٹیپ ریکارڈ کے۔ دعا شروع ہوئی، دس پندرہ منٹ گزر گئے، مسجد میں رب کے حضور آہ وبکاہ کا شور بلند تھا۔ اب مجھے یہ خیال تھا کہ میں علامہ شہید کو دعا مانگتے آنسو بہاتے ہوئے دیکھوں اور اپنی اس ''تحقیق'' سے ان کے معترضین کے منہ بند کر سکوں۔ میں تمام نمازیوں سے آگے اور علامہ شہید کے بالکل پاس بیٹھا بھائی عبدالمجید کے لیے دعا کی ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ ان کے پاس ایک پرانے دور کا ٹیپ ریکارڈر تھا جس میں ۸ بینڈ کا ریڈیو تھا۔ اس کی بڑی سی سکرین تھی جس میں چھوٹا سا بلب تھا۔ اندھیرے میں اس چھوٹے سے بلب کی روشنی بھی بہت تیز محسوس ہوتی تھی۔ اچانک

آخری طاق رات کی دعا

اب ذرا اس دعا کی اثر پذیری دیکھیے۔ کسے خبر تھی کہ علامہ کی مختصر سی زندگی کا آخری رمضان ہے۔ مسجد چینیاں والی کی بجائے لارنس روڈ پر نماز تراویح کا اہتمام کیا گیا۔ انتیسویں رات تھی۔ اس واقعے کے راوی کمپوزر علی حیدر ہمارے عزیز دوست ہیں اور ''ہفت اقلیم'' میں شامل ایک اقلیم دل کے مالک حکیم عبداللہ صاحب (منڈی جہانیاں والے) کے نواسے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی ابوبکر اپنے تین دوستوں کے ہمراہ مال روڈ سے نکل کر لارنس روڈ کی طرف آ نکلے۔ جب علامہ کے مرکز کے سامنے سے گزرے تو علامہ شہید درس ختم کر رہے تھے اور دعا کا آغاز ہونے کو تھا۔ ابوبکر کے اندر کا ''وہابی'' بیدار ہو گیا جو دوستوں کو زبردستی اندر لے گیا۔

دعا شروع ہوئی، دوست جو اندر جانے کے لیے تیار نہ تھے واپس آئے تو آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، دل بھی بدل چکا تھا۔ بقول علی حیدر آج وہ تینوں لڑکے صحیح العقیدہ ہیں۔ خود میرا اپنا ایک عزیز بھی اس ''حادثے'' کا شکار ہوا تھا۔ وہ غریب بھی اہل حدیث ہو گیا تھا اور اس ''دعائے ظلمات'' کے نتیجے میں راہ ہدایت پر گامزن ہوا تھا۔

علامہ کی اس دعا میں بہت سے مشہور و معروف لوگ بھی شریک ہوئے۔ لارنس روڈ مرکز میں آخری رمضان میں فلم اسٹار جوڑا محمد علی اور زیبا بھی دعا مانگ رہے تھے۔ اسی طرح مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا عبدالقادر آزاد بھی کئی سال علامہ کی اس دعا میں مسجد چینیاں والی آ کر شریک ہوتے رہے۔

مٹھائی پر کب فتویٰ لگے گا؟

ہمارے ملک پاکستان ...... بلکہ برصغیر...... کی روایت ہے کہ جب مساجد میں نماز تراویح میں تلاوتِ قرآن پاک کی تکمیل ہوتی ہے تو اس موقع پر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے اور اس بات کا اہتمام اہل حدیث، دیوبندی اور بریلوی سب مسالک کی مساجد میں ہوتا ہے

اور ابھی تک یہ مسئلہ غیر متنازعہ ہے نہ اس پر کسی قسم کا فتویٰ لگایا گیا ہے۔ مسجد چینیاں والی میں بھی ختم قرآن کے موقعہ پر مٹھائی تقسیم ہوا کرتی تھی۔ باہر صحن کے ساتھ متصل برآمدے کے کنارے کھڑے ہو کر مسجد کی انتظامیہ کے سربراہ میر محمد اشرف مرحوم مٹھائی کے ٹوکرے میں سے لفافے نکال کر اپنے ہاتھ سے حاضرین میں تقسیم کرتے۔ سب لوگ اپنا حصہ وصول کرتے اور کوشش کرتے کہ بچوں کے لیے بھی لے جائیں۔ کیونکہ اس مٹھائی میں خاصی فراخ دلی کا مظاہرہ کیے جاتا تھا۔ امیر اور غریب سب میں اس مٹھائی کے لیے خاص کشش ہوتی ہے اور ہماری اللہ سے دعا ہے کہ اس کشش کو تا قیامت باقی رکھے۔

قومیت کے بت

قومیں رنگوں سے نہیں بنتیں، قومیں زبانوں سے نہیں بنتیں، قومیں جغرافیائی حد بندیوں سے نہیں بنتیں، بلکہ اگر قومیں بنتی ہیں تو عقیدہ سے بنتی ہیں، نظریہ سے بنتی ہیں مگر جب ہم نے عقیدہ کو وجہ محبت ٹھہرانے کی بجائے رنگ ونسل اور قومیت کے بتوں کو پوجنا شروع کیا تو پاکستان دولخت ہو کر رہ گیا۔ [سقوطِ ڈھاکہ......مجموعہ افکار]

نوابزادہ نصراللہ خاں اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ

میز کے ایک طرف ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھی بیٹھے تھے جبکہ دوسری طرف نوابزادہ نصراللہ خان اور قومی اتحاد کے دوسرے راہنما تھے۔ مذاکرات جاری تھے۔ اسی دوران اس وقت کے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق نے دخل در معقولات کی نامعقول حرکت کی اور سیاستدانوں کو بریفنگ دینے کی کوشش کی۔ نواب صاحب نے جنرل کو فوراً ٹوکا اور کہا کہ سیاستدانوں کی بات سیاست دانوں سے ہوتی ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں بیچ میں بولنے والے؟ جنرل کو خاموش ہونا پڑا۔

یہ تھے نواب زادہ نصراللہ خان رحمہ اللہ جن کی زندگی آمریت کے خلاف جدوجہد سے عبارت ہے اور انہوں نے یہ جدوجہد عبادت سمجھ کر کی۔ 32 نکلسن روڈ لاہور اس جدوجہد کا مرکز تھا۔ قومی اتحاد کی تحریک کے دنوں میں اور پھر جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے دور میں اس مرکز سے لازوال جدوجہد کی گئی۔ شام کے وقت یہاں محفل گرم ہو جاتی۔ نواب صاحب میزبان ہوتے۔ مستقل شرکاء میں علامہ احسان الٰہی ظہیر جیسے بلند آہنگ خطیب، شورش کاشمیری جیسا عظیم مجاہد، محمد فاروق قریشی، مجیب الرحمٰن شامی اور بھی بہت سے دوسرے احباب تھے۔ ان میں اکثر حضرات کی جمہوریت سے وابستگی شدید

درجے کی تھی۔ شورش کاشمیری تمام عمر ایوبی آمریت اور یحییٰ خان کی آمریت کا مقابلہ کرتے رہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر زندگی سے بھرپور انسان تھے۔ اگرچہ وہ آغا شورش کاشمیری اور نواب زادہ صاحب سے جونیئر تھے لیکن انہیں اگر اس دور میں لاہور کی سیاسی محافل کی جان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ علامہ کی شہادت کے بعد ان کی یاد میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں مسجد شہدا میں ایک جلسہ ہوا نوابزادہ نصر اللہ خان بھی اس میں شریک ہوئے اور جگر مراد آبادی کا یہ شعر پڑھ کر مجمع لوٹ لیا۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

32 نکلسن روڈ کی یہ محفل کہ جس کے شرکاء نے اس کو ''شام غریباں'' کا نام دیا ہوا تھا، نواب صاحب کی وفات کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس ''شام'' کے مستقل شرکاء میں سے اکثر اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ لوگ جو سیاست میں بہت نیچے تھے بلکہ نواب صاحب کے شاگردوں کے شاگرد تھے، اب اس بیٹھک میں آکر بیٹھنے لگے۔ دوستوں کے اٹھ جانے کے بعد جو تنہائی نواب صاحب کے حصے میں آئی، اس کرب کا ذکر انہوں نے کبھی نہ کیا لیکن یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان جیسا حساس انسان اس دکھ سے آزاد رہتا۔ اس کی دلیل علامہ احسان الٰہی ظہیر کی وہ بڑی سی تصویر تھی جو ان کی نشست کے عین اوپر آویزاں تھی۔ لیکن ان کو اب انہی لوگوں سے گزارا کرنا پڑا۔ جن میں سے کافی سارے نواب صاحب کی وفات کے وقت ''خان گڑھ'' کا سفر بھی نہ کر سکے۔

اس ''شام غریباں'' کے شرکاء کی جمہوریت کے حوالے سے جدوجہد اور نظریات روشن اوراق کی مانند تاریخ کے سینے پر ثبت ہیں۔ شورش کاشمیری کی ایوبی اور یحییٰ آمریت کے دوران قید و بند کی صعوبتیں کون بھلا سکتا ہے۔ ؎

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

نوابزادہ نصراللہ خان اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد کا مرکزی نقطہ اس ملک میں حقیقی معنوں میں اقتدار پر عوام کا راج تھا اور وہ سارے دوست، بزرگ یکے بعد دیگرے اسی راہ پر قربان ہوتے چلے گئے۔ لیکن من حیث القوم ہم ابھی تک ان لوگوں کی جدوجہد کا ثمرہ اپنی جھولیوں میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں۔ حقیقی جمہوریت ہمارے ملک میں تب آئے گی جب عوام کی سوچ یک رخی ہو جائے گی۔ ہمیں اپنے حقوق کا اس درجہ ادراک ہو جائے گا کہ اگر کوئی ''فوجی طالع آزما'' مہم جوئی کرتے ہوئے ملک کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہونا چاہے گا تو اس کے لیے صرف نفرت ہوگی تب کوئی مشرف نواز اور ضیاء نواز ٹائپ کی تنظیمیں وجود میں نہ آئیں گی۔ اگر کوئی غلطی سے بھی اس ملک میں مارشل لاء لگانے کی جرأت کرے گا تو اس کے لیے اور اس کی آل اولاد کے لیے کسی دل میں محبت کی لہر نہ اٹھے گی۔ تب یقیناً تاریخ نواب زادہ نصراللہ خان کا مقام ان کو دے گی۔ نواب زادہ نصراللہ خان کی ساری زندگی یک نکاتی جدوجہد سے عبارت تھی، وہ نکتہ آمریت کے خلاف جدوجہد تھا۔

ہے دشت اب بھی دشت مگر خون پا سے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید اور نواب زادہ نصراللہ خان میں اس قدر گہرا تعلق تھا کہ جب علامہ نواب زادہ کے سامنے ابتسام الٰہی ظہیر کو لے کر آتے تو کہتے ''نواب صاحب اپنے پوتے کے لیے دعا کریں'' علامہ نواب صاحب کا باپ کی طرح احترام کرتے تھے اور نواب صاحب بھی علامہ کو اپنی اولاد کی طرح عزیز جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ہم نے علامہ کی یاد میں یا احتجاجی تحریک میں کوئی پروگرام رکھا نوابزادہ ہمیشہ شریک ہوئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کوئی ایک پروگرام ہو جس میں نواب صاحب کو بلایا گیا ہو اور آپ نہ آئے ہوں۔

جب جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا آیا تو اس نے بہت سے سیاسی قائدین کو جیل میں ڈال دیا۔ ظلم و جبر کے اس دور سیاں میں نواب زادہ نصراللہ خان بھی پابند سلاسل تھے۔ نواب صاحب نے پانچ سال ''جرم بے گناہی'' کی سزا کاٹی۔ اب وہ قیدی بھی زندہ نہیں اور قید کرنے والا بھی اپنے رب کے حضور جا چکا۔ اب تو روز قیامت ہی نواب زادہ کے ان پانچ برسوں کا حساب ہوگا۔ جب لمن الملك اليوم کا آوازہ بلند ہوگا۔

جب نواب زادہ کو جیل سے رہا کیا گیا تو علامہ شہید نے ان کے اعزاز میں شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جس میں لاہور کی تمام سیاسی اشرافیہ جمع تھی۔ نواب صاحب تشریف لائے۔ علامہ کو خبر دی گئی، آپ جلدی سے باہر آئے اور آپ کو بصد عزت و احترام اندر لے کر گئے۔ جہاں آپ کے گھر کے وسیع لان میں پنڈال سجایا گیا تھا۔

حافظ ابتسام الٰہی ظہیر کو بلایا ''نواب صاحب یہ آپ کا پوتا ہے'' یہ ہمارے معاشرے میں بزرگوں کو دی گئی عزت و احترام کی انتہا ہے۔ نواب صاحب کے لیے علامہ کی شہادت ایسے ہی تھی جیسے کسی کا اپنا بیٹا اس سے جدا ہو جائے۔ میں نے علامہ کی تصویر کا ذکر کیا۔ نواب صاحب کے ڈرائنگ روم میں علامہ کی شہادت کے بعد ایک بڑی سی تصویر لگا دی گئی۔ اگرچہ یہ تصاویر لٹکانا ہمارے نزدیک جائز ہے نہ مستحسن لیکن اس سے علامہ کے نواب صاحب سے قلبی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

جن دنوں ایم آر ڈی کی تحریک زوروں پر تھی تب علامہ اور نواب صاحب نے کتنے ہی جلسے اکٹھے کیے۔ انہی دنوں راوی روڈ میں ایم آر ڈی کے زیر اہتمام ایک عید ملن پارٹی کا انعقاد ہوا۔ اس میں نواب زادہ نصراللہ خان، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور دیگر سیاسی راہنما تشریف لائے۔ غیر جماعتی الیکشن ہونے والے تھے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ مگر جماعت اسلامی نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جماعت کا یہ عمل غیر مستحسن تو تھا ہی مگر سیاسی جماعتوں کے نزدیک بھی ناپسندیدہ تھا۔ اکبر

ساقی جو اس دور کے مشہور بریلوی راہنما تھے، وہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ علامہ نے ان کو بلایا اور کہا دیکھیں ساقی صاحب یہ جماعت اسلامی والے کیا حرکتیں کر رہے ہیں اور دعوے کر رہے ہیں کہ فلاں فلاں سیٹ ہم جیتیں گے، ذرا اس معاملے پر روشنی ڈالیں۔ اب علامہ کی انگیخت پر ساقی صاحب جوش میں آ گئے اور انہوں نے اس معاملے پر کچھ زیادہ ہی روشنی ڈال دی۔ نتیجتاً جماعت اسلامی والے دوست ناراض ہو گئے، جس حویلی میں پروگرام ہو رہا تھا وہ ''اپنے'' مولوی یعقوب فیملی کی حویلی تھی۔ حویلی کے سامنے جماعت کا دفتر تھا۔ ماحول کشیدہ ہو گیا۔ پھر علامہ کی یادگار تقریر ہوئی جس پر ''پیپلیے'' یعنی پی پی پی والے بڑے خوش تھے۔ ایسی خوشی کے بارے میں ہی تو مجیب الرحمٰن شامی نے لکھا ہے کہ ''جب علامہ ضیاء الحق پر برستے تو پی پی کے جیالے ان کی بھٹو دشمنی بھول کر تالیاں بجایا کرتے تھے۔''

اسی طرح چند روز بعد ہی سبزی منڈی کے علاقے میں ایم آر ڈی کے زیر اہتمام عید ملن پارٹی کا انعقاد کیا گیا۔ عید ملن پارٹی کیا ہوتی تھی، اکٹھے ہونے کا بہانہ ہوتا تھا۔ مارشل لاء کا دور تھا۔ ذرا ذرا سی آزادی ملی تھی جلسے کرنے کی۔ یوں سمجھیں جیسے دمے کے مریض کو بند کمرے سے نکالا جائے تو گرد آلود ہوا بھی اسے نعمت محسوس ہوتی ہے۔

سبزی منڈی کا علاقہ، راوی روڈ کا ہی ایک حصہ ہے اور منڈی کی وجہ سے کافی گندا ہے۔ علامہ کسی وجہ سے اس پروگرام میں نہ آ سکے جبکہ نواب صاحب تشریف لائے۔ میرے عزیز رانا جاوید نے جا کر نواب صاحب سے پوچھا کہ علامہ صاحب نہیں آئے، خیریت؟ نواب صاحب مسکراتے ہوئے کہنے لگے یار وہ بڑے بندے ہیں، نفیس طبع ہیں، یہ علاقہ دیکھ رہے ہو؟ کیسے آتے! یہ نواب صاحب کا مذاق میں کہا گیا ایک جملہ تھا، علامہ کی نفاست طبع کے حوالے سے، ورنہ علامہ کو ہم نے دیہاتوں کی کچی کیچڑ سے بھری ہوئی گلیوں میں دین کے لیے جان کھپاتے دیکھا ہے۔

ڈھاکہ کا المیہ

آج ہماری اٹھی ہوئی گردنیں جھک گئی ہیں آج تنے ہوئے سینے سمٹ کر رہ گئے ہیں آج ہماری آواز بجھ گئی ہے، آج ہماری روحیں مرجھا گئی ہیں، آج ہمارے دل بیٹھ گئے ہیں۔ آج ہمارے اعصاب ٹوٹ گئے، آج ہمارے جسم چھلنی ہو گئے، آج ہمارا دل زخمی ہے، آج ہمارا جگر تار تار ہے، یہ کیوں ہوا ایسا کیوں ہوا؟ ہم نے کبھی نہیں سوچا، اگر ہم نے یہ سوچا ہوتا تو آج ہم کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

ایم آر ڈی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ

ایم آر ڈی یعنی تحریک بحالی جمہوریت جنرل ضیاء الحق کے غاصبانہ اقتدار کا ردعمل تھا۔ ایم آر ڈی کے نام سے قائم اس اتحاد میں پاکستان کی صف اول کی مذہبی اور سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔ ان جماعتوں کا بنیادی نقطہ اشتراک پاکستان میں مارشل لا کا خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی تھا۔ اس اتحاد میں ماضی کے متحارب گروہ اکٹھے تھے۔ خان عبدالولی خان، نوابزادہ نصر اللہ خان، ملک محمد قاسم، مولانا فضل الرحمٰن، شاہ احمد نورانی اور دیگر جماعتیں جو ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف شاندار جدوجہد کر چکی تھیں، وہ سب ایم آر ڈی کا حصہ تھیں اور دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) بھی اس میں شامل تھی یعنی ماضی کے دشمن اب اکٹھے تھے۔ 1984ء اور 1985ء کے سال مشکلوں کے بعد آسانی کے نظر آ رہے تھے۔ مسجد شہدا میں ایم آر ڈی کا جلسہ ہوا، اس روز جنرل ضیاء الحق نے ریفرنڈم کروایا تھا۔ ریفرنڈم کیا تھا، ایک مذاق تھا، ایک سوال نامہ تھا۔ جس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے:

سوال: کیا آپ چاہتے ہیں اس ملک میں اسلام آئے؟؟

جواب: .... (تو پھر اس خالی جگہ پر ضیاء الحق کا نام لکھ دیں اسلام

آ جائے گا)۔

اس ریفرنڈم کا نتیجہ تو پہلے سے ہی طے شدہ تھا لیکن اس کے خلاف ایم آر ڈی نے مسجد شہدا میں جلسہ کیا۔ ہم چند دوست بھی چلے گئے۔ مسجد کے چبوترے کو اسٹیج بنایا گیا تھا۔ حاضری بھی معقول تھی اور باہر موجود پولیس کی حاضری اس سے زیادہ معقول نظر آ رہی تھی۔ شاید علامہ کو اندازہ تھا کہ آج سب کچھ درست نہیں۔ انہوں نے حسب معمول مجمع لوٹ لیا، نہایت شاندار اور پر جوش تقریر تھی۔ علامہ تقریر ختم کر کے اسٹیج پر بیٹھ گئے اور چند لمحے بعد ہی اٹھ کر چل دیئے۔ ان کی نگاہ ہم پر پڑی یا شاید پہلے سے ہی ہم نگاہ میں تھے۔ میری کم سنی کا لحاظ کر کے اشارہ کیا چلے جاؤ یہاں سے۔ ہم ان کا اشارہ پا کر چل دیئے۔ لیکن تجسس کے باعث ایک آدھ سڑک کا چکر لگا کر واپس آ گئے تو ماحول گرم تھا۔ ضیاء الحق کی سپاہ نہتے عوام پر لاٹھیاں برسا رہی تھی۔ لاٹھی چارج زوروں پر تھا۔ اینٹیں چل رہی تھیں۔

ایم آر ڈی کا جلسہ موچی دروازہ

مسجد شہداء کے جلسے کے چند روز بعد نوری مسجد کے باہر جلسہ ہوا جو لاہور ریلوے اسٹیشن کے باہر واقع ہے وہاں بھی خوب لاٹھی چارج ہوا۔ تب تک ایم آر ڈی کو جلسے اور جلوس کی اجازت نہیں تھی۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخاب ہوئے اور محدود پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایم آر ڈی نے موچی دروازے میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے جبر و تشدد کے طویل دور میں یہ ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا تھا۔ جونیجو حکومت قائم ہو چکی تھی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل گئی تھی مگر محدود پیمانے پر۔ موچی دروازے کا تاریخی میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ تمام حاضرین بہت پر جوش تھے۔ قائدین نواب زادہ نصر اللہ خان کی رہائش گاہ پر جمع ہوئے تھے۔ نماز ظہر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس لیے

فیصلہ کیا گیا کہ پہلے نماز ادا کر لی جائے پھر جلسہ گاہ کی طرف چلنا چاہیے۔ ملک کی صف اوّل کی قیادت جمع تھی جبکہ مقابلے میں ضیاء الحق تھا جو کہ اسلام کا علمبردار تھا اور اس کے بعض سادہ لوح حامی یہ تاثر دیتے تھے کہ ضیاء الحق سے زیادہ سچا اور مخلص کوئی مسلمان راہنما کوئی اور نہیں۔ اور اس کے مخالفوں کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر ایم آر ڈی کے جلسے سے پہلے اس کے قائدین کا باجماعت نماز ادا کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی مسلمان ہی تھے، کافر نہیں تھے۔ ملک محمد قاسم، ملک حاکمین، نوابزادہ نصراللہ خان، خان عبدالولی خان، غلام احمد بلور، مولانا فضل الرحمان، غلام مصطفیٰ جتوئی، بیگم نسیم ولی خاں اور کتنے ہی صف اول کے راہنما موجود تھے۔ نماز شروع ہونے لگی تو سب نے علامہ شہید سے کہا کہ امامت کرائیں۔ آپ نے نماز پڑھائی۔ اس کے بعد آپ نے حاضرین کو مخاطب ہو کر کہا کہ اب عصر کی نماز بھی ادا کر لی جائے۔ اس پر حاجی غلام احمد بلور نے کہا علامہ صاحب ظہر تو پڑھ لی عصر کا یہ کون سا وقت ہے؟ علامہ شہید کے دل میں اپنے مسلک کی غیرت اور حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، بولے کہ ”بلور صاحب یہ مسائل بھی آپ کو اہل حدیث ہی بتائیں گے۔“ اور اس کے بعد آپ نے مختصراً نماز عصر کو ظہر کے ساتھ ملا کر پڑھنے کا مسئلہ بتایا۔ اس پر غلام احمد بلور نے کہا ”علامہ صاحب آپ ہمارے امام ہیں، اگر آپ یہ کہتے ہیں تو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔“ ایک قہقہہ بلند ہوا اور علامہ شہید نے نماز عصر پڑھائی۔ نماز ادا کرنے کے بعد تمام قائدین جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حاضرین کا جوش دیدنی تھا۔ تقاریر شروع ہو گئیں۔ مسلم لیگ کے صدر ملک محمد قاسم تقریر کر رہے تھے۔

ملک قاسم اپنی ہی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ دوسری طرف بھی مسلم لیگ تھی جس کے سربراہ محمد خان جونیجو تھے اور اس کے علاوہ نصف درجن مسلم لیگیں الگ ہوں گی۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ فرقے بازی، دھڑے بندی اور گروپ بازی میں سیاسی

جماعتیں ہمیشہ مذہبی جماعتوں سے آگے رہی ہیں۔ جوتیوں میں دال بٹنے کے محاورے کا عملی مظاہرہ دیکھنا ہو تو ان سیاسی جماعتوں کو دیکھ لیجئے۔ لوٹ مار کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ ان سیاسی جماعتوں کے قائدین نے لوٹ مار کے نہ صرف ریکارڈ قائم کیے بلکہ نت نئے اور حیرت انگیز طریقے بھی ایجاد کیے۔ آصف علی زرداری وغیرہ کے نام تو خیر ضرب المثل بن چکے۔ اگر ہماری بعض مذہبی جماعتوں کے پسندیدہ سیاستدان میاں نواز شریف کی ''صلاحیتوں'' کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے وسیع و عریض سترہ سو ایکڑ پر پھیلے محل ''جاتی عمرہ'' کو دیکھ لیں کہ جہاں تک جانے والی سڑکیں بھی سرکاری خرچ سے تعمیر ہوئیں اور مصری شاہ کی کسی ٹوٹی گلی کے پانچ مرلے سے بھی کم شاید اس ''جاگیر'' کا ٹیکس ادا کیا جاتا ہے۔ ڈیوس روڈ پر واقع مسلم لیگ کا وسیع دفتر بھی ملک محمد قاسم کی مسلم لیگ کے پاس تھا جس کو حکومت میں آ کر میاں نواز شریف نے ''شرافت'' کے زور پر قبضے میں کر لیا تھا۔

بات موچی دروازے سے کافی دور نکل گئی، ملک قاسم تقریر کر رہے تھے اور بہت جوش وخروش سے جنرل ضیاء الحق کے لتے لے رہے تھے۔ اچانک پنڈال میں دھماکے ہونا شروع ہو گئے۔ یہ کریکر دھماکے تھے۔ کریکر اس گولے کو کہتے ہیں جو زمین پر گرنے سے پھٹ جاتا ہے۔ اس سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا مگر آواز بڑی گونج دار ہوتی ہے اور خاصی دہشت پھیلتی ہے۔ دھماکے ہونا شروع ہو گئے۔ اب ملک قاسم بے چارے چیخ رہے تھے۔ لیکن اس ہنگامے میں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز لگ رہی تھی جو بھلا کون سنتا۔ مجھے آج بھی ان کا یہ جملہ یاد ہے کہ ''دیکھو پولیس والو! دیکھو یہ کون کر رہا ہے۔'' ویسے یہ بھی لطیفے کی بات تھی، پولیس والے جنرل ضیاء الحق سے تنخواہ لیتے تھے ملک صاحب مرحوم سے تو نہیں۔ مجمع اکھڑ چکا تھا۔

ایسے میں راؤ رشید آگے بڑھے اور ملک قاسم سے مائیک لے لیا اور ان الفاظ

میں گویا ہوئے ''حضرات آپ آرام سے رہیے۔ اب میں اس شخصیت کو دعوت دینے لگا ہوں جو اردو زبان کے آج کے سب سے بڑے مقرر ہیں اور نہ صرف اردو کے بلکہ عربی کے اتنے ہی بڑے مقرر ہیں۔'' میرے ساتھ میرے ماموں زاد رانا جاوید رفیق کھڑے تھے۔ اور ساتھ ہی جمعیت علماء اسلام کے ایک ورکر مولوی صاحب کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ راؤ رشید مقررؔ کے نام کا اعلان کرتے، وہ مولوی صاحب جوش محبت میں با آواز بلند نعرہ زن ہوئے ''مولانا فضل الرحمان کا خطاب ہونے لگا ہے۔'' ہم مسکرا دیئے اور کہا نہیں یہ مولانا فضل الرحمان نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان ہو گیا کہ اب آپ کے سامنے علامہ احسان الٰہی ظہیر تقریر کریں گے۔ دھماکے مسلسل جاری تھے اور لگتا تھا آج جلسہ اُکھڑ جائے گا کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید مائیک پر آئے۔ عجیب منظر تھا، سامنے بے قابو اور اکھڑا ہوا مجمع۔ دوسری طرف شیر کی نگاہ لیے علامہ کھڑے تھے۔ آپ نے مائیک پہ آ کر چند لمحے توقف کیا۔ دائیں بائیں دیکھا پھر گویا شیر کی دھاڑ تھی جو فضا میں گونجی:

''جو اسلام اور جمہوریت کو مانتا ہے وہ بیٹھ جائے اور جو ضیاء الحق کا یار ہے وہ کھڑا رہے۔''

....

..................گہری خاموشی۔

یہ جملے کہے اور آپ ٹھہر گئے...... چند ثانیے توقف......سکوت......انتظار

پھر ہم نے دیکھا لوگ ایک دوسرے کو خاموش کروا رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کا ایک ورکر چیخ چیخ کر لوگوں کو کہہ رہا تھا ''یار چپ ہو جاؤ یہ تقریر تو سننے والی ہے۔''

خطابت کیا تھی، شیر کی دھاڑ تھی، آواز اور لہجہ کیا تھا، اک سحر تھا، فسوں تھا، جو سارے پنڈال پر چھا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ایسے تھا کہ جیسے یہاں ابھی کوئی ہنگامہ

تھا ہی نہیں۔

اس جلسے میں علامہ شہید کی تقریر نے بہت سارے چراغ گل کر دیئے۔ حالانکہ اس روز جس طرح جلسہ خراب ہوا تھا یہ علامہ صاحب کا کمال تھا کہ ایم آر ڈی کا یہ جلسہ انہوں نے بچا لیا، ورنہ اس روز یہ "لیڈران" شاید اپنے جوتے بھی چھوڑ کر بھاگ اٹھتے۔ ایک "مولوی" کے ہاتھوں ایسا قابل تحسین کارنامہ تنگ دل اور کج ذہن "روشن خیالوں" کو کیسے برداشت ہوتا۔ بائیں بازو کے بعض لوگ کچھ زیادہ ہی "سڑ" گئے۔ اگر اس جلن کو دیکھنا ہو تو اگلے روز کے نذیر ناجی کے کالم کو پڑھیے۔ نذیر ناجی کا کالم لکھنے کا انداز تب بھی ایسا ہی تھا کہ کسی پر تنقید بھی کرنی ہے تو تہذیب سے کوسوں دور رہ کر۔ انسانی اقدار اور تہذیب و اخلاق کے یہ نام نہاد علم بردار جب بھی طبقہ علماء کے متعلق بات کرتے ہیں تو تحقیر کی غرض سے "ملا" اور "ملا ازم" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دوسری تکلیف ان "اصحاب الشمال" کو یہ تھی کہ علامہ نے اسی جلسے میں اپنی تقریر میں ایک مسلمان مذہبی راہنما ہونے کے ناطے اسلامی نظریات پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ اب ذرا سوچئے! ہمارے یہ بائیں بازو کے سیاسی راہنما جو بہر حال مسلمان تھے، لیکن صرف برائے نام۔ کیونکہ انہیں علامہ کے اسلامی افکار سے شدید اختلاف تھا۔

ایم آر ڈی کے زیر اہتمام دوسرا جلسہ دھوبی گھاٹ فیصل آباد میں ہوا تھا۔ دھوبی گھاٹ کا میدان مکمل بھرا ہوا تھا۔ حسب سابق تمام سیاسی قیادت موجود تھی۔ وہاں پر بھی تقریر کرتے ہوئے علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

"مولوی کو دو ہی موقعوں پر بلایا جاتا ہے۔ ایک جب کسی کے گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے دوسرا جب جنازہ پڑھانا ہوتا ہے۔ آج مولانا فضل الرحمٰن آئے ہیں جمہوریت کے بچے کے کان میں اذان دینے کے لیے اور میں آیا ہوں ضیاء الحق کی آمریت کا جنازہ پڑھانے کے لیے۔"

ان دنوں جنرل ضیا کی پنجاب حکومت کے کھیلوں کے وزیر سرفراز نواز نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ''جب ہمارے ملک کی ہاکی ٹیم کی لڑکیاں پورے پاجامے پہن کر میچ کھیلتی ہیں تو مجھے بہت شرم آتی ہے۔'' یعنی نیکریں کیوں نہیں پہنتیں جو روشن خیالی کو ظاہر کرے۔

اس پر علامہ نے شدید تنقید کی، اور بہت سخت الفاظ استعمال کیے ظاہر ہے کہ دینی حمیت اور غیرت کا تقاضا بھی یہ ہی تھا۔

علامہ ظہیر کا یہ انداز ایم آر ڈی کے بعض دوسرے درجے کے لیڈران کے لیے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ ایم آر ڈی کے چند روز بعد ہونے والے اجلاس میں ان لوگوں نے خاصا شور مچایا۔ دل چسپ امر یہ تھا کہ علامہ نے بوجوہ ایم آر ڈی میں باضابطہ شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ محض مبصر کے طور پر ان کے جلسے میں چلے گئے تھے، جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا فضل الرحمٰن تب تک ایم آر ڈی کا باقاعدہ حصہ بن چکے تھے۔ علامہ شہید کے ایم آر ڈی کے ان چند جلسوں میں جانے کی وجہ سے ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ ان دنوں ویسے بھی ''امیر المؤمنین'' جنرل ضیاء الحق کی محبت بہت سے اہل حدیث علماء کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ انہوں نے جا بجا پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ علامہ پی پی پی کے ساتھ مل گئے ہیں۔ ان میں علامہ کے مخالف گروہ کے لوگ ہی نہیں بلکہ ان کی اپنی جمعیت اہل حدیث کے بعض نیم لیڈر قسم کے لوگ بھی تھے۔ ہماری سیاسی پختگی کی حالت یہ ہے کہ پچھلے دنوں (2012ء میں) یعنی علامہ کی شہادت کے پچیس سال بعد محترم حافظ صلاح الدین یوسف نے مجلّہ تنظیم اہل حدیث میں ایک مضمون لکھا۔ جس میں مذہبی جماعتوں کے سیکولر اور خالصتاً سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر ناقدانہ تبصرہ کیا۔ خیر یہ ان کا نقطہ نظر ہے، جس سے اختلاف ہو سکتا ہے البتہ ان کا احترام لازم ہے۔ لیکن حافظ صاحب بھی اس میں

اشارۃً علامہ کے ایم آر ڈی کے ساتھ اس تعلق کو اتحاد لکھ گئے۔ محض دو جلسوں میں جا کر تقریر کرنا اگر اتحاد ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد پر نہ جانے کیا فتویٰ لگے گا، جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر جانے کہاں تک جا پہنچے۔ انہوں نے تو خدا جانے ''کفر'' کی کون سی منازل طے کر لیں۔

اگلی حیرت آج سے محض چند سال پہلے اور علامہ کی شہادت کے تقریباً بیس سال کے بعد منہ کھولے کھڑی تھی کہ جب ''اسلام پسند'' میاں نواز شریف نے اپنی ''بہن'' محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ مل کر سیاسی اتحاد ''اے-آر-ڈی'' کے نام سے بنایا، اس میں بھی دو اہل حدیث جماعتیں شامل تھیں۔ لیکن تب تک شاید پیپلز پارٹی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی، اور وہ لوگ جو ایم آر ڈی میں حضرت علامہ کے محض دو جلسوں میں شرکت پر کیمونسٹ ہونے تک کا فتویٰ لگانے جا رہے تھے، اب پتہ نہیں کیوں خاموش تھے۔ ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

ویسے میں ذاتی طور پر اس کا تجزیہ کر سکتا ہوں مگر اشارتاً بات کر کے آگے چلوں گا کہ علامہ پر تنقید اس لیے کرنی آسان تھی کہ وہ اپنے مخالف نقطہ نظر کی رائے سنتے اور اسے اہمیت دیتے، حتیٰ کہ ناروا انداز بھی برداشت کر لیتے، نتیجتاً ان کے سامنے بعض ''دوستوں'' کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ جبکہ وہی پیپلز پارٹی تھی اور اس کے ساتھ ARD میں باقاعدہ اتحاد بن گیا لیکن دوست اب سیانے ہو گئے تھے۔ جانتے تھے کہ اب علامہ کہاں، جو اختلاف برداشت کر لے، اب تو ''اپنی عزت کبھی کبھی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

اس سارے قضیے کو کہ علامہ ایم آر ڈی میں شامل ہوئے تھے یا نہیں، علامہ شہید کا اپنا بیان ہی حل کر دیتا ہے جو ہم نقل کر رہے ہیں۔ اس پس منظر کے ساتھ کہ جب علامہ

نے چند ترقی پسند......صحیح تر الفاظ میں اسلام بیزار......خواتین پر فیصل آباد کے جلسے میں تنقید کی تو نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی پنجاب کے صدر احسان وائیں نے علامہ کے خلاف بیان بازی شروع کر دی۔ اور ساتھ ہی دو تین اور پارٹیوں کو ملا کر ایم آر ڈی کی قیادت کو درخواست دے دی کہ علامہ لاہور میں نکلنے والے خواتین کے جلوس پر کڑی تنقید کر رہے ہیں، جبکہ ایم آر ڈی کے مقاصد سے یہ بات میل نہیں کھاتی۔ اس سے چند روز بعد ملتان میں ایم آر ڈی کا جلسہ تھا۔ علامہ کو ایم آر ڈی کے جلسوں کا کیا لالچ اور پھر معاملہ بھی دین اسلام کی غیرت کا۔ علامہ کی جماعت نے اس کا 17 فروری 1986ء کے اخبارات میں ان الفاظ میں سخت جواب دیا:

> ''جمعیت (اہل حدیث) نے ایم آر ڈی سے اشتراک عمل صرف جمہوریت کی بحالی کے لیے کیا تھا۔ اگر چند مغرب زدہ خواتین اسلام اور شعائر اسلام کا مذاق اڑائیں تو اس پر کسی صورت خاموشی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ ان کو اصل تکلیف جمعیت اہل حدیث کی شوریٰ کے اجلاس میں روس کے خلاف پیش کی گئی قرارداد کی ہوئی ہے۔''

علامہ کی جماعت کے اس سخت ردعمل کے بعد ایم آر ڈی کی قیادت کو احساس ہوا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے اور انہوں نے باقاعدہ ایک وفد علامہ کے پاس بھیجا جس میں مقصود علی شاہ، ملک حاکمین اور امتیاز علی شاہ شامل تھے۔ اگلے روز اخبار میں خبر شائع ہوئی ''ناراضگی ختم کر دیں'' لیکن اس کے بعد علامہ ایم آر ڈی، ملتان کے جلسے میں تشریف نہیں لے گئے اور یہ چند روزہ رومانس علامہ کے اس طویل بیان کے بعد ختم ہو گیا:

> جمعیت اہلحدیث کے راہنما علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کہا ہے کہ وہ ایم آر ڈی کے ''چھٹ بھیئے'' عناصر کی طرف سے اسلام اور خواتین کے حقوق کے سلسلے میں ان کے خلاف جو مذموم مہم چلائی گئی ہے، جب تک ایم آر

ڈی کی مرکزی قیادت اس کا ازالہ نہیں کرتی، اس وقت تک وہ ایم آر ڈی کی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوں گے اور کل 21 فروری کو ملتان میں ایم آر ڈی کے جلسہ عام میں بھی شرکت نہیں کریں گے۔ وہ آج یہاں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کہا کہ ایم آر ڈی کے لادین اور ملحد عناصر نے ان کے خلاف جو مہم شروع کی ہے، اس کے جواب میں اب تک صرف اس لیے خاموش رہا کہ ملک میں جمہوریت کی تحریک کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تحریک بحالی جمہوریت کے چند ''چھوٹے'' سوشلسٹ اور کمیونسٹ عناصر تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ وہ ملک میں جمہوریت کی تحریک کو پروان چڑھنے نہیں دیں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ حکومت سے تنگ آئے ہوئے عناصر جمہورت کی بحالی کے لیے مثبت طور پر جدوجہد کرنے کی بجائے انتشار اور توڑ پھوڑ کی راہ اختیار کریں تاکہ ملک میں سوشلزم اور کمیونزم کے فروغ کی راہ کھل جائے۔ انہوں نے کہا کہ میرے لیے یہ بڑی تعجب کی بات ہے کہ ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم پر گزشتہ دو تین برس سے جمہوریت کی بحالی اور عوام کے جمہوری حقوق کی بازیابی کے لیے انتہائی کٹھن حالات اور ناخوشگوار ماحول میں ایم آر ڈی کی جماعتوں کے شانہ بشانہ شریک رہنے کے باوجود بعض عناصر ان کے خلاف مہم چلانے پر کمربستہ ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان دنوں اور اس ماحول میں یہ ''چھٹ بھیئے'' جدوجہد میں شریک نہ تھے۔ اب جبکہ یہ کارواں رواں دواں ہو گیا ہے، اس کے بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہونے لگے ہیں، کچھ لوگ حسد کا شکار ہو کر ان عناصر کے ساتھ مل کر جو اسلام اور شریعت اسلامیہ سے خوفزدہ ہیں، نیز بعض سرکاری

عناصر کی شہ پر بلا وجہ چیخ و پکار میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں این ڈی پی کے ایک ''گمنام دوست'' کا یہ بیان بھی شائع ہوا ہے کہ فیصل آباد میں اسلام کی حمایت اور عورتوں کے مساوی حقوق کی مخالفت کرنے کی وجہ سے آئندہ مجھے ایم آر ڈی کے جلسوں میں تقریر کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ گویا ایم آر ڈی کے جلسوں میں تقریر کا اختیار انہی کو حاصل ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ایم آر ڈی کے جلسے میں تقریر کی دعوت مرکزی قیادت نے دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ فیصل آباد کے جلسے میں میں نے صدر ضیاء الحق کو متوجہ کیا تھا کہ اسلام کے نام لیواؤں کی اس اسمبلی میں ایک رکن اسمبلی اس بات پر شرمندہ ہو رہا ہے کہ لڑکیاں نیکریں پہن کر ہاکی کیوں نہیں کھیلتیں اور اس کے باوجود کہ ملک میں حدود آرڈیننس نافذ ہے لیکن گناہ کے بازار کھلے ہیں۔ یہ کیسا اسلام ہے۔ لیکن ان نام نہاد سوشلسٹ، لادین اور ملحد عناصر نے ان دونوں باتوں کو عورتوں کے حقوق کے منافی قرار دے کر میرے خلاف مہم شروع کر دی ہے۔ انہوں نے استفسار کیا کہ کیا یہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت ہو رہی ہے کہ لوگوں کی بہو، بیٹیوں کو نیکریں پہنا کر ہاکی کھلائی جائے اور ''گناہ کے بازار'' کھلے رہیں؟ علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کہا کہ اسلام کا نام لینے سے اگر کسی کو تکلیف ہو رہی ہے تو ہمیں اس کے ازالے کی کوئی خواہش ہے نہ آرزو۔ انہوں نے کہا ہمارے نزدیک اس ملک میں اسلام کی بے آبروی اور مخالفت اس ملک کے وجود اور تخلیق کی مخالفت ہے۔ جمہوریت کی جدوجہد میں بھی ہم نے ان کا ساتھ اس وجہ سے دیا ہے کہ اسلام جمہوریت کا سب سے بڑا دعوے دار ہے۔ ہم کسی شخص کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے

اسلام کی ذمہ داریاں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا جینا مرنا اسلام کے لیے ہے خواہ مغرب زدہ عناصر ناراض ہی کیوں نہ ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو ہم ان کے خلاف اسی طرح لڑیں گے جس طرح جمہوریت دشمنوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کے سلسلے میں ہم نہ تو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کریں گے اور نہ کسی سے سمجھوتہ کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایم آر ڈی کے اساسی چار نکات ہیں اور اگر انہیں چھوڑنے والی جماعتوں کو ایم آر ڈی میں برداشت کیا جا سکتا ہے تو پھر اسلام کا نام لینے پر اس قدر ناگواری کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایم آر ڈی میں یہ رویہ بظاہر خیال کی آزادی کے خلاف ہے۔ ہم نے صدر ضیاء الحق کے خلاف بھی اسی لیے جدوجہد کی تھی کہ وہ اظہار خیال پر پابندی عائد کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا یہ ملک جمہوریت اور اسلام کے لیے بنا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے اختلاف ملک دشمنی کے مترادف ہے، جس کی توقع ہم سے نہ رکھی جائے۔

(نوائے وقت، 21 فروری 1986ء)

اس قضیے کے بیچ میں ہمارے پرانے ''مہربانوں'' یعنی جماعت اسلامی والوں کو الگ ہی سوجھی کہ علامہ شہید کے خلاف ایک خط بمعہ ''ثبوت'' سعودی حکومت اور علامہ کے استاذ ذی وقار مفتی اعظم سعودیہ شیخ عبدالعزیز بن باز (رحمہ اللہ) کو ارسال کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر ''امیر المومنین'' حاجی محمد ضیاء الحق کے دشمن ہیں اور ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کے حامی ہیں۔ جماعت اسلامی کے خط کے متن کی خبر ہمیں مل سکتی تھی۔ اس کا اندازہ شیخ ابن باز کے خط سے ہوتا ہے کہ جو شیخ رحمہ اللہ نے علامہ کو لکھا۔ وہ مجھے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا خط علامہ کے کاغذات سے ملا۔

ذاتی لیٹر پیڈ پہ شیخ نے ان اعتراضات پر علامہ شہید سے نجی طور پر پوچھا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ اور آپ بے نظیر بھٹو کے حامی کیوں ہیں؟ شیخ عبدالعزیز بن باز علامہ سے پوچھنے کا مکمل حق رکھتے تھے کیونکہ آپ مدینہ یونیورسٹی میں علامہ کے استاد تھے اور علامہ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ آنے جانے والوں سے علامہ کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ علامہ کے نام میں ایک خط پڑھ رہا تھا جو مدینہ یونیورسٹی کے کسی پاکستان طالب علم نے لکھا تھا کہ شیخ ابن باز کو قاری غلام رسول ملنے آئے جو بریلوی تھے اور پاکستان میں خاصے معروف تھے، شیخ نے ان سے بھی پوچھا کہ آپ علامہ احسان الٰہی ظہیر سے ملے ہیں، وہ کیسے ہیں؟ قاری صاحب صرف ''نعم'' کر کے رہ گئے۔ خیر یہ الگ قصہ ہے۔ مقصود یہ تھا کہ شیخ علامہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ علامہ نے شیخ ابن باز کے خط کے جواب میں دو صفحات پر مشتمل خط لکھا مگر ساتھ بے نظیر صاحبہ کے بارے میں اپنے اخباری بیانات کے تراشے ارسال کر دیئے۔ اس پر جماعت اسلامی کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

اس ساری لڑائی کا فائدہ یہ ہوا کہ چند روز بعد گوجرانوالہ سے امیر جمعیت مولانا محمد عبداللہ کی قیادت میں ایک وفد علامہ سے ملا۔ جس نے یہ مطالبہ کیا آپ ایم آر ڈی کے جلسوں کو چھوڑیں، ہمیں خود اپنے جلسے شروع کرنے چاہئیں۔ علامہ تو پہلے ہی ایم آر ڈی پر مٹی ڈال چکے تھے، اس تجویز نے محرک کا کام کیا اور صرف دو ماہ بعد علامہ نے موچی دروازے میں ایم آر ڈی کے اجتماع سے کہیں بڑا جلسہ کر کے دکھا دیا اور پھر چند ماہ میں ہی پے در پے کئی شہروں میں جلسے ہوئے۔

ایم آر ڈی کے دو جلسے اتنا بڑا ایشو بنے کہ اس حوالے سے ایک اور دل چسپ کہانی میں اپنے قارئین کو بتاتا چلوں۔ جب علامہ نے ایم آر ڈی کے جلسے میں تقریر کر لی تو علامہ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا حتیٰ کہ بعض مرحوم بزرگ علامہ کے والد

حاجی ظہور الٰہی تک جا پہنچے۔ حاجی ظہور الٰہی دینی غیرت میں شدید نہیں شدید تر تھے۔ جا کر ان کو خوب بھڑکایا کہ آپ کا بیٹا پیپلز پارٹی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ آپ کا بیٹا اب سوشلسٹوں کا نمائندہ بن گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جلسے کی تصاویر جو اخبارات میں شائع ہوئیں، انہیں دکھائی گئیں۔ علامہ کے ساتھ اسٹیج پر پرویز صالح بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیگم نسیم ولی خان تشریف فرما تھیں ......جی ہاں وہی بیگم نسیم ولی خان جو قومی اتحاد کا ستارہ تھیں......شاید ان لوگوں کی نظر میں تب ''مجاہدہ اسلام'' رہی ہوں گی۔ ان کی تصویر حاجی صاحب کو دکھائی گئی۔ اوپر سے حاجی صاحب ضیاء الحق کے حامی بھی تھے۔ چند روز بعد حاجی صاحب مکتبہ قدوسیہ پر آ موجود ہوئے۔ میرے والد کو علیحدہ لے کر بیٹھ گئے ''تم اس کو سمجھا سکتے ہو، تمہاری بات وہ مانتا ہے۔ تم خود ہی دیکھو۔ وہ کن لوگوں کے ساتھ جلسے کر رہا ہے۔ وہ بھٹو کی پارٹی میں شامل ہو گیا ہے۔'' میرے والد نے بہت کہا، لوگ آپ کو بھڑکاتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن حاجی صاحب کو قائل کرنا بھلا کب آسان تھا۔ نہ مانے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ میرا بیٹا ضیاء الحق کی مخالفت کر کے صحیح نہیں کر رہا اور پیپلز پارٹی کے نظریات کا حامی ہے۔ مدت تک اس مسئلے پر ناراض رہے اور جب علامہ دنیا سے چلے گئے۔ تب کہتے تھے ''ہائے احسان الٰہی لوگوں نے تیرے بارے میں بہت جھوٹ بولے۔'' علامہ کی شہادت کے بعد ایک روز اپنی اہلیہ سے کہنے لگے ''میں تو جدھر جاتا ہوں احسان الٰہی کے تذکرے ہیں۔ میں تو میدانوں میں بھی گیا ہوں اور پہاڑوں میں بھی۔ ہر طرف لوگ دین کے لیے احسان الٰہی کی خدمات بیان کرتے ہیں۔''

آئین شریعت کانفرنس

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کے مولانا فضل الرحمان نے مینار پاکستان پر آئین شریعت کانفرنس کا اعلان کر دیا۔ جمعے کا دن تھا۔ ہم نے بھی علامہ کی

اقتدا میں نماز جمعہ ادا کی۔ جمعے کے بعد علامہ شہید نے کہا کہ مینار پاکستان جانا ہے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ بٹھا لیا۔ چند دیگر افراد سمیت ہم مینار پاکستان جا پہنچے۔ جمعیت علمائے اسلام کے کارکنان نے جب علامہ کو اپنے بیچ دیکھا تو ان کے چہرے کھل اٹھے۔ علامہ عقبی دروازے سے، جو بادشاہی مسجد کے سامنے واقع تھا، داخل ہوئے اور گاڑی چلانے سٹیج کے بالکل عقب میں جا پہنچے۔ علامہ شہید اوپر سٹیج کے پچھلے حصے میں جا کر تشریف فرما ہو گئے۔ وہاں ملک محمد قاسم، راؤ رشید، اور کئی دوسری جماعتوں کے لیڈران بھی موجود تھے۔ اگرچہ یہ جلسہ جمعیت علمائے اسلام کا تھا اور انہوں نے بطور مقرر دوسری جماعتوں کو نہیں بلایا ہوا تھا مگر یہ سب لیڈران اظہار یک جہتی کے لیے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ جب مولانا فضل الرحمان تقریر کر رہے تھے تو علامہ شہید نے تین بار کاغذ پر لکھ کر ان کو چند امور کی طرف توجہ دلائی کہ اب یہ بات بھی کریں اور یہ بھی کریں۔ یہ دن جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کے خلاف مسلسل تحریک کے دن تھے اور علامہ اس معاملے میں اپنے مزاج کے مطابق خاصے پر جوش تھے۔ اس کے علاوہ دیوبندی حضرات علامہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ لاہور میں ان کو جب بھی مسائل کا سامنا ہوتا وہ علامہ شہید سے یوں ملتے تھے اور اپنے مسائل کا ذکر کرتے تھے جیسے ان کی جماعت کا حصہ ہوں اور علامہ شہید نے بھی ہمیشہ ان سے شفقت کا معاملہ کیا۔ علامہ کی شہادت کے بعد یہ قربتیں دوریوں میں بدل گئیں۔

تم سارے پلٹ جاؤ

میرا اللہ! تو لکھ لے۔ لوگو! تم نے قیامت کے دن گواہی دینی ہے کعبے کے رب کی قسم ہے! تم سارے پلٹ جاؤ میں لڑوں گا، اکیلا لڑوں گا اور اس وقت تک لڑوں گا جب تک مال روڈ (لاہور) پہ مدینے والے کا پرچم نہیں لہرا جاتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ

یہ سوال عموماً سننے میں آتا ہے کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر جنرل ضیاء الحق کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ جبکہ جنرل ایک شریف النفس انسان تھا، دیندار تھا اور اس ملک میں اسلام لانا چاہتا تھا...... اپنی جگہ ہمارے یہ ''خوش فہم'' دوست بھی سچے ہیں۔ کیونکہ انہوں بھٹو کا دور دیکھا ہوا تھا۔ جب شرافت منہ چھپائے پھرتی تھی اور دین داروں کے لیے مشکل دن تھے۔ لیکن ہر شے کو جذبات اور عقیدت یا کسی کی مخالفت کے پیمانے سے نہیں ماپا جاتا...... سوال یہ تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے بہت شدّ و مد سے اسلام کے نفاذ کی باتیں کیں۔ دکھاوے کو بعض عملی اقدامات بھی کیے۔ کبھی ہمارے ان بھولے دوستوں نے اس اسلام اور شریعت کے ''نفاذ'' کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ بھی کیا ہے...... اور جو لوگ بروقت تجزیہ کرنے میں کامیاب ہو گئے وہ پھر جنرل ضیاء الحق کے اس قدر مخالف کیوں ہو گئے تھے۔ بہت زیادہ بہتر ہو گا کہ ہم اپنے خیالات اور تجزیوں پر انحصار کرنے کی بجائے اس سوال کا جواب علامہ کی تحریروں اور تقاریر میں تلاش کریں۔ وارث میر علامہ کے حوالے سے ایک واقعہ روایت کرتے ہیں کہ جب یہ سوال خود حرم کعبہ میں جنرل ضیاء الحق نے علامہ سے پوچھا تھا۔ تو علامہ نے کیا

جواب دیا اور یہ واقعہ اس لیے بھی مستند ہے کہ علامہ نے اپنی کئی تقاریر میں اس کو بیان کیا۔ لیکن میں نے وارث میر کی تحریر سے اس کی نقل کرنا مناسب سمجھا کہ اس تحریر کو شائع ہوئے آج پچیس برس ہونے کو آئے کسی نے اس واقعے کی صداقت پر شک کا اظہار نہیں کیا۔ وارث میر لکھتے ہیں:

لیکن ٹھہریے! کچھ دیر کو واپس چلتے ہیں کہ جب بھٹو حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ حکومت پر قبضہ مستحکم ہو گیا۔ اصغر خان کو اقتدار میں آنے کی امید لگی تو وہ قومی اتحاد سے الگ ہو گئے۔ اس پر علامہ احسان الٰہی ظہیر تحریک استقلال کو احتجاجاً چھوڑ گئے۔ جی ہاں اس منظر نامے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر ''نفاذِ شریعت'' کے شوق میں جنرل ضیاء الحق کے قریب ہو گئے۔ اس حد تک قریب کہ ضیاء الحق نے ''نفاذ شریعت'' کے لیے علماء کی ایک ایڈوائیزری کونسل بنائی۔ جس میں علامہ کو شامل کیا۔ مگر اس میں شامل ہو کر بھی علامہ اس کو چھوڑ جاتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ علامہ خود بیان کرتے ہیں جو آپ آگے ملاحظہ کریں گے۔

لیکن اس کونسل کو چھوڑنے سے پیشتر علامہ نے اتمام حجت کر دیا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد میں تمام مسالک کے علماء کا ایک اجلاس طلب کیا۔ جس میں علماء کے سامنے چند سوال رکھے گئے۔ داد و تحسین اور واہ واہ کے اس ماحول میں علامہ نے جو خطاب جنرل ضیاء الحق کی موجوگی میں کیا وہ نہ صرف علامہ کی جرات کا پتا دیتا ہے بلکہ نفاذِ شریعت کے لیے آپ کے اخلاص اور تڑپ کی بھی خبر سناتا ہے۔ اس خطاب میں سے میں چند اقتباسات آپ کی نذر کرتا ہوں اور پھر چند سوالات کروں گا اور آپ کو پتا چل جائے گا کہ علامہ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ کیوں نہ چل سکے۔ علامہ اپنی اس تقریر میں جنرل صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

عوام میں ایک بات پائی جاتی ہے کہ صدر صاحب نے شریعت کورٹ

بنانے کے لیے جب یہ فیصلہ کیا کہ شرعی عدالت بنائی جائے تو اس میں علماء کو رکھا جائے۔ لیکن جج صاحبان نے اس بات سے انکار کر دیا کہ ہم جو لوگ اتنی مدت تک قانون پڑھے ہوئے ہیں، ہم اپنے مقابل کسی مولوی کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جو تقریباً تمام پاکستان کے تمام پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہے اور

نہاں کے مانہ آں رازے کزو سازند محفلہا

اس طرح کی باتیں چھپی بھی نہیں رہتیں۔ اگر یہ بات غلط ہے تو اس کی تردید کی جائے۔ بہر حال اگر یہ بات قولاً نہیں ہوئی تو عملاً ضرور ہوئی ہے کہ شرعی عدالت بنی بھی اور اس میں کسی عالم دین کو رکھا بھی نہیں گیا۔ اس طرح کی دوری کو جب تک دور نہیں کیا جاتا۔ تب تک اس ملک میں اسلام کو مکمل طور پر اور صحیح طور پر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ [1]

یہ تھیں جناب جنرل صاحب کی شرعی عدالتیں کہ جس میں قاضی صاحبان وہ تھے جو شاید قرآن مجید کو بھی بنا ترجمے کے براہ راست سمجھ نہیں سکتے اور احادیث اور فقہ تو بعد کے معاملات تھے اور صاف دکھائی دے رہا تھا کہ شریعت کورٹ کے نام پر لیپا پوتی کی جا رہی تھی۔ بہت جلد یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ جب اس لولی لنگڑی شریعت کورٹ نے بھی سود کے خلاف فیصلہ دیا اور حکومت کو پابند کیا کہ مخصوص مدت میں سودی معاملات کو ختم کیا جائے تو جنرل صاحب کی حکومت خود اس کے خلاف اپیل لے کر سپریم کورٹ میں چلی گئی اور بر سبیل تذکرہ بعد میں اس کار خیر میں میاں نواز شریف کی حکومت نے بھی حصہ ڈالا۔ اسی طرح اس شرعی عدالت نے گھڑ دوڑ کو جوا قرار دیا۔ لیکن حکومت نے اپنی بنائی عدالت کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

[1] علامہ احسان الٰہی ظہیر، از قلم: جاوید جمال ڈسکوی (ص ۶۸)۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے مزید گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں آپ نے جتنے اقدامات یا اعلانات کیے ہیں، میں ان کو اعلانات ہی کہتا ہوں۔ مجھے معاف کیجیے کہ یہ اعلانات کو عملی جامہ پہنانے میں نہ جانے کیا رکاوٹیں ہیں جو اب تک درپیش رہیں۔" ❶

آپ اندازہ کیجیے کہ کس قدر جرات اور بہادری سے جنرل ضیاء الحق کے روبرو آپ نے کہہ دیا کہ جنرل نے جو اعلانات کیے تھے ان کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا اور عملی اقدامات کا فقدان تھا۔ اگر محض مخالفت برائے مخالفت ہوتی تو آپ جنرل کے ان اعلانات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تجاویز پیش نہ کرتے۔ علامہ شہید نے فرمایا:

"یہ ایک امر واقعہ ہے، اعلانات ہوئے ہیں ان پر عمل نہیں ہو سکا۔ اس سلسلہ میں میری دو مثبت تجویزیں ہیں ایک تجویز یہ ہے کہ پرانی عدالتوں کو یکسر ختم نہیں کیا جا سکتا تو میں کہتا ہوں کہ بالکل ختم نہ کریں۔ جج صاحبان کے جذبات بالکل مجروح نہیں کرنے چاہئیں، کیونکہ یہ کوئی مقابلے کی بات نہیں، کوئی مخالفت کی بات نہیں لیکن اگر مارشل لاء کیھا بطوں کے تحت فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں آ سکتا ہے اور اس پر کسی کو تکلیف نہیں ہوتی تو کیا سبب ہے کہ ایک ضابطے کے تحت سرور کائنات ﷺ کی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے ایک عدالت کا قیام عمل میں نہیں لایا جا سکتا؟ ❷

علامہ نے جنرل ضیاء الحق کی ہمت بندھانے کی خاطر مزید کہا:

"دوسری بات یہ ہے کہ رکاوٹوں کے سلسلہ میں، میں نے یہ بات عرض کی

---

❶ علامہ احسان الٰہی ظہیر از جاوید جمال ڈسکوی (ص ٦٩)۔
❷ علامہ احسان از جاوید جمال ڈسکوی (ص ٦٩)۔

تھی کہ اس کے لیے جرات رندانہ، رندانہ کا لفظ کہوں تو شاید مناسب نہ ہو، لیکن ذرا جرات مومنانہ کی ضرورت ہے۔ آپ قدم اٹھایئے اور پوری توانائی اور قوت کے ساتھ اٹھایئے، بصورت دیگر میں ادب سے عرض کرتا ہوں کہ نہ صرف آپ اور آپ کا اعلان مجروح ہوتا ہے، بلکہ لوگ اسلام کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ عام لوگ جو اسلام اس ملک میں نہیں چاہتے وہ یہ نہیں کہتے کہ اسلام کے ضابطے ابھی اس ملک میں نافذ نہیں ہوئے، وہ یہ کہتے ہیں کہ دیکھیے اسلام آ گیا ہے، پھر کیا ہو گیا ہے، چوریاں بڑھ گئی ہیں، زنا ہو رہے ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالتے کہ اسلام آ چکا ہے۔ دیکھو اسلام آنے کے بعد کیا جرائم میں کمی ہوئی ہے؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اسلام جب آتا ہے وہ اپنی برکات ساتھ لے کر آتا ہے، لوگوں کو ثمرات نظر آنے چاہئیں۔'' [1]

اس تمام تر گفتگو کے باوجود وہاں اجلاس کا ماحول کاسہ لیسی اور خوشامد والا ہی رہا تھا۔ بہت جلد علامہ کو اندازہ ہو گیا کہ جنرل اسلام کے نام کو صرف اپنی حکمرانی کی مدتکو طول دینے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ وگرنہ اسلامی قوانین کے نفاذ کا اس کا ارادہ قطعاً نہیں اور آپ جنرل ضیاء الحق کی اس ایڈوائزری کونسل سے الگ ہو گئے۔ قومی ڈائجسٹ لاہور کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ خود کہتے ہیں:

''میرا خیال تھا کہ وہ نفاذ اسلام کے لیے مخلص تھے۔ ویسے بہت زیادہ خوش فہمی نہیں تھی، تاہم بدگمانی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ابتدا میں دس بارہ علماء پر مشتمل ایک ایڈوائزری کونسل قائم کی تھی اور مجھے اس نام نہاد ایڈوائزری کونسل کا رکن نامزد کیا تھا۔ میں نے یورپ اور مشرق بعید کے ممالک کا

[1] علامہ احسان از جاوید جمال ڈسکوی (ص ۶۹)۔

دورہ بھی کیا مگر یہ دورہ میں نے اپنے اخراجات سے کیا تھا البتہ اسلامی ممالک کی سربراہی کونسل میں سرکاری خرچے پر ضرور گیا تھا۔ جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جنرل محمد ضیاء الحق نفاذ اسلام کے لیے مخلص نہیں ہیں تو میں نے ایڈوائزری کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ علماء میں سے میں واحد شخص تھا جس نے ایڈوائزری کونسل کو خود چھوڑا تھا، میرے ساتھ اس کونسل میں جو باقی لوگ تھے انہیں خود ایڈوائزری کونسل نے چھوڑا تھا۔ وہ اس سے آخر وقت تک چمٹے رہے تھے۔'' [1]

علامہ نے جنرل ضیاء الحق کی اس چند روزہ رفاقت کو چھوڑ کر اس کے شدید ناقد بن گئے۔ آپ کی تحریر و تقاریر میں جنرل کے لیے بہت تلخی ہوتی تھی۔ حیرت اس امر کی تھی کہ اہل حدیث میں بہت سے افراد جنرل کی اس دورخی کے باوجود اس کے حامی تھے۔ ابتدائے اقتدار سے انتہائے اقتدار تک حدود کے نام پر ایک زانی کو سزا نہ دی گئی۔ پیپلز پارٹی کے سیکڑوں کارکنان کو ٹکٹی پر باندھ کر سو سو کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ منظر یہ ہوتا تھا کہ ''مجرم'' کو ٹکٹی پر باندھا ہوتا اور جلاد دور سے دوڑتا ہوا آتا اور چمڑے کا بنا ہوا کوڑا پوری طاقت سے مارتا۔ یہ کون سا اسلام تھا۔ میں جنرل کے حامیوں سے صرف ایک سوال کرتا ہوں کہ حضور زیادہ نہیں صرف ایک! جی ہاں صرف ایک زانی یا شرابی کا نام بتائیے کہ جس کو دس برس میں کوڑے لگائے گئے ہوں۔ چھوڑیئے! حدود اور اسلام کے نام پر ایک ڈرامہ تھا۔ آپ کی سادگی کہ ''چلو اسلام کا نام تو لیتا ہے۔'' یہ جملہ کہہ کر اس کے ہر جرم کو آپ نے آنکھوں سے لگایا۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر ایک مومن کی فراست رکھتے تھے۔ اس لیے بہت جلد اس ڈرامے کی تہہ تک پہنچ گئے اور صرف آپ ہی نہیں آپ کی زندگی تک آپ کی ساری

[1] انٹرویوز، ص: ۷٦۔

جماعت اور علماء اہل حدیث اور عوام اہل حدیث سب جنرل ضیاء الحق کے شدید ناقد تھے۔

اس ضمن میں آخری بات کہ علامہ جس حوالے سے جنرل ضیاء الحق پر شدید تنقید کرتے تھے وہ سود کا معاملہ ہے۔ جنرل کی اپنی بنائی شرعی عدالت نے بھی سود کے خلاف فیصلہ دے دیا تو جنرل صاحب کی حکومت نے اپنی اس عدالت کے خلاف باقاعدہ سپریم کوٹ میں جا کر اپیل دائر کر دی اور اس فیصلے پر حکم امتناعی لے آئی۔ ان حالات میں ایک اسلام کا سپاہی کس طرح اپنے دماغ اور ضمیر کو رہن رکھ کر جنرل ضیاء الحق کی حمایت کرسکتا تھا۔ بہت سے دلائل سے صرف نظر کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

جنرل نے اپنی اس مخالفت کی علامہ کو بھرپور سزا دی جو شہادت پر منتج ہوئی۔ گورنر غلام جیلانی کے دور میں علامہ کی جائیداد کی قرقی تک کے احکامات جاری ہوئے۔ علامہ کہتے ہیں:

> ''چونکہ جنرل ضیاء الحق کو جمعیت اہل حدیث جیسی سرگرم جماعت میں میری موجودگی اور میری مخالفت کھٹکتی تھی، اس لیے انہوں نے جمعیت اہل حدیث سے نکالے گئے افراد کی سرپرستی شروع کر دی ان کو ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے مراعات دی گئیں،نوازا گیا مگر جنرل ضیاء الحق کے ایماء پر جمعیت اہل حدیث کی شیرازہ بندی کو سبوتاژ کرنے والوں کا جو حشر ہوا اس سے ہمارا یہ عقیدہ مزید پختہ ہو گیا کہ جدوجہد کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔
>
> جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے میرے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے، میری جائیداد کی قرقی کے احکامات جاری ہوئے، مجھے انکم ٹیکس کے مقدمات میں الجھایا گیا مگر بحمد اللہ میں ثابت قدم رہا۔'' [1]

حتی کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ.

---

[1] علامہ احسان الٰہی ظہیر کے انٹرویوز (ص ۷۸)۔

ہمارا راستہ ابتلاؤں کا راستہ ہے

ہمارے ساتھ وہ نکلے جو رب کی چوکھٹ پہ دل و جان نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ہم لوگوں کو جھوٹ نہیں بتلاتے۔ ہم کھیر کھلانے کے لیے نہیں لے جائیں گے، ہم ختم پڑھانے کے لیے نہیں لے جائیں گے جس نے جانا ہے وہ اوروں کے ساتھ چلا جائے۔ ہم نہ ٹل چومنے والے، نہ ہاتھ چومنے والے ہیں ہمارے ساتھ جس نے چلنا ہے علی وجہ البصیرت چلے۔

ہمارا راستہ دو طرف جاتا ہے منزل ایک ہے۔ یا سر بلند رکھ کے غازی بن کے جیو یا سر کٹا کے شہید بن کے مرو۔

جلسہ ہائے عام

جمعیت اہل حدیث پاکستان نے ملک کے طول وعرض میں جلسے کرنے کا پروگرام بنالیا۔اس سلسلے میں 18 اپریل 1986ء کو موچی دروازے میں پہلے جلسہ عام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سے پہلے چند ماہ کے دوران موچی دروازے میں ایم آر ڈی، جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان جلسے کر چکی تھیں۔ بلاشبہ علامہ بہت بڑے خطیب تھے،صف اول کے لیڈر تھے لیکن ان کی نوزائیدہ جماعت نسبتاً چھوٹی سمجھی جاتی تھی، جبکہ ایم آر ڈی تو کئی جماعتوں کا اتحاد بھی تھا۔اس لیے علامہ کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا کہ تین بڑے جلسوں کے بعد کامیاب جلسہ کرنا ہوگا اور مزید یہ کہ یہ اس جماعت کی سیاسی زندگی کا پہلا بڑا جلسہ تھا۔ جلسے کی تیاریاں بڑے اہتمام اور زور وشور سے جاری تھیں۔ نامور خطاط عبدالرشید قمر نے بہت خوبصورت اشتہار کتابت کیے کہ ''اشتہار بازی'' کا فن ان پر ختم تھا۔ایک روز میں جمعیت کے دفتر میں موجود تھا کہ ''انصار السنۃ المحمدیہ'' کے مدیر مولانا عطاء اللہ ثاقب مرحوم اپنی گاڑی پر تشریف لائے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بہت نفیس اور اعلیٰ ذوق کے مالک تھے۔سید نفیس رقم کے شاگرد جمیل حسن کی خطاطی میں طبع شدہ کتنے ہزار اشتہار اپنی طرف سے چھپوا کر دے

گئے۔ ہر کوئی اپنی جگہ محنت کر رہا تھا۔ لاہور میں بہت زیادہ اشتہار لگے ہوئے تھے۔ ''جدھر دیکھتا ہوں تو ہی تو ہے'' والا منظر تھا۔ ان دنوں میرے کالج کے سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ لیکن یہ جو امتحان پڑا تھا کہ

فکرِ دل و جاں میں، فغاں بھول گئی تھی

اس نے سارے امتحان بھلا دیئے۔ آج لکھتے ہوئے ہنسی آ رہی ہے کہ بھلا جلسے کا سارا بوجھ کیا ہم نے اٹھایا ہوا تھا؟۔ ایک روز زیادہ ہی مصروف دیکھ کر علامہ بھی ڈانٹنے کے انداز میں بولے ''اوئے ذرا پڑھائی کی طرف بھی دھیان دیا کرو، سارا وقت جماعت کے کاموں میں گزار رہے ہو۔'' یہ ان کی شفقت تھی کہ نظر میں رکھتے تھے اور لطیفہ یہ ہوا کہ جس روز جلسہ ہوا، اس سے اگلے روز میرا پیپر تھا۔ میں جلسہ ختم ہوتے ہی گھر گیا۔ جلدی سے کتاب پکڑ لی کہ جیسے ہم سے زیادہ پڑھا کو چشمِ کائنات نے دیکھا ہی نہیں۔ ایک دم خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی کہ صبح کا ہے کا پرچہ ہے۔ میں نے تاریخ کی کتاب پکڑی ہوئی تھی۔ جب دیکھا تو ''ڈیٹ شیٹ'' میرا منہ چڑا رہی تھی۔ تاریخ کا پیپر جلسے کے دنوں کی نذر ہو چکا تھا اور ہم

میں رانجھا رانجھا کر دی آپے رانجھا ہوئی

کی تصویر بنے، جلسہ جلسہ کرتے رہے۔

خیر اگلے روز کالج پہنچے۔ کالج کی سیاست میں بھی ذرا عمل دخل تو تھا۔ استاد کچھ والد محترم کی وجہ سے بھی لحاظ کرتے تھے۔ ایک گونہ امید بھی تھی۔ صدر شعبہ تاریخ محترم پروفیسر شیخ رفیق احمد کے پاس پہنچا۔ عرض احوال کی۔ مسکرانے لگے اور فرمایا ''پتر ہور سیاستاں کر، انج تے ہونا ای سی۔'' کہنے لگے بولو اب کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا ''یہ شفقت بھی فرمایئے کہ میرے والدِ محترم کو بھی خبر نہ ہونے پائے۔'' ہنسنے لگے اور کہا میرے کمرے میں بیٹھو اور پیپر دو۔

واپس موچی دروازے چلتے ہیں۔ 18 اپریل 1986ء کو موچی دروازے کا میدان انسانوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ ہم دوست مل کر پہلے علامہ کے گھر اور پھر لارنس روڈ مرکز چلے گئے کہ علامہ کے ساتھ ہی جلسہ گاہ میں پہنچیں گے۔ بس مناسب سا قافلہ علامہ کے ساتھ تھا لیکن جوں جوں موچی دروازے کے قریب آ رہے تھے، احساس ہو رہا تھا کہ آج کچھ مختلف دن ہے۔ علامہ کے فکرمند چہرے کے رنگ کھلنا شروع ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ جب سٹیج پر پہنچے تو اندازہ ہوا کہ میدان تو بھرنے کو ہے۔ سٹیج تو موچی دروازے میں مدت پہلے کا بنا ہوا تھا جس کو ساری جماعتیں جلسے کے لیے استعمال کرتی تھیں یہ میدان کے مغربی سرے پر واقع تھا۔ تقریباً دس، بارہ فٹ بلند بڑا سا چبوترہ تھا اور سامنے لمبائی میں پھیلا میدان اور دائیں بائیں بیٹھنے کے لیے سیڑھیاں۔ اکثر جماعتیں اہتمام کرتیں کہ سیڑھیوں کے آگے رکاوٹیں لگا دی جائیں تاکہ لوگ سیڑھیوں پر نہ بیٹھیں کہ سیاسی کارکنوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اس میدان کی سیڑھیاں بھرنے کے لیے ہزارہا بندے چاہئیں۔ مزید یہ احتیاط بھی کی جاتی تھی کہ میدان میں کرسیاں لگا دی جاتی تھیں۔ لیکن اب کے ایسا کوئی اہتمام نہ تھا کہ ؏

جو آئے آئے ، ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

آج دل بھی کشادہ تھا اور گھر کا صحن بھی۔ اوپر سے گرمی بھی ایسی کہ ''بس آج ہی ہے۔''

خطبہ جمعہ امیر جمعیت مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ نے شروع کر دیا تھا۔ میں بھی سٹیج پر تھا۔ نماز کے دوران میرے آگے خواجہ محمد طفیل مرحوم بیٹھے تھے اور علامہ ان کے دائیں ہاتھ۔ سلام پھیرتے ہی خواجہ محمد طفیل نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بے اختیار کہا ''علامہ صاحب پیچھے تو دیکھیں'' علامہ نے پیچھے نگاہ کی۔ تاحد نگاہ لوگ تھے۔ موچی دروازے کے میدان کے نصف میں لوہے کا چار فٹ بلند جنگلہ لگا کر اس کو تقسیم کیا گیا تھا۔ عموماً جو جلسے ہوتے تھے اسی جنگلے تک پنڈال بنایا جاتا اور اس کو بھر لینا ہی

کامیابی سمجھا جاتا اور میدان کا تقریباً ساٹھ فیصد حصہ خالی اور الگ رہ جاتا۔ اس حد بندی کی وجہ سے بہت سی جماعتوں کا بھرم رہ جاتا۔ لیکن آج نہ جانے کہاں سے لوگ آ گئے تھے کہ یہ عقبی حصہ بھی بھر چکا تھا اور اس کے بعد باہر سڑک پر بھی لوگ صفیں باندھے کھڑے تھے۔ بلاشبہ یہ اہل حدیث کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع تھا اور میں اس پر دلائل دے سکتا ہوں کہ اس کے بعد آج تک اتنا بڑا اجتماع نہیں ہو سکا۔ حالانکہ وسائل اور افرادی قوت اب کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ علامہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر تشکر اور حیرت در آئی۔ ان کے لیے یہ منظر قطعی غیر متوقع تھا۔ آج ایم آر ڈی کا جلسہ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی جلسی لگ رہا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ ''لبرل فاشسٹ'' آج کی طرح اس دور میں بھی ''ضعف بصارت'' اور بصیرت کا شکار تھے۔ ان کو یہ منظر کہاں نظر آنا تھا جیسا کہ نذیر ناجی نے ایم آر ڈی کے جلسے پر کالم لکھا تھا۔ اس میں جلے بھنے سارا کالم ہی علامہ پہ لکھ دیا کہ ''اب علامہ کے لیے ایم آر ڈی کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوگا'' اور یہ کہ ''اتنے بڑے جلسے علامہ کے منہ کو لگ گئے ہیں۔'' علامہ نے دوسرے جلسے کے بعد ہی ایم آر ڈی کو ٹھوکر مار دی اور اس سے کئی گنا بڑا جلسہ اپنی جماعت کا کر کے دکھا دیا۔ لیکن شرمندہ ہونا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

واپس چلیے! نماز جمعہ کے بعد باقاعدہ جلسے کا آغاز ہوا۔ خطابات شروع ہوئے۔ اہل حدیث یوتھ فورس کے صدر محمد خان نجیب شہید رحمہ اللہ اور ان کے بعد سیکرٹری جنرل قاضی عبدالقدیر خاموش نے خطاب کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی کے خطاب کے بعد علامہ احسان الٰہی ظہیر تقریر کے لیے تشریف لائے۔ کارکنان نعرے بازی کر رہے تھے اور زیادہ ہی جذباتی ہو رہے تھے بلکہ نعروں کی کثرت سے علامہ کی تقریر بھی متاثر ہوئی۔ گرمی کی انتہا ہو چلی تھی اور دن بھی ڈھل رہا تھا کہ علامہ ڈائس پر آئے۔

اس روز کی ایک بات اور بھی یاد آئی ہے کہ (جماعت الدعوۃ کے امیر) حافظ محمد سعید سٹیج پر آئے۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو ان دنوں حافظ محمد سعید تقویۃ الاسلام مسجد شیش محل روڈ میں جمعہ پڑھاتے تھے اور اپنے مخصوص نظریات کے حوالے سے متحرک رہتے تھے۔ جمہوریت اور اپنوں کے حوالے سے ان کے نظریات منفرد بھی تھے اور شدید تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علامہ کی شہادت کے بعد جہاد کی بنیادوں پر جب انہوں نے اپنی الگ ''جماعت'' تشکیل دی تو نظریات کی یہ شدت وہاں بھی در آئی۔ جمہوریت پر کفر کے فتوے اور جمہوری نشانیاں یعنی جلسے، جلوس، ریلیاں، نعرے بازی، احتجاجی سیاست تصویر سازی، ویڈیو کے حوالے سے ان کی جماعت اور ان کے کارکنان شدت پسندی کی انتہا پر چلتے رہے لیکن وقت بہت بڑا استاد ہے۔

اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ حافظ صاحب اور ان کی جماعت اب ہمارے جیسے ہی ''اہل حدیث'' ہیں۔ ہمیں ان سے محبت ہے اور حافظ صاحب ہمیں یاد رکھتے ہیں اور ہم بھی ان کی طاقت کے مظاہر دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ چلیں ہیں تو ہمارے ہی بھائی۔ کوئی غیر تو نہیں۔

ذکر چل رہا تھا کہ حافظ محمد سعید علامہ کے پاس آئے اور کہنے لگے ''علامہ صاحب اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں میاں فضل حق صاحب کو لے آؤں۔'' علامہ نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا اور کہا ''جایئے لے آئیں۔'' حافظ محمد سعید انہیں لینے چلے گئے لیکن واپس نہ آئے۔ میاں صاحب نے کہاں آنا تھا۔ یہ تو حافظ محمد سعید کا خلوص تھا اور اتنا بڑا مجمع دیکھ کر جذباتی سے ہو گئے تھے کہ آج ناراض ہونے والوں کو منا لینے کا وقت ہے۔ لیکن سیاست کی اپنی غلام گردشیں ہوتی ہیں، جس کی اپنی الگ کہانیاں ہوتی ہیں۔ جہاں جذبات نہیں دیکھے جاتے بلکہ کچھ اور کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ حافظ سعید صاحب سے زیادہ اب ان معاملات کو اور کون جانتا ہے۔

جلسہ گاہ میں علامہ کی آمد پر پرجوش استقبال ہو رہا تھا۔ اس روز نظر آ رہا تھا کہ دلوں کے حکمران کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ علامہ شہید نے خطاب شروع کیا۔ آج بھی جب کبھی یہ تقریر سننے کا موقع ملتا ہے تو وہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ ہم، جس کا حصہ تھے۔ ایک جملہ ان کا مجھے بہت پسند آیا۔ گاہے میں اسے دہراتا رہتا ہوں کہ

> ''راتوں کو اذانیں دینے کے لیے ہم تھے۔ پکی ہوئی فصلیں کاٹنے کے لیے بہت آجاتے ہیں۔''

اگرچہ یہ جملہ اس دور کے سیاسی حالات کے پیش نظر تھا۔ لیکن جماعتی حالات پر اب بھی منطبق ہوتا ہے۔ کہ علامہ شہید نے اپنی جان اور مال کی قربانی دے کر جماعت کو حریت فکر کی جس راہ پر ڈالا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ان کے بعد پکی ہوئی فصلیں لوگوں نے خوب کاٹیں بلکہ اب تک کاٹتے آ رہے ہیں اور ڈھٹائی کی انتہا کہ مانتے بھی نہیں۔

علامہ کے اتنے بڑے جلسے نے تجزیہ نگاروں کو حیران کر دیا۔ یاد رہے کہ اسی روز شارجہ میں پاکستان اور ہندوستان کا وہ مشہور زمانہ کرکٹ میچ بھی تھا جس میں آخری گیند پر جاوید میاں داد نے چھکا لگایا تھا۔ اسی میچ کی وجہ سے غیر اہل حدیث لاہوریے جو سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے، کم تعداد میں آئے تھے۔ البتہ جب میچ فتح ہوا تو اندرون شہر کے لوگ بڑی تعداد میں علامہ کی تقریر سننے موچی دروازے کی طرف چلے آ رہے تھے۔ لیکن جب ان کو پتہ چلتا کہ جلسہ ختم ہو گیا ہے تو کفِ افسوس ملتے واپس ہو جاتے۔

علامہ کی تقریر جاری تھی کہ پنڈال میں سے ایک نامعلوم آدمی کھڑا ہوا اور اس نے بلند آواز سے شعر پڑھا۔ اگر کسی کو معلوم ہو کہ وہ کون شخص تھا، تو ضرور آگاہ کرے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اس کا انداز ایسا بے ساختہ تھا کہ علامہ بھی

خاموش ہو گئے اور لوگ بھی خاموش ہو گئے۔ سٹیج سے بہت فاصلے پر کھڑا یہ شخص خاصا بلند آہنگ تھا۔ کہ آج بھی آپ علامہ کی تقریر کی یہ ریکارڈنگ سنیں تو اس میں اِس شعر کا ایک ایک لفظ صاف سنائی دیتا ہے۔ شعر کچھ یوں تھا ۔

بیچا نہیں تو نے، اپنا ضمیر، اے ظہیر
تو خوش نصیب قائد، وہ بدنصیب سارے

ہر طرف واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور علامہ نے پھر اپنی گفتگو شروع کر دی۔

جلسہ عام شیخو پورہ

موچی دروازے کے جلسہ عام کی کامیابی کے بعد علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید نے مزید جلسے کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے میں اگلا جلسہ شیخوپورہ کے کمپنی باغ میں رکھا گیا۔ جون کا آخری عشرہ سال کے گرم ترین دنوں میں شمار ہوتا ہے اور علامہ شہید نے جلسے کے لیے انہی دنوں کا انتخاب کیا۔ شاید علامہ اپنی جماعت کی قوت برداشت کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ یہ لوگ ان کے ساتھ کس حد تک چل سکتے ہیں۔ علامہ شہید کے جاں نثار کارکنان اس امتحان میں کامیاب رہے۔ کمپنی باغ اپنی وسعت کے باوجود تنگی داماں کا شکوہ کر رہا تھا۔ نہ جانے اتنے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ جنہیں موسم کی پروانہ تیز دھوپ کا ڈر۔ ناصر کاظمی کا شعر کس قدر حسب حال ہے ۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیال یار کی چادر ہی لے چلیں

علامہ کی محبت کی چادر شاید سب نے اپنے سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ ہم بھی لاہور سے اس جلسے میں شرکت کے لیے گئے۔ ویسے بھی شیخوپورہ میری محبت کا مرکز ہے کہ میرے آبا واجداد یہیں کے ہیں۔ شیخوپورہ سے گوجرانوالہ روڈ پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر کوٹ رنجیت سنگھ واقع ہے۔ جہاں میرے والد محترم پیدا ہوئے۔ یہیں سے نکل کر وہ جامعہ

سلفیہ پڑھنے گئے اور بعد میں لاہور قیام پذیر ہوئے۔ اس لیے شیخوپورہ مجھے ایسے ہی محبوب ہے جیسے لاہور۔ اس روز میرے بھائی عمر فاروق قدوسی ایک کیمرہ خرید کر ساتھ لائے تھے۔ علامہ کی آمد اور استقبال کی تصاویر اتار رہے تھے ان میں سے ایک تصویر کہ جس میں علامہ پر گلاب کے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی، بعد میں خاصی مقبول ہوئی۔ میرے والد بھی سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ شدید گرمی میں عمدہ انتظامات حافظ محمد عبداللہ شیخوپوری رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ حسب معمول سارے مقررین نے تقریر کی اور آخر میں علامہ کی باری آئی تو تاخیر ہو چکی تھی۔

علامہ نے میر کا یہ شعر پڑھتے ہوئے تقریر کا آغاز کیا۔

مجھ تک کب، ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

عمدہ تقریر تھی۔ اس جلسے میں سب سے پہلے یہ نعرہ لگایا گیا:

جب تک سورج چاند رہے گا، علامہ تیرا نام رہے گا

بعد میں ہمارے بعض ''مفتی'' حضرات اس پر فتوے لگاتے پھرے کہ یہ نعرہ لگانا جائز نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ سیدھی سادی دعا ہے کہ علامہ کا نام قیامت تک رہے نہ جانے اس میں ناجائز پہلو کیا تھا۔ اصل مسئلہ اس نعرے کے جائز ناجائز ہونے کا نہیں، بات تو اس منفی سوچ کی ہے جو شریعت مقدسہ کی آڑ میں حرکت میں آتی ہے۔

یہ جلسہ حاضری کے اعتبار سے اتنا بڑا تھا کہ اُس ہفتے کے روزنامہ جنگ کے سیاسی ایڈیشن میں یہ تجزیہ کیا گیا کہ جمعیت علمائے پاکستان نورانی گروپ، جماعت اسلامی، اور ایم آر ڈی نے لاہور میں جلسے کیے، مگر علامہ احسان الٰہی ظہیر نے ایک چھوٹے شہر میں اس سے بڑا جلسہ کر دکھایا۔

جلسہ عام گوجرانوالہ

گوجرانوالہ کے شیرانوالہ باغ میں جلسہ عام کا انعقاد کیا گیا۔ تب موسم نسبتاً سرد ہو چلا تھا۔ شاید علامہ نے گوجرانوالہ کے لوگوں کا امتحان نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بھی ایک بڑا جلسہ تھا۔ یہاں بھی خطبہ جمعہ مولانا محمد عبداللہ نے ارشاد فرمایا جو کہ جمعیت اہل حدیث پاکستان کے امیر تھے اور گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ مولانا جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث تھے۔ نہایت سمجھ دار اور زیرک انسان تھے۔ 14اگست 1985ء کو جب مولانا حبیب الرحمان یزدانی پر قاتلانہ حملہ ہوا تب علامہ شہید پاکستان سے باہر تھے۔ جمعیت کے احتجاجی لائحہ عمل کے حوالے سے میرے والد نے مولانا کے نام خط لکھا اور مجھے وہ خط دے کر مولانا کے پاس گوجرانوالہ بھیجا۔ وہ نہایت شفقت سے پیش آئے یہ یاد نہیں کہ میرے ساتھ کون گیا تھا۔ کیونکہ میرے والد محترم نے مجھے اکیلے نہیں بھیجا تھا۔ ذکر تھا مولانا کے خطبہ جمعہ کا۔ مولانا نے نہایت عمدہ طریقے سے جمعیت کی سیاسی پالیسی پر روشنی ڈالی اور ضیاء الحق حکومت پر شدید تنقید کی۔ ان کی تقریر کا خاص ہدف ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کی پالیسی تھی۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ علامہ کی شہادت کے بعد جماعت کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے انٹرویو دیا کہ ضیاء الحق کے بارے میں علامہ کی پالیسی سراسر ذاتی تھی اور ان کی جنرل ضیاء کی مخالفت کا جماعت کی پالیسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ بیان غلط بیانی پر مبنی تھا۔ ممکن ہے کہ موصوف کے ذاتی نظریات ایسے ہی رہے ہوں گے۔ اور یہ خالصتاً ان کا حق ہے کہ وہ جو چاہے نظریات اختیار کریں لیکن علامہ کی زندگی میں ''موصوف'' نے اپنے نظریات مکمل طور پر چھپائے رکھے اور جماعت کی پالیسی کے مطابق جلسہ ہائے عام میں شرکت کرتے رہے۔ ضیاء الحق پر تنقید بھی کرتے رہے۔ اصولی طور پر ان کو اس وقت جرأت سے کام لے کر علامہ سے اختلاف کرنا چاہیے تھا یا جماعت سے الگ ہو

جانا چاہیے تھا۔ اس پر مزید تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کہ موصوف تنقید کرنا تو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا تنقید کرے تو ''بالواسطہ'' ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔

جلسہ عام راولپنڈی

راولپنڈی میں جلسہ کرنا اتنا آسان نہیں تھا کہ یہاں اہلحدیث خاصے کم تھے۔ اب تو ماشاء اللہ حالات کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ لیکن ملک کے دارالحکومت سے متصل شہر جو کسی حد تک دارالحکومت کا حصہ ہی شمار ہوتا ہے، وہاں جلسہ کرنا اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا سیاسی جماعتیں ضروری خیال کرتی ہیں۔ سو علامہ نے بھی، لیاقت باغ راولپنڈی میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ لاہور سے بھی چند بسوں کا قافلہ جلسے میں شرکت کے لیے گیا۔ میں اپنے والد محترم کے ساتھ الگ سے گیا۔ علامہ ایک روز پہلے ہی راولپنڈی جا چکے تھے۔ جلسے کا وقت آیا۔ خالی پنڈال بھرتا گیا، حتیٰ کہ لیاقت باغ لاہور کے موچی دروازے کا منظر پیش کرنے لگا۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ لوگ گرمی سے گھبرائے ہوئے تھے۔ ایک صاحب تقریر کرنے آئے، لوگ تقریر چھوڑ کر پنڈال کے گرد درختوں کے نیچے چلے گئے۔ پنڈال ایک بار تو خالی خالی سا ہو گیا۔ علامہ نے سٹیج پر لگے ہوئے شامیانے ہٹوا دیے اور خود بھی دھوپ میں بیٹھ گئے۔ لوگ واپس آنا شروع ہو گئے۔ جب علامہ کی تقریر کا وقت ہوا تو پنڈال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔

علامہ آئے اور ضیاء الحق کو مخاطب کر کے یہ مصرع پڑھا ؎

گھر لے لیا ہے، تیرے گھر کے سامنے

یہ مصرع ادا کرنا تھا کہ لوگ جوش سے بے قابو ہو گئے۔ میں حیران ہوں تب لوگوں کا ادبی ذوق بھی شاید بلند ہوتا تھا۔ اب تو عجیب ہی حال ہو گیا۔ خطابت کا حسن بھی گیا اور سننے کا ذوق بھی گیا۔

جلسہ عام سیالکوٹ، ساہیوال، اوکاڑہ

موضوع کو مختصر کرتے ہوئے ذکر کرتا ہوں کہ اس جلسہ ہائے عام کے سلسلے میں علامہ نے سیالکوٹ، ساہیوال اور اوکاڑہ میں بھی جلسے کیے۔ سیالکوٹ کے چوک شہیداں میں بہت بڑا جلسہ کیا۔ سیالکوٹ علامہ کا آبائی شہر تھا۔ یہاں ان کے خاندان کے کتنے ہی گھرانے آباد ہیں۔ خاصا پر جوش جلسہ تھا۔ ساہیوال کا جلسہ البتہ بہت زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔ علامہ پاکستان سے باہر تھے اور ساہیوال کی جماعت نے علامہ کو خاصا مطمئن کر دیا کہ آپ فکر نہ کریں لیکن جب جلسہ ہوا تو جمعیت کے کارکنان بھی بہت پریشان ہوئے اور علامہ بھی آزردہ۔ حقیقتاً جلسے کے لیے محنت ہی نہیں کی گئی تھی کچھ یہ بھی تھا کہ جلسے کی رات اور دن بہت زیادہ بارش بھی ہو گئی۔

اوکاڑہ میں باقاعدہ جلسہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس جلسے کا پس منظر یہ تھا کہ علامہ کے ایک مخالف مولانا معین الدین لکھوی رحمہ اللہ اس شہر میں رہتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ وہاں زیادہ تھا۔ جناب محمد حسین ظاہری نے وہاں جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ علامہ سے وقت لیا اور گول چوک میں جلسہ رکھ لیا۔ علامہ کے مخالفین کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ ان کے گھر میں احسان الٰہی ظہیر کا جلسہ ہونے جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی سی کوشش کی، کہ جلسہ نہ ہو سکے۔ مگر ناکام رہے۔ ماحول میں خاصی تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میرے والد بھی جلسے میں گئے ہم بھی ساتھ ہو لیے۔ اوکاڑہ کے لوگ علامہ کے لیے ترسے ہوئے تھے۔ سو کھل کر برسے یعنی جلسے میں آئے۔ حد نگاہ تک لوگ ہی لوگ تھے۔ محض حاضری نہ تھی، جذبات کا امڈتا ہوا طوفان تھا۔ علامہ مدت بعد اوکاڑے گئے تھے۔ سو آپ کے چاہنے والوں نے آپ کی راہوں میں آنکھیں بچھا دیں۔ یہ جلسہ اتنا بڑا تھا کہ علامہ نے اوکاڑہ میں باضابطہ جلسہ عام کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور جب کبھی کسی تقریر میں جلسہ ہائے عام کا ذکر کرتے تو اس کو بھی شمار کرتے۔

جلسہ عام قصور

قصور کا جلسہ عام اس سلسلے کا آخری جلسہ ثابت ہوا کہ اس کے تھوڑے عرصے بعد علامہ کا واقعہ شہادت پیش آ گیا۔ حسب معمول بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس جلسے کی ایک بہت خوبصورت تصویر میرے پاس محفوظ ہے۔ اس جلسے کی خاص بات علامہ کی تقریر کا یہ حصہ تھا جو بہت مقبول ہوا۔ علامہ نے فرمایا: ''کبھی یاد کیا کرو گے۔ جب ہم نہیں ہوں گے۔'' علامہ کی شہادت کے بعد استاد عبدالرشید قمر نے اس اقتباس کی بہت خوبصورت کتابت کی اور عمدہ کاغذ پر اس کو شائع کیا۔ جو لوگوں نے بہت پسند کیا اور ابھی بھی کئی بار کسی نہ کسی کے ڈرائنگ روم میں دیوار کی زینت بنا نظر آ جاتا ہے۔ کیا الہامی الفاظ تھے جو اللہ نے علامہ کی زبان سے ادا کروا دیے اور کیسے حقیقت پر مبنی تھے۔

ایک لطیفہ

علامہ کی عادت تھی کہ جلسہ عام کے بعد اپنے کارکنان کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ جلسے کے حوالے سے ان کے کیے گئے انتظامات پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اور کمزوریوں پر راہنمائی کرتے۔ مولانا فضل الرحمان امیر جمعیت علمائے اسلام نے ایسے ہی تو نہیں کہہ دیا تھا، جب حافظ ابتسام الٰہی ظہیر ان سے ملنے اسلام آباد گئے۔ کہ ''یار ہمیں تو جلسوں میں کرسیاں سیدھی کرنا بھی علامہ نے سکھایا ہے۔'' اس روز بھی علامہ حسب معمول جلسے سے فارغ ہو کر اس جگہ تشریف لے گئے جہاں ان کی نشست کا انتظام تھا۔ سارے احباب جمع تھے کہ ایک مولانا صاحب کہنے لگے علامہ صاحب آج آپ کی تقریر کے بعد سب سے اعلیٰ تقریر میری ہوئی ہے۔ اس پر علامہ بے ساختہ بولے ''یار میرا بھی تکلف ہی کیا ہے آپ نے'' بے ساختہ محفل میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور ساری مجلس علامہ کے ذوقِ مزاح کے رنگ میں رنگ گئی۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ کا ایک خواب

ایک اجتماع ایک پلان ❶

اپنی نوعیت کا منفرد اجتماع جو پہلا بھی تھا اور وہی پھر آخری بھی ثابت ہوا۔
علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کا ایک ایمان افروز خواب جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

18 مارچ 1987ء شہید ملت کو علامہ احسان الٰہی ظہیر نے اپنی قیام گاہ پر اپنی ذاتی حیثیت سے علماء اہل حدیث کا ایک اجلاس طلب کیا، جو ان کی زندگی کا بھی اور فی نفسہٖ

---

❶ 18 مارچ 1987ء کو علامہ شہید نے اپنی رہائش گاہ 475 شادمان کالونی میں ملک بھر سے اہل حدیث علماء کا ایک اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس علامہ نے ذاتی حیثیت میں طلب کیا تھا۔ مدت سے علامہ کا خواب تھا کہ اہل حدیث جماعت اپنی علمی وراثت کو دوبارہ سنبھالے اور امت کی فکری راہنمائی کا کردار ادا کرے۔ اسی مقصد کے لیے علامہ کے ذہن میں باقاعدہ ایک منصوبہ تھا۔ اسی کی تکمیل کے لیے ملک بھر سے علما اور شیوخ الحدیث کو دعوت دی گئی۔ اللہ کی مرضی کہ اس اجلاس کے ٹھیک چھٹے روز جلسے میں علامہ زخمی ہوئے اور ہفتے بھر میں اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ اس اجلاس کی تفصیلی روداد مولانا عبدالرحمان خلیق نے علامہ کی شہادت کے بعد قلم بند کی جو ماہنامہ ترجمان الحدیث کا...... میں شائع ہوئی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے بہت تھوڑے سے اختصار کے ساتھ شامل کتاب کر دیا ہے۔

خود بھی اپنی نوعیت کا منفرد اجلاس ہی تھا۔ علامہ مرحوم نے اس اجلاس میں جماعت اہل حدیث کے تشخص کو مزید بڑھانے اور دین حق کی اصل ہونے کی حیثیت سے مسلک اہلحدیث کے منفرد اور مستحکم مقام کو مزید نمایاں کرنے کے لیے جو پلان پیش کیا وہ بھی ایک منفرد پلان ہی تھا۔

اور پھر اس اجلاس کے فیصلوں کو جس المنا کی کا شکار ہو جانا پڑا، وہ بھی کاتب تقدیر کے حیرت ناک فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ہی تھا اور بقول غالب ؎

حریف جوششِ دریا نہیں خودداریؔ سال
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعوئ ہوشیاری کا

علامہ مرحوم کا خط

یہ اجتماع اگر اپنے طے کردہ منصوبے کے خاکہ میں رنگ بھرنے کی مہلت پاتا تو یہ نہایت درجہ انقلابی کارنامہ ہوتا اور علامہ مرحوم اگر اس بیل کو منڈھے چڑھا پاتے تو وہ مسلک اہل حدیث پر ایک عظیم احسان کر جاتے۔ اس اجلاس کی اہمیت اور اس میں تشکیل پانے والے عزائم کی آفاقیت کا اندازہ کرنے کے لیے آپ پہلے حضرت علامہ مرحوم کا وہ خط ایک نظر ملاحظہ فرما لیجیے جو انہوں نے اپنے دستخطوں سے جماعت کے اہل علم حضرات کے نام تحریر کیا تھا۔ علامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”بڑی مدت سے مرے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی ہے کہ درپیش مسائل پر دنیا کے ہر بڑے علمی مرکز اور ہر بڑی علمی اور دینی جماعت کی مجالس فکر ونظر میں بحث وتمحیص ہوتی ہے اور ان کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اپنے اجتہاد اور مسلکی موقف کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اس طرح کی کوئی چیز دیکھنے میں نہیں آتی۔

اور خاص طور پر اہل حدیث ایسی مسلکِ حق پر گامزن جماعت اس بارے میں ہنوز غفلت اور لاپرواہی کا شکار چلی آ رہی ہے جبکہ مسئلہ اجتہاد کے پرجوش حامی اور موید ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عوام بالخصوص اور دوسرے مسلمانوں کے لیے بالعموم کتاب وسنت کی روشنی میں صرف وہی مسلک لوگوں کو متاثر کرے گا اور اپنے ساتھ لے کر چل سکے گا جو درپیش مسائل میں صحیح طور پر ان کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکے۔

میرے ذہن میں اس وقت ایسے مسائل کی ایک لمبی فہرست ہے جن کے بارے میں لوگ جاننے کے متمنی ہیں اور ابھی تک کسی قابل ذکر ادارے اور جماعت کی طرف سے ان کی راہنمائی نہیں ہو سکی اور بالخصوص کسی ایک بھی اہل حدیث کی طرف سے ان پر لب کشائی نہیں ہوئی۔

میں نے اس سلسلے میں بڑی سوچ بچار کے بعد آپ سے راہنمائی کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملک میں موجود جید اور ثقہ علمائے اہل حدیث کو خالصتاً ایک علمی اجتماع میں شرکت کی دعوت دوں تاکہ باہم مشورے سے کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکے اور دین اسلام اور اس کے مسلک حق کی صحیح خدمت کرتے ہوئے لوگوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی دی جا سکے۔ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس سلسلے کے پہلے انتہائی اہم اجتماع بتاریخ ۱۸ مارچ (1987ء) بوقت گیارہ بجے صبح میری رہائش گاہ واقع ۴۷۵ شادمان کالونی لاہور میں ضرور شرکت فرما کر اپنی مسلکی دینی غیرت وحمیت کا ثبوت بہم پہنچائیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اس بارے میں اپنی تمام مصروفیات اور مشغولیت کو بالائے طاق رکھ کر ابھی سے اس میں تشریف آوری کے لیے پروگرام طے

کر لیں گے۔ میں آپ کے جواب کا شدت سے منتظر ہوں۔

احسان الٰہی ظہیر

خط کے مندرجات سے ظاہر ہے کہ زیر بیان پلان کی تکمیل جماعت کے ان اصحاب علم وخبر اور ارباب فکر ونظر کا حصہ ہے جو قضا وافتاء کی صلاحیتوں کے امانت دار ہیں اور جن کا فکری ونظری تشخص جماعت کی انفرادیت کی ضمانت اور مسلک حق کا سرمایہ فخر وناز ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ حضرت علامہ رحمہ اللہ نے اس فقیر کو کیونکر اس لائق پایا کہ اعلیٰ سطح کے اس علمی اجتماع میں شرکت کا ایک دعوت نامہ ادھر بھی ارسال کر دیا۔

یہ فقیر عام طور پر مجالس میں حاضری کا قصد نہیں رکھتا کیونکہ جماعت کی تفریق نے لطفِ محفلِ شوق کو کرکرا کر رکھا ہے۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم کا

مگر علامہ مرحوم کا یہ خط اپنے اندر نہ صرف درد اور سوز کی کچھ زیادہ ہی مقدار سموئے ہوئے تھا بلکہ ان کی یہ احتیاط مزید وجہ کشش تھی کہ انہوں نے یہ خط اپنے معروف قانونی مقام سے ہٹ کر اپنی ذاتی حیثیت سے لکھا تھا۔ اس لیے حضرت کی اس درد بھری پکار کے جواب میں معذرت کی جسارت کو معصیت جانا اور ان کی حسب الطلب تعمیل ارشاد کی اطلاع ان کو بھیج دی کہ

عجب کیا ہے یہ بیڑہ غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

خط یا آئینہ سیرت

علام مرحوم کے اس خط کا سب سے زیادہ ایمان افروز پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مسلک کی برتری کے لیے اپنے آپ کو جماعتی منصب سے الگ رکھ کر یہ خط اپنی ذاتی

حیثیت سے لکھا ہے تاکہ ان کے جماعتی نظام سے باہر کے اہل حدیث علماء کو، جن کی وابستگیاں جماعت کے دوسرے نظاموں سے ہیں، ان کے ساتھ مل بیٹھ کر مسلک کی برتری کے وسائل و ذرائع دریافت کرنے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہو۔ پس جب وہ اس خط کو جماعت اہل حدیث کے ایک فرد کی حیثیت سے لکھتے ہیں تو اس طرح انہوں نے اپنی تنظیم سے باہر کے ان اہل حدیث اہل علم سے قریبی رابطہ پیدا کرنے کی ایک معقول اور قابل تحسین سبیل پیدا کی ہے جو اگرچہ ان کے خاص جماعتی نظام سے تو منسلک نہیں مگر اہل حدیث ہونے کے ناطے سے جماعت کے بھلے برے میں برابر کے شریک ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی یہ سوچ ان کی نیک دلی، مسلک سے ان کی محبت، ان کے ایثار، ان کی حسن زینت اور ان کی فطرت کی صالحیت کا ہی ایک واضح ثبوت اور ایک تابندہ پہلو ہے۔

وہ اگر یہ خط اپنی جماعت کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے لکھتے تو جماعت کے دخل سے خط کا بوجھ بہت بڑھ سکتا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے طلب کردہ اس اجتماع کی افادی حیثیت سکڑ کر رہ جاتی اور اس کا آفاقی پہلو کمزور پڑ جاتا۔

خط کی مزید وضاحت

علامہ مرحوم نے اجلاس کے شروع میں اپنے خط کی مزید وضاحت کرتے ہوئے خود بھی اپنی اس سوچ کا کھلے الفاظ میں اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''میں نے یہ خط اپنی جماعت کی طرف سے اس لیے نہیں لکھا ہے کہ جماعت کے وہ اہل علم حضرات بھی جن کو ہمارے خاص جماعتی نظام سے تو اختلاف ہے مگر وہ اہل حدیث کی حیثیت سے اپنے مسلک کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں، انہیں پوری جماعت اہل حدیث کی اس مشترکہ ضرورت کو حاصل کرنے کی مہم میں ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہو۔''

علامہ صاحب رحمہ اللہ نے مزید بتایا کہ ”میں نے یہ دعوت فی الحال صرف پنجاب کے علماء تک ہی محدود رکھی ہے اور ان میں سے بھی صرف ۲۰ حضرات کو ہی زحمت سفر دی ہے جن میں سے چند ایک کے سوا تقریباً سارے حضرات ہی تشریف لے آئے ہیں اور جو نہیں آ سکے انہوں نے معقول وجوہ سے عذر خواہی کی ہے۔

تاہم یہ صرف ابتدائی قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو جلد ہی اس پروگرام کو ملک گیر سطح تک وسیع کر دیا جائے گا۔“

علامہ رحمہ اللہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ”اس مجلس کے لیے میں نے جن اہل علم کو دعوت نامے جاری کیے ہیں یہ صرف ایک تحریکی امر ہی ہے ورنہ اہل علم کی یہ فہرست کوئی آخری فہرست نہیں ہے۔

آپ کے مشورہ سے ان سارے ہی اہل علم کو بلایا جا سکتا ہے جن کے متعلق آپ کو یقین ہو کہ وہ اس مجلس میں رائے دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ پس آپ جس شخص کو بھی اس مجلس میں شرکت کا اہل سمجھیں، مجھے ان کا نام بتا دیں۔ میں اگلی مجلس کے لیے ان کے نام دعوت نامے جاری کر دوں گا۔ خواہ ان کا تعلق جماعت کے کسی بھی گروہ سے ہو کیونکہ درپیش مسائل پر غور و فکر جہاں میرا مسئلہ ہے، وہاں یہ آپ کا اور ان سب کا مسئلہ بھی ہے۔“

اجتماع کا مقصد

اجتماع کے انعقاد کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے علامہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ”ہمارے آج کے اس اجتماع کا مقصد آپ کو میرے دعوتی خط سے معلوم ہو چکا ہے۔

بات یہ ہے کہ انسانی زندگی کے اس ترقی یافتہ دور نے کچھ ایسے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا وجود پہلے نہیں تھا ان میں بعض ایسے مسائل بھی ہیں جو اگرچہ بہت دیر سے ہمارے معاشرہ کا حصہ ہیں مگر وہ انسانی زندگی میں پوری طرح دخیل نہیں

تھے۔ مثلاً ہمارا یہ بنکنگ کا نظام ہے جو بہت دیر سے موجود ہے مگر ان سے تعلق زندگی کا ناگزیر پہلو نہیں تھا جبکہ آج یہ نظام پوری دنیا پر محیط ہو چکا ہے اور کاروبار میں بھی۔ بین الاقوامیت آ جانے کی وجہ سے بنکوں سے تعلق پیدا کیے بغیر کاروبار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جبکہ بنکنگ کا پورا نظام سود پر استوار ہوا ہے اور سود کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اب یہ بات سوچنے ہی والی ہے کہ کیا صورت پیدا ہو کہ ضرورت مند لوگ بنک سے استفادہ تو کریں مگر اس کے حرام سے بچ سکیں۔

ایسے ہی انشورنس کا نظام ہے جو زندگی کے بہت سے شعبوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کی سلامتی کی ضمانت پیش کرتا ہے۔

اس طرح بانڈ ہے، بیمہ ہے اور کچھ عرصہ سے انسانی اعضاء کا کاروبار بھی چل نکلا ہے۔ انسانی اعضا کی منتقلی، خون کا انتقال، اعضا کی پیوند کاری، آنکھوں کے عطیہ جات، آپریشن کی بعض صورتیں اور بہت سے دوسرے مسائل و امور ہیں جن سے تعلق پیدا کیے بغیر اس دور میں زندگی کی گاڑی کی سمت صحیح نہیں رہتی۔ ایسے میں لوگ پوچھتے ہیں اور ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں اور مجھے اپنے بیرون ملک دوروں کے دوران ایسے بہت سے مواقع درپیش آتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے اور ہر دور میں ہی انسانی زندگی میں پیش آنے والے سارے ہی مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے تو بتاؤ ان جدید مسائل کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

اسلام کے نزدیک ان مسائل میں حرام وحلال اور جواز و عدم جواز کی حدود کیا ہیں؟''

علامہ صاحب نے مزید بیان کیا کہ ''مجھ سے ان مسائل کے بارے میں بیرون ملک بعض غیر مسلموں نے بھی گفتگو کی اور مسلمانوں سے ایسے مواقع پیدا ہوئے اور میں نے اپنی صوابدید کے مطابق ان سب کو مطمئن کیا مگر یہ میرا ذاتی اجتہاد تھا میں اس کو

اسلام یا اہل حدیث مسلک کا مسلمہ موقف قرار نہیں دے سکتا تھا۔

کچھ دوسرے اہل علم نے بھی ان مسائل کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ ان کا اپنا اجتہاد ہے۔ اس کو اسلام کا موقف کہنا صحیح نہیں۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ پاکستان کے اہل حدیث علماء ایک جگہ جمع ہو کر اسلام کے ذخیرہ رشد و ہدایت میں ان مسائل کا حل تلاش کریں تا کہ ہم اس حل کو اسلام کے موقف کے طور پر پورے اعتماد سے لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ اسلام جب ہر دور میں ہی انسانیت کا مذہب ہے اور ہم اس کے علمبردار ہیں تو ہمیں اسلام کی طرف سے دور حاضر کے اس چیلنج کو قبول کر لینا چاہیے۔"

علامہ رحمہ اللہ کا پلان

علامہ رحمہ اللہ نے مزید فرمایا:

"یہ امر موجب قلق ہے کہ دوسرے بہت سے اسلامی ممالک میں دینی مسائل میں ریسرچ کے سلسلہ میں باقاعدہ علمی اور تحقیقی مجالس قائم ہیں جن کی طرف وہاں کی حکومتیں تک رجوع کرتی ہیں مگر یہ ایک پاکستان ہی ہے جسے دین کے نام پر بنایا گیا تھا یہاں نہ حکومتی نہ غیر حکومتی کسی درجہ میں بھی ایسا کوئی اہتمام موجود نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس کام کو جماعت اہل حدیث اپنے ذمے لے۔ اس باب میں میری تجویز یہ ہے کہ ہمارے اہل علم حضرات جمع ہو کر پہلے تو درپیش جدید مسائل کا استفتاء کریں پھر ہر مسئلہ پر بحث و تمحیص کا الگ الگ اہتمام کیا جائے۔"

میں نے اس غرض سے یہ طریق کار سوچا ہے کہ اس مہم کی تکمیل کے لیے اہل علم حضرات مناسب وقفہ سے جمع ہوتے رہیں اور اپنی ہر نشست میں باری باری ایک ایک مسئلہ زیر بحث لائیں۔

(اس مرحلہ پر یہ بات طے پائی کہ دونشستوں کا یہ درمیانی وقفہ ایک ماہ کا ہوگا)۔

علامہ صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا تھا:

''اب جب ایک اجتماع کے بعد دوسرے اجتماع تک کا وقفہ ایک ماہ طے پا گیا ہے تو میری سوچ کے مطابق اہل علم کو ہر ماہ ایک غور طلب مسئلہ سپرد کر دیا جائے اور وہ مہینہ بھر اس پر پوری تسلی سے محنت کریں، اس کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ ایک ایک شق کو کتاب و سنت کے ترازو میں اتاریں۔ اسے کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھیں اور اپنی تحقیق کی روشنی میں دلائل کی جمع وترتیب کریں۔ پھر اپنی اس تحقیق کو اگلے اجلاس میں اپنے شریک مجلس ساتھی علماء کے سامنے پیش کریں، جہاں مزید بحث طلب امور پھر زیر بحث آئیں گے۔

''دلائل کے باہمی مبادلہ اور ان کے تقابلی جائزہ، مخالف وموافق نظریات پر باہمی بحث وتمحیص کے نتیجہ میں شرکاء مجلس جس بات پر اتفاق رائے سے جمع ہو جائیں، اسے کتاب وسنت کے مطابق اور اہل حدیث کے موقف کے بطور قبول کر لیا جائے۔ اس طرح ہم ہر مہینے کم از کم ایک جدید مسئلہ کو پورے اعتماد وایقان کے ساتھ مشرف بہ اسلام کر سکیں گے۔ ہمارے فتاویٰ کی بنیاد پھر اسی مسلمہ مؤقف پر استوار ہوگی اور اس طرح ہمیں دور حاضر کی جدیدیت کا چیلنج قبول کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ سکے گی۔ ان شاء اللہ''

انہوں نے مزید فرمایا کہ

''بلاشبہ اس مہم کی تکمیل میں ہمارے علماء کو بہت زیادہ محنت کرنا ہوگی اور اجتماعات کے باقاعدہ انتظام وانصرام پر بہت سے اخراجات بھی اٹھیں گے مگر میں سمجھتا ہوں یہ

کوئی زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ جہاں تک اس سلسلہ کے اخراجات کا تعلق ہے، وہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں اور جہاں تک محنت کا تعلق ہے میں ہر مرحلہ پر آپ کے ساتھ شامل رہوں گا اور آپ کو اگر اپنے فرض کی تکمیل کے لیے کسی خاص کتاب کی ضرورت ہو گی تو میری لائبریری سب کی سب، آپ کے لیے حاضر ہے۔ آپ جب چاہیں، اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔''

علامہ رحمہ اللہ نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ اگر برا محسوس نہ کریں تو مجھے اجازت دیں کہ ان ماہ بماہ اجتماعات میں شرکت پر اٹھنے والے آپ کے تمام اخراجات بھی میرے ذمے ہوں گے۔ بلکہ اگر کوئی بزرگ یہاں کسی دوسرے صوبے سے بذریعہ ہوائی جہاز بھی تشریف لائیں گے تو ان کے فضائی سفر کے تمام اخراجات بھی میں ہی ادا کروں گا۔

(تاہم حضرت علامہ مرحوم کی یہ اخلاص بھری پیشکش ان کے انتہائی شکریہ کے ساتھ انہیں لوٹا دی گئی)۔

ایک لطیفہ

مجلس میں ایک مرحلہ پر حضرت علامہ رحمہ اللہ نے یونہی برسبیل تذکرہ اہلحدیث علماء کا شکوہ کیا کہ میرا جو انٹرویو، قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے اس نے پورے پاکستان کے اہل فکر کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے اور حد یہ ہے کہ حنفی مکتب فکر کے چند علماء پر مشتمل ایک وفد میرے پاس آیا۔ انہوں نے جہاں میرے خیالات کی تحسین کی، وہاں اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ ہمیں یہ انٹرویو اپنی جانب سے شائع کر کے تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے مگر ہمارے اہلحدیث اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی اس بارے میں مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا اس پر ایک بزرگ نے یہ فرما کر علامہ رحمہ اللہ کا قلق دور کر دیا کہ ہمارے اکثر علماء تو خود اپنے جماعتی ہفت روزے تک پڑھنے کی فرصت نہیں پاتے،

کوئی زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ جہاں تک اس سلسلہ کے اخراجات کا تعلق ہے، وہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں اور جہاں تک محنت کا تعلق ہے میں ہر مرحلہ پر آپ کے ساتھ شامل رہوں گا اور آپ کو اگر اپنے فرض کی تکمیل کے لیے کسی خاص کتاب کی ضرورت ہوگی تو میری لائبریری سب کی سب، آپ کے لیے حاضر ہے۔ آپ جب چاہیں، اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔"

علامہ رحمہ اللہ نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ اگر برا محسوس نہ کریں تو مجھے اجازت دیں کہ ان ماہ بماہ اجتماعات میں شرکت پر اٹھنے والے آپ کے تمام اخراجات بھی میرے ذمے ہوں گے۔ بلکہ اگر کوئی بزرگ یہاں کسی دوسرے صوبے سے بذریعہ ہوائی جہاز بھی تشریف لائیں گے تو ان کے فضائی سفر کے تمام اخراجات بھی میں ہی ادا کروں گا۔

(تاہم حضرت علامہ مرحوم کی یہ اخلاص بھری پیشکش ان کے انتہائی شکریہ کے ساتھ انہیں لوٹا دی گئی)۔

ایک لطیفہ

مجلس میں ایک مرحلہ پر حضرت علامہ رحمہ اللہ نے یونہی برسبیل تذکرہ اہلحدیث علماء کا شکوہ کیا کہ میرا جو انٹرویو، قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے اس نے پورے پاکستان کے اہل فکر کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے اور حد یہ ہے کہ حنفی مکتب فکر کے چند علماء پر مشتمل ایک وفد میرے پاس آیا۔ انہوں نے جہاں میرے خیالات کی تحسین کی، وہاں اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ ہمیں یہ انٹرویو اپنی جانب سے شائع کر کے تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے مگر ہمارے اہلحدیث اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی اس بارے میں مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا اس پر ایک بزرگ نے یہ فرما کر علامہ رحمہ اللہ کا قلق دور کر دیا کہ ہمارے اکثر علماء تو خود اپنے جماعتی ہفت روزے تک پڑھنے کی فرصت نہیں پاتے، وہ

کوئی زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ جہاں تک اس سلسلہ کے اخراجات کا تعلق ہے، وہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں اور جہاں تک محنت کا تعلق ہے میں ہر مرحلہ پر آپ کے ساتھ شامل رہوں گا اور آپ کو اگر اپنے فرض کی تکمیل کے لیے کسی خاص کتاب کی ضرورت ہوگی تو میری لائبریری سب کی سب، آپ کے لیے حاضر ہے۔ آپ جب چاہیں، اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔''

علامہ رحمہ اللہ نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ اگر برا محسوس نہ کریں تو مجھے اجازت دیں کہ ان ماہ بماہ اجتماعات میں شرکت پر اٹھنے والے آپ کے تمام اخراجات بھی میرے ذمے ہوں گے۔ بلکہ اگر کوئی بزرگ یہاں کسی دوسرے صوبے سے بذریعہ ہوائی جہاز بھی تشریف لائیں گے تو ان کے فضائی سفر کے تمام اخراجات بھی میں ہی ادا کروں گا۔

(تاہم حضرت علامہ مرحوم کی یہ اخلاص بھری پیشکش ان کے انتہائی شکریہ کے ساتھ انہیں لوٹا دی گئی)۔

ایک لطیفہ

مجلس میں ایک مرحلہ پر حضرت علامہ رحمہ اللہ نے یونہی برسبیل تذکرہ اہلحدیث علماء کا شکوہ کیا کہ میرا جو انٹرویو، قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے اس نے پورے پاکستان کے اہل فکر کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے اور حد یہ ہے کہ حنفی مکتب فکر کے چند علماء پر مشتمل ایک وفد میرے پاس آیا۔ انہوں نے جہاں میرے خیالات کی تحسین کی، وہاں اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ ہمیں یہ انٹرویو اپنی جانب سے شائع کر کے تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے مگر ہمارے اہلحدیث اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی اس بارے میں مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا اس پر ایک بزرگ نے یہ فرما کر علامہ رحمہ اللہ کا قلق دور کر دیا کہ ہمارے اکثر علماء تو خود اپنے جماعتی ہفت روزے تک پڑھنے کی فرصت نہیں پاتے، وہ

قومی ڈائجسٹ میں آپ کا انٹرویو پڑھنے کہاں جاسکتے تھے۔اس پر ساری محفل کھلکھلا گئی۔

ٹھیک ایسے ہی جب حضرت علامہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر ماہ ایک جدید مسئلہ علماء کے سپرد کر دیا جائے گا تو اس پر انہیں بتایا گیا کہ ان جدید مسائل میں سے بہت سے مسائل تو ہمارے اکثر علماء کے علم میں بھی نہیں آئے اور وہ ان کے بارے میں سرے سے کچھ نہیں جانتے، وہ ان کے بارے میں کیونکر رائے دے سکتے ہیں۔ جب تک انہیں زیرغور مسئلہ کا تفصیلی تعارف حاصل نہیں ہوگا۔

اس مشکل کو حضرت علامہ رحمہ اللہ نے یہ فرما کر حل کر دیا کہ یہ بات بھی میرے ذمے رہی۔ میں جب ہر ماہ اپنے اہل علم بزرگوں کو اگلے اجلاس میں زیرغور آنے والے مسئلہ کے بارے میں بذریعہ ڈاک اطلاع دوں گا تو ساتھ ہی مسئلہ کی تفصیلات، اس کے قابل توجہ اور بحث طلب پہلوؤں کی نشاندہی بھی کر دیا کروں گا۔

کمپیوٹر

اس مرحلہ پر حاضرین حضرت علامہ رحمہ اللہ کی زبان سے یہ مژدہ جاں فزا سن کر مسرت سے اچھل پڑے کہ انہوں نے ان اجتماعات کی تفصیلی بحثوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اردو زبان میں کام کرنے والا ایک کمپیوٹر بھی خرید لیا ہے جو دو کروڑ اردو الفاظ کو اپنے اندر جمع رکھ سکتا ہے اور حضرت علامہ نے مزید یہ فرما کر حاضرین کو کیف وسرور میں گم کر دیا کہ انہوں نے ۲۰ لاکھ روپے کی عظیم وخطیر رقم کی یہ مشین خود اپنے ذاتی روپے [1] سے

[1] یہ نکتے کی بات ہے کہ یہ مضمون مولانا عبدالرحمٰن خلیق کا ہے جو علامہ کی جماعت کے نظم کا حصہ نہیں تھے اور یہ کمپیوٹر علامہ نے اپنے ذاتی پیسے سے خریدا تھا۔ اس گفتگو کے ٹھیک 5 دن بعد علامہ کا حادثہ ہو گیا اور یہ کمپیوٹر استعمال ہی نہ ہو سکا۔ تقریباً 23 سال بعد میں نے اس کمپیوٹر کو جو ٹیکنالوجی کے جدید ترین ہونے کے سبب از کار رفتہ ہو چکا تھا۔ فروخت کر دیا، اور یہ پیسے مرکز اہل حدیث لارنس روڈ کے بعض تعمیراتی کاموں میں لگا دیئے۔ اگرچہ یہ کمپیوٹر ان کے ذاتی روپے سے آیا تھا لیکن ان کے لیے ان الفاظ کا پاس بھی ضروری تھا کہ یہ مسلک کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ (ابوبکر قدوسی)

خریدی ہے اور اس رقم میں نہ کسی ادارے کا حصہ ہے نہ کسی حکومت کا۔ مزید فرمایا کہ میں نے یہ رقم مسلک کی خدمت کے لیے صرف کی ہے اور یہ مشین اب مسلک کی خدمت کے لیے ہی وقف رہے گی۔ کمپیوٹر کی کارکردگی اور اس کی کاربرآوری کی تفصیل بتاتے ہوئے حضرت علامہ رحمہ اللہ نے بتایا کہ کمپیوٹر سے کام لینے کے لیے دو اصحاب علم وخبر کو باتنخواہ مامور کیا جائے گا جو کمپیوٹر میں محفوظ طویل بحثوں میں ان نکات کو الگ کریں گے جن کو مجلس نے اہل حدیث کے موقف کے بطور قبول کیا ہے۔

یہ نکات ایک دستاویز کی صورت میں یکجا کر کے ایک بار پھر علماء کی مجلس میں پیش کیے جائیں گے اور اس بات کی تسلی کی جائے گی کہ آیا طے شدہ موقف کے باب میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت تو نہیں۔ پھر علماء حضرات اس دستاویز پر اپنے تصدیقی دستخط ثبت کریں گے اس کے بعد حضرت علامہ رحمہ اللہ اس دستاویز کو زیر بحث مسئلہ پر اہل حدیث کے قانونی موقف کی حیثیت سے شائع کر دیا کریں گے۔

حاضرین کا ردعمل

علامہ مرحوم کی اس ایمان افروز اور روح پرور بات کی تکمیل تک پورا ماحول انکے اخلاص وایثار، ان کے جذبہ خدمت مسلک اور ان کے عزم محکم کی مشام نواز اور کیف بار خوشبو سے معطر ومتکیف اور ایمان وایقان کی شعاع ہائے نور سے منور ہو چکا تھا۔ زبانیں ان کے لیے وقف، دعا اور دل ان کے ایثار پر نثار تھے۔

حضرت علامہ رحمہ اللہ کی سوچ اور ان کے عزم کی ہر طرف سے بھرپور تائید کی گئی اور پورے ایوان نے انتہائی گرمجوشی سے ان کی طرف سے چلائی جانے والی مہم میں ہوا کے ہر رخ پر دل کی گہرائیوں سے تعاون کا یقین دلایا۔

علامہ مرحوم نے حاضرین کو یہ اختیار دیا تھا کہ اگر کوئی صاحب ان کے پیش کردہ پلان میں کوئی مفید مطلب ترمیم پیش کر سکیں تو وہ ان کا خیر مقدم کریں گے مگر سب نے

ان کے پلان کو علی حالہ قائم رکھنا ہی پسند کیا۔

علامہ رحمہ اللہ صاحب نے اس مرحلہ پر حاضرین کو بتایا کہ میرا زیر تعمیر دفتر [1] بفضل اللہ تعالیٰ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور۔ان شاء اللہ۔ امید ہے کہ ہمارا اگلا ماہانہ اجتماع وہیں منعقد ہوگا۔

علامہ کی سیرت کے بعض اجلے نقوش

اس اجتماع کا اول بھی حسن تھا اور آخر بھی حسن ہی تھا۔ یہ محفل جتنی ساعتیں جمی رہی حسن و رنگ میں ہی کھوئی رہی۔

اصل مسئلہ بھی جاری تھا اور حضار مجلس علماء وحفاظ وقراء کے سخن ہائے دل پذیر کے جواہر پارے بھی بٹتے رہے۔ حقائق و معارف کے لولوئے لالہ بھی لٹائے جاتے رہے۔ کتاب وسنت کے پھول بھی کھلتے رہے اور ریاض رسول ﷺ کے بلبل بھی چہکتے رہے۔ یہ محفل کیا تھی ایک دریائے نور تھا جو دلوں کی خشک کھیتیوں کو سیراب کر رہا تھا۔ عرش وفرش کی روایتوں اور گل وبلبل کی حکایتوں سے ماحول بے مقدار شگفتگی کا یوں عکاس تھا کہ اللہ اللہ۔

لطف خام ساقی و ذوق صدائے جنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوس گوش ہے

اس مجلس میں علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم کی سیرت کے بعض ایسے روشن پہلو بھی سامنے آئے جو شاید اس تقریب کا ہی حصہ تھے اور جو اس کے بغیر کبھی سامنے نہ آتے اور مشیت ایزدی نے شاید اس غرض سے یہی وقت طے کر رکھا تھا۔ مجلس کے اندر علامہ رحمہ اللہ کی سیرت کا کوئی نظر افروز شگوفہ جب اچانک پھوٹ پڑتا تو مجلس کے حسن

[1] مراد 50 لوئر مال ہے کہ جہاں علامہ نے اپنا ذاتی دفتر قائم کیا تھا اور لائبریری بھی وہیں منتقل کر دی تھی۔ علامہ کی شہادت کے وقت اوپر والی منزل تکمیل کے قریب تھی۔ جبکہ پہلی منزل پہ علامہ نے نشست شروع کر دی تھی۔

و رنگ کا نکھار مزید بڑھ جاتا اور محفل کی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا۔

ذیل میں ہم ان کی سیرت کے چند ان حسین پہلوؤں کا ذکر کریں گے جو اس تقریب میں بغیر کسی تجسس اور تلاش کے سرراہ ہی اچھل آتے۔

علامہ کا ذوق

جماعت کے اخبارات کا ذکر آیا تو بڑے قلق کا اظہار کیا۔ کہنے لگے ''افسوس ہے کہ ہمارے جماعتی اخبارات میں ذوق کی تسکین کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ جماعت کے ہفت روزوں، اہل حدیث، الاعتصام اور الاسلام میں سے کس کی بات کروں، ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا مطالعہ پڑھنے والے کے شوق مطالعہ کو تحریک کرے۔ مجھے ان کے مطالعہ کی کبھی رغبت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے مطالعے سے قاری کو کوئی نئی چیز نہیں ملتی۔ سطحی جمع و ترتیب، بھرتی کے مضامین اور دوسروں سے نقل در نقل میں آخر کشش والی کون سی بات ہے۔ خود میرے اپنے ماہنامے ''ترجمان الحدیث'' کا بھی یہی حال ہے۔ کتنے برسوں سے مجھے اس کے مطالعے میں بھی کوئی رغبت نہیں رہی ہے کیونکہ اس کا حال بھی ہمارے ہفت روزوں سے کچھ بھی مستغائر نہیں ہے۔ اس میں میری اپنی کوتاہی کا بھی دخل ہے کہ میں بہت سی دوسری علمی مصروفیات کے سبب اس پر توجہ نہیں دے سکا۔ تاہم اب میں نے پختہ عزم کر لیا ہے کہ ترجمان الحدیث کو اپنی توجہ کا مرکز بناؤں اور کم از کم اسے ضرور ایک معیاری ماہنامہ کی سطح پر لے آؤں۔ اس مرحلہ پر حضرت علامہ رحمہ اللہ نے اس فقیر کی نگارشات کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

غیرت مندی

ایک مرحلہ پر خوشامد کا ذکر آیا تو اس مردِ درویش کی گفتگو میں شاہوں کی جلالت در آئی۔ کہنے لگے میں نے اپنی پوری زندگی کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اگرچہ مجھے اپنی اس عادت کی وجہ سے بارہا نقصان بھی پہنچا مگر میری غیرت نے خوشامد کی ذلت کے مقابلہ

میں نقصان کو قبول کیا اور اس پر مجھے کبھی پشیمانی نہیں ہوئی۔

یہاں پاکستان کی حکومت نے میری کتاب ''بریلویت'' کو بلا جواز ہی ضبط کر رکھا ہے لیکن اگر حکومت کو اس بات کا انتظار ہے کہ اپنی کتاب کو آزاد کرانے کے لیے احسان الٰہی ظہیر درخواست پیش کرے تو اس کی یہ خواہش اس کی حسرت ہی بنی رہے گی۔

سعودی عرب میں میری کتاب ''الشیعہ والسنۃ'' پر پانچ سال تک پابندی عائد رہی ہے میں اگر چاہتا تو مملکت سعودیہ کے فرمانروا شاہ فہد کو صرف ایک خط لکھ کر اپنی کتاب کو آزاد کروا سکتا تھا۔ میرے ان سے گہرے ذاتی مراسم بھی تھے مگر میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ انہیں اس بارے میں ایک خط بھی تحریر کروں۔

''بریلویت'' پر اگر پاکستان میں پابندی ہے یا الشیعہ والسنۃ کو اگر حکومت سعودیہ نے ناپسند کیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں دوسرے اسلامی ممالک میں لاکھوں کی تعداد میں طبع اور تقسیم ہو رہی ہیں۔

حکومتیں کتابوں پر تو پابندی عائد کرسکتی ہیں مگر ان کی مقبولیت پر پابندی عائد کرنا حکومتوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں اور بدستور ہوتے رہیں گے۔ صرف ایک انڈونیشیا میں ہی الشیعہ والسنۃ کے پانچ ایڈیشن طبع اور تقسیم کے مرحلہ سے گزر چکے ہیں۔

مخالفین کی خوبیوں کا اعتراف

اپنے مخالفین سے انصاف روا رکھنا بڑا مشکل کام ہے مگر علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی سیرت کے اس تابدار رخ نے مجھے بہت متاثر کیا کہ وہ اپنے مخالفین کی خوبیوں کا کھلے دل سے اور برملا اعتراف کرنے میں اپنی کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے تھے۔

یہ بات سب کو ہی معلوم ہے کہ جماعت اہل حدیث پاکستان کے دو بڑے دھڑے قائم ہیں۔ ایک دھڑے کے قائد میاں فضل حق صاحب ہیں اور اس دھڑے کی

امارت مولانا معین الدین صاحب لکھوی کے سپرد ہے

دوسرے دھڑے کے قائد علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ تھے اور امارت کا اعزاز مولانا محمد عبداللہ صاحب گوجرانوالہ کو حاصل ہے۔

پوری جماعت اور خود دونوں دھڑوں کے قائدین و امراء کی خواہش کے باوجود بھی ابھی تک ان دونوں کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت دریافت نہیں ہوسکی۔ اس مجلس میں ایک موقع پر کسی بزرگ نے علامہ مرحوم کو ان کی بے تکان کارکردگی اور کام میں بے اندازہ لگن پر خراج تحسین پیش کیا تو فرمایا:

یہ میرے رب کریم کا مجھ پر خصوصی احسان ہے اور میں اس احسان کا شکر یہ ادا نہیں کرسکتا مگر میں نے یہ بے تکان اور لگن سے کام کرنا چار ایسے حضرات سے سیکھا ہے جن سے میری ناپسندیدگی رہی ہے۔ ان میں سے ایک تو میاں فضل حق صاحب ہیں جو بقید حیات ہیں اور دو حضرات حاجی محمد اسحاق حنیف اور شیخ محمد اشرف فوت ہو چکے ہیں۔

علامہ نے بات ختم کی تو کسی نے سوال کیا چوتھے بزرگوار کون ہیں؟ کہنے لگے چھوڑیئے ان کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

انتہائی باخبر قائد

اہل سیاست کا اپنے گرد و پیش کے ہر نوع کے حالات سے باخبر رہنا ان کی سیاست کی پہلی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں ایسے سیاستدان تو بکثرت پائے جاتے ہیں جو اپنے حلقہ سیاست میں اپنے گرد و پیش اور اپنی ہیئت حاکمہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں مگر ایسے لوگ ہمارے ہاں بہت کم ہیں جن کی آنکھ سیاست کے بین الاقوامی کھلاڑیوں کی خوفناک سازشوں، ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں، عالم اسلام کے خلاف ان کی معاندانہ کارروائیوں کو بھی اپنے علم و خبر کے آئینہ میں پوری ہوش مندی سے دیکھ رہی ہو اور ہمارے یہ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ آخرالذکر ارباب سیاست

میں ہی داخل تھے۔

امریکہ روس، اسرائیل، بھارت اپنے اپنے مفادات کے زیر اثر ایک دوسرے کے خلاف تصادم تک پر آمادہ رہنے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس طرح متحد ہیں، اس عنوان سے علامہ مرحوم کو وسیع معلومات حاصل تھیں اور مشرق وسطیٰ میں کھیلا جانے والی سیاسی کھیل تو اپنے ہر رخ سے ان کی بساط سیاست پر ایک مہرے کی طرح جانا پہچانا تھا۔

مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک کے سربراہوں کی سوچ اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں علامہ مرحوم کی رسائی کی حدود کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ ایک واقعہ ہی کفایت کرتا ہے جو یونہی بر سبیل تذکرہ ہی ان کی زبان پر اچھل آیا۔ عملی دنیا میں اہل حدیث کی مشکلات کا ذکر آیا تو کہنے لگے دور کی بات تو چھوڑیئے، اہل حدیث کے مستقبل کو ہمارے قریب مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک میں بھی جس درجہ بوجھل رکاوٹیں درپیش ہیں، آپ یہاں بیٹھے ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اہلحدیث کا قصور یہ ہے کہ ان کا مسلک بے حد سادہ، صاف ستھرا اور بآسانی فہم میں اتر جانے والا ہے۔ بنا بریں جہاں بھی پہنچا ہے، اسے قبول عام حاصل ہوا اور اس کے اسی قبول عام نے اہل حدیث کو ان قوتوں کا بھی محسود بنا دیا ہے جن سے اہلحدیث بے حد محبت رکھتے ہیں۔

چنانچہ مشرق وسطیٰ کے ایک مسلمان فرمانروا نے اپنے دوسرے ہم عصر فرمانرواؤں کے نام ایک مکتوب میں انہیں سلفی المسلک مسلمانوں سے احتیاط کی تاکید کی ہے اور لکھا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ان لوگوں کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کی وجہ سے آپ کو ان کے تپاک سے جو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، وہ کسی مخالف اسلام قوت کی جارحیت سے کہیں زیادہ ہے لیکن جہاں تک اپنے ملک کا تعلق ہے علامہ مرحوم ملک اور اس کے سربراہوں،

بڑے بڑے حکام اور وزراء کے رازہائے دروں پردہ سے اتنی گہری آگاہی رکھتے تھے کہ یہ لوگ اپنی کرتوتوں کا راز کھل جانے کے خوف سے علامہ مرحوم سے ہمیشہ آنکھیں جھکاتے تھے۔

حوصلہ مندی اور بردباری

اس اجتماع میں علامہ مرحوم کی حوصلہ مندی اور بردباری کو بھی ابتلا کا شکار ہو جانا پڑا مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ پیش آمدہ حالات میں بالآخر علامہ مرحوم کی بردباری اور حوصلہ مندی کو ہی غلبہ حاصل ہوا۔

آج کی مجلس میں دو بزرگ آدابِ مجلس کے خلاف از اول تا آخر تقریباً لیٹے ہی رہے ان میں سے ایک بزرگ کا عذر تو ان کی علالت تھی اور ظاہر ہے یہ ایک معقول عذر تھا مگر دوسرے بزرگ علیل نہیں تھے بلکہ صرف خود کو جلیل سمجھنے کے رشتہ لاپرواہی سے ہی لیٹے رہے جبکہ وہاں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اپنے علم اور تقویٰ دونوں کے اعتبار سے ہی ان پر فائق تھے۔

علامہ مرحوم کی نگاہ بار باران کی طرف اٹھتی رہی مگر وہ بار بار ہی اپنی نظر پھیر لیتے رہے۔

کچھ دوسرے امور ومسائل

ایک مرحلہ پر اس فقیر نے مجلس میں بات اٹھائی کہ مسلک اہل حدیث کے خلاف مخالفین نے قلمی مہم جاری کر رکھی ہے جو انتہائی خطرناک ہے ہمیں بھی اس کے جواب میں بطور ایک مہم کے ہی کام کرنے کی ضرورت ہے جبکہ ہمارے محاذ پر اگر مکمل نہیں تو بڑی حد تک سکوت طاری ہے اور ہم نے جماعتی حیثیت سے اس عنوان سے کبھی غور نہیں کیا۔

علامہ مرحوم نے اس ضرورت کی اہمیت پر کم وبیش دس منٹ تک تبصرہ کیا اور بتایا کہ ہمارے ہاں کی یہ کوتاہی اور غفلت کوئی تازہ حادثہ نہیں ہے بلکہ ہم گذشتہ اڑھائی تین

صد سال سے ہی اس کوتاہی اور غفلت کا شکار چلے آ رہے ہیں جبکہ اس عرصہ میں مخالف مسلک اہل قلم نے ہمارے مسلک کے خلاف اپنی تخلیقات کا ایک بڑا انبار تاریخ کے سپرد کر دیا ہے۔

آپ نے اس عزم کا اظہار کیا کہ یقیناً یہ کام بھی ہمارے کرنے والے کاموں میں ایک سرفہرست کام ہے اور جماعت اس باب میں اپنا بہترین فرض ادا کرے گی۔ ایک صاحب نے فرمایا اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ اصل کمی وسائل کی ہے جس کی وجہ سے اہل حدیث حلقوں میں یہ مہم بار آور نہیں ہو سکی۔

علامہ مرحوم نے اس کا لب برداشتہ جواب دیا کہ وسائل کی کمی کوئی عذر نہیں ہے۔ اگر کوئی ہمت کرے تو وسائل اللہ تعالیٰ خود پیدا کر دیتے ہیں اور میں نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کا یہ رخ اپنے حق میں کھلی آنکھوں دیکھا ہے۔

علامہ مرحوم کی موعظت اثر سرگزشت

علامہ رحمہ اللہ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بعض دلچسپ لطیفہ اثر اور موعظت وغیرت سے بھرے واقعات اس مرحلہ پر سنائے۔ فرمانے لگے میں جب مسجد چینیانوالی میں نیا نیا خطیب مقرر ہوا تھا تو ضرورت پڑنے پر میں عربی زبان کو اپنی مادری زبان کی طرح ہی بولتا تھا۔

شیخ محمد اشرف صاحب جو مسجد کے ناظم الامور تھے، مجھے اکثر ہی کہتے کہ تم محض باتونی آدمی ہو اور عربی بول کر ہم پر اپنی عربی دانی کا رعب جماتے ہو۔ کوئی عملی کام کرو جس سے دوسرے فائدہ اٹھا سکیں، نری باتوں سے کیا ہوتا ہے۔

علامہ مرحوم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بتایا کہ شیخ صاحب رحمہ اللہ مجھ پر یہ لطیفہ بھی جھاڑا کرتے تھے کہ ہمارے محلے میں ایک مائی بڑی لڑاکا تھی۔ کوئی اس سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا مگر وہ صرف محلے ہی میں شیر تھی جب کبھی اس کا کسی غیر سے دنگل پڑتا

تو طرح دے کر نکل جاتی تھی۔

کہنے لگے کہ پھر یہ بھی ایک لطیفہ ہی ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد میں وہاں پہنچ گیا جس کی شیخ صاحب کو تمنا تھی اور شیخ صاحب رحمہ اللہ وہاں پہنچ گئے جہاں وہ مائی کھڑی تھی۔ میں نے جب تک قلم نہیں سنبھالا تھا، شیخ صاحب رحمہ اللہ میرے سر چڑھے رہے مگر جونہی میں نے قلم ہاتھ میں لیا تو ایک کے بعد دوسری پھر تیسری چوتھی پانچویں چھٹی یعنی تصنیف کے بعد تصنیف چلی آنے لگی۔ اب جو میں نے مڑ کر دیکھا تو شیخ صاحب کہیں موجود نہ تھے۔ میں نے انہیں نام لے کر آوازیں دیں مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن شیخ صاحب مرحوم کی اس بے اعتنائی سے میں نے کوئی اثر نہ لیا اور جب قدم اٹھ چکا تو وہ آگے ہی بڑھتا رہا، پیچھے کو نہیں لوٹا۔

شیخ صاحب رحمہ اللہ نے پیٹھ دی تو اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے وسائل کے صدہا دروازے کھول دیئے اور آج یہ حال ہے کہ جونہی میری کوئی کتاب طبع ہو کر نکلتی ہے تو ہاتھوں ہاتھ اٹھ جاتی ہے۔ میری کتابوں کے بعض ایڈیشن صرف دس دس روز کے اندر ہی ختم ہو گئے جبکہ میری کسی کتاب کا کوئی ایڈیشن تیس ہزار سے کم کبھی شائع نہیں ہوا اور مانگ کا یہ حال ہے کہ مجھے بعض طلب کرنے والوں کو ہی اجازت دے دینا پڑی کہ تم اپنی طلب خود پوری کر لو۔

صرف اڑھائی روپے

اسی ذیل میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی سنایا جو لطیفے کا لطیفہ ہے اور موعظت کی موعظت۔ اس میں علامہ مرحوم کی استقامت بھی پیدا ہے اور عبرت کے بہت سے پہلو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ فرمایا چینیانوالی مسجد میں خطابت کے ابتدائی زمانہ میں انتظامیہ نے مجھے مسجد کے لیے تحصیل زر کی اپیل کے لیے کہا اور میں جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا، میں نے بھرپور اور زوردار الفاظ میں لوگوں سے مالی

تعاون کی اپیل کی اور آپ مانیں گے نہیں مگر واقعہ یہی ہے کہ میری اپیل کے جواب میں بھری مسجد سے صرف اڑھائی روپے کی رقم جمع ہو سکی۔ میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ رجائیت سے ہی وابستہ رکھا ہے اور امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ یہ واقعہ اگرچہ میری زندگی کا ایک حادثہ ہی تھا مگر میں اس سے دل شکستہ ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری، اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ دن رات کام کیا۔ بھرپور محنت کی اور پھر ایک ایسا دن بھی آیا کہ جس مسجد میں مسجد کے نمازیوں نے میری اپیل کی اڑھائی روپے قیمت ڈالی تھی، اسی مسجد میں انہیں نمازیوں سے میں نے صرف ایک گھنٹہ بھر کی مختصر نشست میں ساڑھے نو لاکھ روپے کی خطیر رقم جمع کر لی۔

لائبریری

باتوں ہی باتوں میں کچھ علماء حضرات نے اس تکلیف کا اظہار کیا کہ ہمارے ہاں ضروری کتب کا بے حد قحط ہے اور اکثر ہی بعض ضروری کتب کی عدم موجودگی کی وجہ سے ریسرچ تشنہ اور تخلیق ناتمام رہ جاتی ہے۔ علامہ مرحوم نے فرمایا کہ کتب کی فراہمی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میری لائبریری میں ہر قسم کے علوم وفنون کی کتابیں جمع ہیں اور میرا خیال ہے کہ میری معلومات کی حد تک اہل علم کی ذاتی لائبریریوں میں میری لائبریری سے بڑھ کر کوئی لائبریری موجود نہیں۔

آپ میں سے جس اہل علم کو اپنی تصنیفی مہم میں کسی بھی کتاب کی ضرورت پیش آئے آپ بلا جھجک تشریف لائیں اور اپنی ضرورت کی تکمیل تک استفادہ کریں۔ میرا یقین ہے کہ یہاں آپ کو آپ کی ضرورت کے مطابق ہر کتاب مل سکے گی۔ ان شاء اللہ

مزید فرمایا کہ ہمارے اگلے اجلاس تک میری لائبریری اپنی اس جگہ منتقل ہو چکی ہو گی اور آپ کے لیے کھول دی جائے گی۔ آپ دیکھیں گے تو آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ وہاں آپ کی ضرورت کی ہر کتاب مہیا ہے اور آپ کے شوق کا پورا سامان

موجود ہے مگر آہ پھر وہ وقت موعود نہ آ سکا۔

اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا ترا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

فرقے

فرمایا کہ دوسری کتابوں کی تو میں بات نہیں کرتا کہ میرے اس ذخیرۂ کتب سے بڑا ذخیرہ کسی اور کے پاس بھی موجود ہے یا نہیں مگر یہ ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فرقوں کے زیر عنوان میری لائبریری کے مقابلہ میں پوری دنیا کے اندر کوئی لائبریری موجود نہیں ہے۔ مزید فرمایا کہ

مذاہب کی تاریخ میں جتنے بھی فرقے اب تک دریافت ہو سکے ہیں ان میں سے کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ہے جس کا لٹریچر اول تا آخر میری لائبریری میں موجود نہ ہو۔

آپ نے حاضرین کو بتایا کہ فرقوں کے زیر عنوان میری لائبریری میں موجود کتابوں کی گنتی ہزاروں تک پہنچتی ہے اور آپ نے پیشکش کی کہ میری یہ دعوت عام ہے کہ فرقوں کے مسئلہ پر جو بھی عالم دین، محقق یا سکالر کوئی تحقیق یا ریسرچ کرنا چاہے وہ میری لائبریری سے ہر وقت استفادہ کر سکتا ہے۔ ؏

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

محفل کے اندر ایک اور یادگار محفل:

امیر، جمع ہیں احباب، حالِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے، نہ رہے

اجلاس کا اختتام آئندہ کے لیے یہ اصول طے کرنے پر ہوا کہ علماء کا یہ ماہانہ اجتماع ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو منعقد ہوا کرے گا اس کے بعد احباب ایک دوسرے سے گھل مل کر باتیں کرنے لگے مگر واقعہ یہ ہے کہ امت کے علماء کی اپنی باتیں بھی ان

کے پاس پوری امت کی امانت ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ باہمی دوستانہ باتیں بھی محفل کے اندر ایک اور حسین محفل کی تخلیق کا موجب بن گئیں اور علامہ مرحوم کے ایک مختصر سے کمرے کی بات اچانک ہی ملک گیر حیثیت اختیار کر گئی اور بقول۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے

اور اس طرح یہ ضمنی محفل بھی اپنی اہمیت اپنی افادیت اور حسن و رنگ کے گونا گوں پہلوؤں کی وجہ سے ایسی ہزاروں محفلوں کے لیے وجہ رشک بن گئی۔

اب یہ بات تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم تھی کہ آج کی یہ مجلس علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی زندگی کی آخری اہم مجلس ہے اور اس مجلس میں تشکیل پانے والے خاکہ میں کبھی رنگ نہیں بھرا جا سکے گا۔

اور یہ بھید بھی پھر ۳۰ مارچ کو ہی کھل سکا (جس روز علامہ رحمہ اللہ کی وفات کا حادثہ وقوع پذیر ہوا) کہ برسوں پر پھیلے ہوئے بے شمار مسائل چند گھڑیوں پر مشتمل اس مجلس میں جو یوں سمٹ سمٹ کر جمع ہو رہے تھے تو یہ کسی آسمانی دخل کا ہی نتیجہ تھا اور مشیت ایزدی حکم و بصر و فکر نظر اور عبرت و موعظت کے وہ سارے ہی ذخیرے یکجا کر رہی تھی جن کو مستقبل کے لیے نشان منزل بنایا جا سکے اور آنے والے لوگ جن سے راہنمائی حاصل کریں۔ [1]

اللہ اکبر! کیا سچ ہے ع

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

---

[1] وائے افسوس آج 28 سال بعد بھی اس چند گھڑیوں پر مشتمل مجلس میں جو بے شمار مسائل زیر بحث آ رہے تھے۔ وہیں کھڑے ہیں۔ اگر دیانت داری سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس مجلس میں جن عزائم کا علامہ نے اظہار کیا تھا، ان کے بعد آنے والی کسی جماعت نے بھی اس کو زادراہ کے طور پر نہیں لیا۔ حالانکہ وسائل کی کئی گنا زیادہ آسانی ہے۔ علماء کی فراوانی ہے۔ تحقیق اور بحث کے مراحل کہیں آسان ہو چکے ہیں اور اہل حدیث کی درجن بھر جماعتیں آفاقی کردار تو کیا ادا کریں گی اپنی ذاتی اغراض سے باہر نکلنے کو ہی تیار نہیں۔ (ا۔ب۔ق)

جمہوریت کی بحث

اس ضمنی بحث کو جس بات نے زندگی کی حاصل زندگی ساعتوں میں سے ایک بہترین ساعت بنا دیا، وہ مباحثہ کا ہم شکل ایک دلچسپ اور نہایت درجہ اہم ایک مذاکرہ تھا جو ملک کے اندر مغربی جمہوری نظام کو قبول کر لینے یا قبول نہ کرنے کے مسئلہ پر زینت محفل بنا۔

اس مذاکرہ کے لیے پہلے سے کوئی پلان تو طے نہیں تھا مگر جب بات چلی تو یہ گفتگو کسی بڑی سے بڑی بامنصوبہ گفتگو پر کہیں فائق تھی۔ اس گفتگو کے فریقین میں ایک فریق تو خود حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم ہی تھے جو اس بات کے حق میں تھے کہ بحالات موجودہ ہمیں یہ نظام قبول کر لینا چاہیے۔ ان کے فریق ثانی جماعت اہل حدیث کے ہی ایک عظیم عالم دین اور مفتی حضرت مولانا حافظ عبدالسلام بھٹوی [1] تھے جو گوجرانوالہ میں جماعت کی سب سے بڑی درس گاہ میں استاذ کے مرتبہ پر فائز ہیں۔

مولانا کے نزدیک یہ نظام کسی درجہ میں اور کسی حال میں بھی قبول کرنے کے لائق نہیں ہے اور اسلام کے مزاج میں اس کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

اس فکری و نظری گفتگو کی حدود بھی فریقین گفتگو کے فکر و نظر کی طرح ہی نہایت وسیع اور آفاقیت کی حامل تھی۔ اس مذاکرہ کا حقیقی لطف تو صرف وہی حضرات حاصل کر سکے جنھوں نے اس مذاکرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا تاہم دوسروں کے لیے بھی میری کوشش یہی ہوگی کہ فریقین مذاکرہ کے اسلوب بحث، انداز گفتگو، دلائل کے مبادلہ، گفتگو کے نشیب و فراز اور فریقین بحث کے مزاجوں کا اتار چڑھاؤ اپنی حد تک کسی کوتاہی کی نذر نہ ہونے دوں۔

---

[1] مفسر قرآن حضرت حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ آج کل جماعۃ الدعوۃ میں شامل ہیں۔ جماعت الدعوۃ ابتداء میں جمہوریت کی شدید مخالف تھی۔ مگر خوش آئند بات ہے کہ سوائے الیکشن میں حصہ لینے کے تمام جمہوری روایات کو قبول کر چکی ہے۔ (ا۔ب۔ق)

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے جب نظریہ ضرورت کے ماتحت اس نظام کو اپنا لیا[1] تو اس کا سخت ردعمل سامنے آیا اور اہل حدیث کے بہت سے حلقوں میں علامہ مرحوم کی اس سوچ پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ آج کی اس محفل میں بھی علامہ مرحوم اپنے اس موقف کی وضاحت کر رہے تھے اور یہاں بھی انہیں اسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

جبکہ علامہ مرحوم نے ایک راہ تجویز کر لی تھی اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ دوسرے لوگ ان کے موقف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ کی ایک موثر اور نہایت درجہ کارفرما شخصیت کے زیر اثر ان کی حمایت میں بھی ایک مضبوط حلقہ پیدا ہو چکا تھا اور بلاشبہ وہ اپنے مؤقف کی حمایت میں دلائل کا ایک انبار بھی اپنے دامانِ فکر میں موجود رکھتے تھے۔

علامہ رحمہ اللہ نے ملک کے اندر مستقبل قریب میں منعقد ہونے والے عام انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کی بات اٹھائی اور اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کرنے لگے تا کہ وہ مجلس کے اندر موجود علماء کو اپنی سوچ کے ساتھ ہموار کر سکیں اور انہیں آنے والے انتخابات میں بھرپور حصہ لینے پر آمادہ کریں۔ علامہ مرحوم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں اپنی ملی اور مسلکی ضرورت سے ان انتخابات میں حصہ لینا چاہیے اور اگر ہم انتخابات کو محض اس لیے مسترد کر دیں گے کہ ان کا انعقاد مغربی جمہوری طریقہ کے مطابق ہو رہا ہے تو ہم خود بھی ملک کے اندر مسترد ہو کر رہ جائیں گے۔ علامہ نے کہا کہ ہمیں ملک کے اندر زندہ رہنا ہے اور ہمیں اپنی زندگی کے لیے اسی راستہ کو اختیار کرنا چاہیے جسے آج کے ماحول میں زندہ رکھنے کے لیے تجویز کیا گیا ہے اور جس کے بغیر کسی

[1] حضرت مولانا عبدالرحمٰن خلیق رحمہ اللہ کا یہ نکتہ نظر محل نظر ہے کہ علامہ نے اس نظام کو اپنا لیا۔ بعد احترام ان سے اختلاف کرنے کی جسارت کروں گا۔ علامہ شہید سے پہلے مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل سلفی، اور حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہم اللہ سب ہی اس نظام کے موید تھے۔ مرکزی جمعیت کے باقاعدہ انتخابات ہوتے تھے اور ملکی انتخابات میں بھی مرکزی جمعیت حصہ لیتی تھی جب علامہ ابھی طالب علم تھے۔ (ا۔ب۔ق)

آبرومندانہ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ رحمہ اللہ کی تقریر اپنے معمول کے مطابق اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی کہ مولانا بھٹوی حفظہ اللہ نے مداخلت کی اور فرمایا:

''اس جمہوری نظام کا جسے آپ نے اختیار کر لیا ہے اور جسے آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اختیار کر لیں، اسلام کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس مغربی جمہوری نظام کے ہاں حق کا معیار صرف اکثریت ہے اور حق وہی ہے جسے اکثریت نے اختیار کر لیا ہو جبکہ اسلام کے نزدیک حق کا معیار صرف حق ہی ہے۔ اکثریت یا اقلیت کی یہاں کوئی بحث نہیں ہے۔ جمہوری نظام کے ماتحت اکثریت خواہ کیسی بھی ہو ظالم ہو فاسق ہو، بے انصاف ہو، برسرحق ہی سمجھی جاتی ہے اور اقلیت خواہ فرشتگان مقربین پر بھی مشتمل ہو، اسے ناحق قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔

''اس لیے ہم ایک ایسے نظام کو کیونکر قبول کر سکتے ہیں جو ہمیں اسلام سے دور لے جاتا ہے اور جس کا قولاً یا فعلاً کسی اعتبار سے بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

جنگ مغلوبہ

علامہ مرحوم نے لوٹ کر ایک بار اپنے موقف کی پھر وضاحت کی اور مولانا سے مخاطب ہو کر کہا کہ مولانا! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میری بات کو سنے بغیر ہی بات شروع کر دی آپ اگر میری بات کو توجہ سے سن لیتے تو میری بات آپ کی فہم سے بالا نہیں تھی۔ اس کے جواب میں مولانا بھٹوی نے بھی اپنے موقف کی مزید وضاحت کی اور فرمایا علامہ صاحب! اگر ہم نے اس جمہوری نظام کو قبول کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی پوری رضامندی سے ملک بھر کے فساق و فجار کو اپنی گردنوں پر سوار کر لینے پر آمادہ ہیں اور اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم ان لوگوں کے اعمال بد کی ذمہ داری سے کیونکہ بچ

سکیں گے اور کس منہ سے ان کو ان کے اعمال شنیعہ سے باز رکھنے کی جسارت کریں گے جبکہ ہم ان کے اطوار بد کے بارے میں پہلے ہی سب کچھ جانتے تھے۔

پھر اس کے بعد دلائل کی جنگ مغلوبہ جاری ہوگئی اور دلائل دلائل سے یوں گتھم گتھا ہو گئے کہ مجھے پنجابی کا بڑا ہی حسب حال شعر یاد آ گیا، آپ بھی سنیے اور لطف اٹھایئے۔

اوہ جٹ پئے دو ویں سورے کون جتے ہارے
اوہ مارن مٹ ودان وانگ ہو پہاں بھارے [1]

اس بحث کا سب سے دل چسپ پہلو حضرت علامہ مرحوم اور حضرت مولانا بھٹوی کی عمروں اور مزاجوں کا تفاوت تھا جبکہ ایک طرف دلائل پر جوانی کے گہرے سائے پڑ رہے تھے اور دوسری طرف دلائل کی اٹھان میں بڑھاپے کے اثرات نمایاں تھے۔

علامہ اور مولانا

حضرت مولانا بھٹوی ملک کی ایک عظیم علمی درس گاہ [2] کے استاذ تھے اور حضرت علامہ مرحوم ایک عظیم ملک کی ایک عظیم جماعت کے عظیم قائد اور عظیم لیڈر تھے اور دونوں کی گفتگو میں، گفتگو کے اسلوب میں وہ فرق نمایاں تھا جو ایک استاذ اور ایک لیڈر کی گفتگو اور گفتگو کے اسلوب میں ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بڑی ہی بہار آفریں محفل تھی جس سے حاضرین میں سے ہر شخص فریقین بحث کی گفتگو کے ہر رخ سے ہی لطف اٹھا رہا تھا۔

اس مجلس میں موجود سارے ہی اہل علم حضرات ان آداب سے بہرہ ور اور ان صلاحیتوں سے مالا مال تھے جو اس بحث میں شریک ہونے کے لیے شرط اول ہیں مگر آج

---

[1] علامہ کی شخصیت کا رعب داب ایسا ہی تھا۔ وگرنہ چھیالیس سال کی عمر میں بڑھاپے کے آثار کہاں ہوتے ہیں نہ ہی علامہ پہ تھے۔

[2] جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ تب مولانا عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ یہاں مدرس تھے۔ البتہ ان دنوں جماعت الدعوۃ کے مرکز میں (جو کہ مریدکے کے نواح میں ہے) پڑھا رہے ہیں۔

ان سب لوگوں نے کچھ کہنے کی بجائے سننے اور لطف پانے کا ہی فیصلہ کر لیا تھا اور یہ سب لوگ علامہ مرحوم کی باری ان کے خطاب سے لذت یاب ہوتے اور مولانا کی باری پر ان سے حظ اٹھاتے تھے۔

حضرت علامہ کی گفتگو میں شوکت کے وہ تمام پہلو موجود تھے جو ان کی تقریر کا خاصہ ہیں اور حضرت مولانا اس مجلس کے اندر بھی مدرسہ کے ماحول کو ترک نہ کر سکے تھے۔ نپی تلی بات کرتے اور اپنی بات کو جلد ختم کر دیتے جبکہ علامہ مرحوم کی بات ہر بار ہی خطاب کی سرحدوں کو چھونے لگتی تھی۔

علامہ گرجتے تو اہل مجلس کا شوق سماعت بھی اچھل پھلانگ کر ان کی سطح تک جا پہنچتا اور مولانا چٹکی لیتے تو حاضرین بھی نیچے کی منزل پر آ کر ان کی چٹکی سے لطف پاتے۔

کوئی لطف سا لطف تھا...... ایسے اجتماعات کبھی قسمت سے ہی نصیب ہوتے ہیں جن میں گزرنے والے ہر لمحے پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

دلچسپ نوک جھونک

علامہ مرحوم اپنی خطابت کے تمام تر آداب کے ساتھ فرما رہے تھے کہ اگر ہم نے اس موجودہ انتخابی نظام کی راہ میں حکومت پر قبضہ کرنے کی بنیاد نہ رکھ دی تو ہم سخت بے شعور اور احمق ثابت ہوں گے اور ہماری یہ روش ہماری مکمل بدنصیبی پر منتج ہو گی۔

اور اگر ہم یہاں پاکستان میں اسلام کا آئین نافذ کرنا چاہتے ہیں تو یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم ملک کے قانون ساز اداروں میں پہنچیں کیونکہ اب یہاں اسلام باہر رہ کر نافذ نہیں ہو گا۔ بلکہ ان اداروں کے ذریعے اندر کی راہ سے نافذ ہو گا۔

آپ لوگ تو تحریک نفاذ اسلام کے علمبردار ہیں اگر اس مرحلہ پر اپنی غلط سوچ پر

بضد رہے تو پھر یہ قانونی ادارے بہرحال اپنی گنتی پوری کریں گے اور جتنے جتنے ارکان جس جس ادارہ سے خاص کیے گئے ہیں وہ بہرحال وہاں پہنچیں گے اور پھر اسلام والی کوئی بات آپ یہاں نہیں دیکھ سکیں گے پھر آپ ملک کے اندر وہی کچھ دیکھیں گے جو قانون ساز اداروں پر قبضہ کر چکنے والے لوگوں کی مرضی ہوگی۔

یقین کیجیے آپ محض جذبات [1] سے کھیل رہے ہیں اور حقائق کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہے ہیں۔ پس یاد رکھیے کہ آپ اپنے جذبات کے ذریعے اس سیاسی عمل کو تو جو ان جمہوری اداروں کی راہ سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کسی طرح بھی روک نہیں سکیں گے مگر آپ کی گاڑی ضرور پٹری سے اتر جائے گی۔

پس اگر آپ نے نوشتہ دیوار نہ پڑھا اور اپنی ضد پر قائم رہے اور اس نظام کو تھوک دیا جس پر پاکستان کے مستقبل کی بنیاد استوار ہوگی تو میری یہ بات پلے باندھ لیجیے اور میں پھر اپنی بات کو دہراتا ہوں کہ آپ اپنی ضد سے جمہوریت کی راہ ہرگز نہیں روک سکیں گے مگر آپ کی کوتاہ اندیشی سے اس اسلام اور قرآن پر اس ملک کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے، جسے آپ اس ملک میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

خوب ہی یاد رکھ لیجیے کہ اس ملک کے اندر اسلام اور قرآن کے نفاذ کا ذریعہ آج صرف یہی اسمبلیاں اور یہی قانونی ادارے ہیں اور جب تک ہم موجودہ غیر اسلامی صورت حال سے دو چار رہنے کے لیے مجبور ہیں، آگے بڑھنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ اگر آپ نے اس راستہ کو اختیار نہ کیا تو زندگی کی آبرومندیاں آپ سے ٹھیک

---

[1] حضرت علامہ کی بات آج چھبیس سال بعد کیسے سچ ثابت ہوئی کہ جن اصحاب کی ''سیاست'' کا آغاز اور مدار جمہوریت کو کفر کہنے پر تھا آج مکمل جمہوریت کے رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ محترم حافظ محمد سعید صاحب نے ٹی وی چینل جیو میں سہیل وڑائچ کے پروگرام ''ایک دن جیو کے ساتھ'' میں اپنے سابقہ موقف کی مکمل نفی کر دی ہے اور فرمایا ہے کہ میں قطعاً جمہوریت کو کفر نہیں کہتا۔

ایسے ہی منہ پھیرلیں گی جس طرح آپ آج کی سیاست سے منہ پھیر رہے ہیں۔ [1]

مولانا بھٹوی صاحب نے اس مرحلہ پر پھر مداخلت کی اور ایک آیہ قرآنی سے علامہ مرحوم کے سلسلہ گفتگو کو معطل کر دیا۔

علامہ رحمہ اللہ مولانا کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا اس آیہ مبارکہ سے آگے پڑھیے۔ مولانا نے اگلا حصہ بھی پڑھ دیا۔ علامہ نے کہا اور آگے پڑھیے۔ مولانا بھی بفضل خدا حافظ قرآن تھے، انہوں نے اگلی آیت بھی تلاوت کر دی۔

علامہ مرحوم نے مزید زور دے کر کہا اور آگے پڑھیے۔ انہوں نے اگلی آیت بھی پڑھ دی۔ علامہ نے فرمایا اور آگے!

اس پر مولانا نے بے ساختہ کہا آگے تو پورا قرآن پڑا ہے، کہاں تک پڑھتا جاؤں؟

مولانا کے اس بے ساختہ معصوم جواب پر محفل کشت زعفران بن گئی۔ حضرت علامہ رحمہ اللہ نے اپنی بات جاری رکھی اور فرمایا اگر آپ یہاں کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو میری بات ماننا ہوگی اور یہاں پہنچ کر علامہ مرحوم کی بات میں کافی زور کے علاوہ کافی بلندی بھی آ گئی۔ علامہ کہہ رہے تھے:

”اگر آپ نے وقت کی رفتار کو نہ پہچانا اور وقت کے مطالبہ پر کان نہ رکھا تو

[1] جمہوریت کے حوالے سے علامہ کا یہ انداز فکر تھا۔ یقیناً اختلاف ہر کسی کا حق ہے۔ اپنے اسی حق کو مولانا عبدالسلام بھٹوی نے استعمال کیا۔ لیکن دل چسپ امر یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ جمہوری نظام اور اس کی خوبیاں کہیں یا خرابیاں کہیں، ماسوائے انتخابی عمل کے، ساری کی ساری مولانا بھٹوی کی موجودہ جماعت نے قبول کر لی ہیں۔

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

مولانا جماعت الدعوۃ کے مرکزی راہنما ہیں۔ گزرے وقت کی بات ہے کہ جماعت الدعوۃ پاکستان کے جمہوری نظام کی سخت ناقد تھی اور اس نظام کی مبینہ برائیوں مثلاً تصویر بازی، نعرے بازی اور نہ جانے کون کون سی ”بازیاں“ جن پر ان کی ذوالفقار حیدری مستقل بے نیام رہتی اور جلوس، ریلیاں میڈیا سب شجر ممنوعہ تھے۔ اس کے باوجود ہم تو خوش ہیں کہ خاموشی سے ہی یوٹرن تو لیا گیا ہے۔ اعلانیہ رجوع نہ سہی۔ کام تو وہی کر رہے ہیں جو کبھی صرف ہمارے نامہ سیاہ میں تھے اور مجھے تو ذاتی طور پر اس کی بھی خوشی ہوتی ہے کہ جماعت الدعوۃ کے احباب جمہوری مزاج رکھتے ہیں جیسے یہ کہ میری تحریر پڑھ کر ”انجوائے“ کریں گے یا دفاع کریں گے۔ بدتہذیبی پر نہیں اتر آئیں گے۔

وقت آگے نکل جائے گا، آپ کا انتظار نہیں کرے گا اور ایسی صورت میں آپ یہاں اچھوت بن کر رہ جائیں گے۔''

ان الفاظ کے ساتھ علامہ مرحوم کی آواز میں زیادہ شدت آ گئی اور ان کے اسلوب بیان کی روایت کے مطابق ان کی یہ گفتگو گونج گرج کے سانچے میں ڈھلنے لگی۔

مولانا بھٹوی نے با آہستگی کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری پیش کردہ آیہ قرآنی کے جواب میں اسی سطح کی کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے آپ مجھے اپنی آواز کے دھماکوں سے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔

مجلس ایک بار پھر خوبصورت قہقہوں میں ڈوب گئی۔ علامہ مرحوم نے مولانا کو مخاطب کر کے فرمایا۔

مولانا! یہ بدقسمتی ہے کہ میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی مگر دوسرے لوگ میری یہ بات سنتے بھی ہیں، سمجھتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں۔

مولانا نے پھر ایک چٹکی لی کہ لوگ آپ کی صلاحیتوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کی صلاحیتوں سے مجھے بھی انکار نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ جس امر کی تلقین کرتے ہیں، وہ بھی عین حق ہی ہے اور مجھے اب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ آپ جس جمہوری نظام کو قبول کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں، یہ بہر حال اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ کہنا چاہیے کہ اسلام کی راہ اور ہے، اور اس جمہوری نظام کا راستہ دوسرا ہے۔

علامہ مرحوم نے مولانا کے جواب میں اپنے موقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا تو آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ جس قانون کے تحت یہ انتخابات ہو رہے ہیں یا ہوں گے یہ اسلام اور قرآن کا قانون نہیں ہے مگر یہاں سوال اس قانون کے تحت بننے والی اسمبلیوں کا نہیں بلکہ ان لوگوں کے گرد گھومتا ہے جو اس قانون کے تحت منتخب ہو کر

آئیں گے اور میرا کہنا یہ ہے کہ اگر آپ نے ان لوگوں کو وہاں تک پہنچ جانے کا کھلا موقع دے دیا جن کی نہ سوچ اسلامی ہے نہ ان کو اسلام کے نظام حیات سے ہی کوئی دلچسپی ہے نہ وہ اسلام اور قرآن کے نفاذ کو اپنی زندگی کے لیل و نہار سے ہی مطابق پاتے ہیں اور نہ وہ قوانین اسلام کو اپنی زندگی کا معیار بنانا ہی پسند کرتے ہیں تو آپ ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کریں گے جس کی تلافی پھر آپ سے کبھی نہیں ہو سکے گی اور پھر آپ کو ملک کے اندر انہی کی پسند کو پسند کرنا ہو گا۔

لیکن اگر آپ نے اپنے علم کے ساتھ ساتھ اپنی عقل کا مشورہ بھی حاصل کیا اور حالات کا بروقت اندازہ کر لیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ آپ اپنی اس منزل کو پا سکیں گے جس پر پہنچنے کے لیے آپ دن رات بے چین ہیں۔

آپ اگر لادین عناصر کے ہاتھ سے بازی چھین لینا چاہتے ہیں تو کچھ عرصہ کے لیے اپنے سینہ پر جمہوریت کے پتھر کو گوارا کر لیجیے کہ اس وقت آپ کے لیے بہترین مشورہ یہی ہے۔

مزید فرمایا آپ یقین کر لیجیے کہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔

مولانا بھٹوی صاحب نے بات کو روکتے ہوئے ایک بڑا ہی خوبصورت جملہ کہا کہ ”علامہ صاحب! سوال آپ کے فیصلہ کا نہیں بلکہ سوال قرآن وسنت کے فیصلے کا ہے۔“

اور مولانا کے اس جملہ پر حاضرین کے ساتھ ساتھ خود علامہ مرحوم بھی بہت محظوظ ہوئے۔ علامہ مرحوم کی تقریر جاری تھی، وہ فرما رہے تھے۔

مولانا! اگر آپ اپنی عقل کو بھی اپنے علم کے ساتھ رفاقت کی اجازت دے سکیں تو بات با آسانی آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہے مگر افسوس ہے کہ آپ نے سارا بوجھ اپنے علم پر ہی ڈال رکھا ہے، عقل سے بالکل استفادہ نہیں کرتے۔

علامہ مرحوم کہنے کو تو یہ بات کہہ گئے مگر انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ان سے

تجاوز ہوا ہے۔ وہ میزبان ہیں اور مولانا مہمان۔

پس علامہ مرحوم نے اپنی بات کا رخ بدل دیا۔ اب ان کے لہجہ میں ملال کا عنصر بھی شامل تھا اور عذر خواہی بھی۔ علامہ مرحوم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

مولانا! آپ نہیں جانتے کہ آپ کی جمعیت حکومت پاکستان کے لیے کس حد تک مسئلہ بن چکی ہے۔ یہاں بڑی بڑی صاحب ادعا جماعتیں موجود ہیں مگر حکومت نے ان کی کبھی پروا نہیں کی جبکہ جمعیت اہل حدیث کے ٹمپریچر کا اندازہ کرتے رہنے سے حکومت کبھی غافل نہیں رہی اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی قوی سبب ہی ہے۔ آپ کی جماعت سے حکومت خائف بھی ہے اور مرعوب بھی۔ اس کی وجہ صرف آپ کی کارگزاری اور آپ کی سوچ کا نکھرا ہوا صاف ستھرا اور مثبت رخ ہے اور آپ کے عزائم کا شکوہ مزاجوں کا استقلال فیصلوں میں استحکام اور ان کی جلالت قدر ہے۔

وزیر اعظم جونیجو

اس مرحلہ پر پہنچ کر علامہ مرحوم نے بتایا کہ یہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا ہی اثر ہے کہ حکومت کے لیے کسی اقدام سے قبل آپ کے مزاج کا اندازہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ شب وزیر اعظم جونیجو لاہور آئے اور ان کی آمد کا جو مقصد ظاہر کیا گیا، وہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ملاقات تھی مگر مولانا سے ملاقات کرنے سے قبل رات کے بارہ بجے وہ یہاں میری قیام گاہ پر پہنچے تھے [1] اور نصف گھنٹہ تک حالات حاضرہ پر مجھ سے تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ مجھے نہ ان سے کوئی دوستانہ مراسم تھے نہ کوئی رشتہ داری ان سے قائم تھی۔ وہ مجھے محض اس لیے ملنے آئے تھے کہ میں ملک کی ایک مضبوط اور مستحکم جماعت کا ناظم اعلیٰ ہوں اور وہ اس

[1] افسوس آج یہ تیس سال بعد اہل حدیث کی ساری جماعتیں مل کر بھی اس قوت و طاقت کو حاصل نہیں کر پا رہی کہ وزیر اعظم ان کی چوکھٹ پر حاضری دے۔

جماعت کی فعالیت سے آگاہ تھے۔

حکومت جانتی ہے کہ یہ لوگ جرات مندی سے فیصلے کرتے ہیں۔ پھر ان پر قائم رہتے ہیں اور اپنے فیصلوں پر عمل کرتے ہیں۔ جمعیت اہل حدیث کو اس وقت ملک کے اندر جو پوزیشن حاصل ہے، اسے اپوزیشن والے بھی جانتے ہیں اور حکومت بھی اس سے آگاہ ہے اور ان حالات میں جب آپ کے پاس ایک میدان موجود ہے تو ہمیں یہاں اسلام کو نافذ کر سکنے کے کسی ذریعہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور آج یہ جمہوری نظام بھی ان ذرائع میں سے ایک بڑا ذریعہ ہے۔ ہمیں اپنی سوچ کی راہیں نئے حالات میں نئی بنیادوں پر متعین کرنے کی مجبوری قبول کر لینی چاہیے اور ہم اس دور کو عبوری دور قرار دے کر اس دور سے منزل پر پہنچنے کے ذریعے کو اگر کسی عارضی عرصہ کے لیے حاصل کر لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر یہ جمہوریت کسی لادینی اور الحاد سے ہی عبارت ہے تو بھی ہمیں جمہوریت کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کو اپنی مرضی کے تابع بنا لینے کی سعی کرنی چاہیے لیکن اگر ہماری غفلت سے اس گھوڑے پر دوسرے لوگ سوار ہوں گے اور وہ اپنے اس گھوڑے کی ٹاپوں سے ہمیں کچل کر رکھ دیں گے اور میں اپنی اس سوچ پر اس لیے زور دیتا ہوں کہ پاکستان میں اس راہ کو اختیار کیے بغیر کامیاب زندگی گزارنے کی کوئی دوسری متبادل راہ موجود ہی نہیں ہے۔ اگر آپ نے یہ موقع کھو دیا تو پھر سوائے پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

آخری نکتۂ بحث

وقت بہت گزر چکا تھا اور شرکاء مجلس میں سے بعض احباب کا سفر بھی دور کا تھا۔ اس لیے اب بحث کو سمیٹنے کی مجبوری تھی۔ بنا بریں مولانا بھٹوی صاحب کا یہ نکتہ بحث آخری نکتہ بحث ہی تھا۔ جب مولانا نے سوال اٹھایا کہ

فرض کیجیے آپ اس نظام کو نظریہ ضرورت کے تحت اختیار کر لیتے ہیں اور ہم یہ بھی

مان لیتے ہیں کہ آپ اپنی ہمت سے قانون ساز اداروں کے لیے اپنے پانچ دس ارکان بھی منتخب کرا لیتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے یہ پانچ یا دس ارکان تین چار سو اراکین پر مشتمل مخالف مسلک ارکان کے ایوان میں آپ کے لیے کیونکر کوئی اچھی خبر پیدا کر سکتے ہیں جبکہ اس نظام کے تحت ؏

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

علامہ مرحوم کا جواب

علامہ مرحوم نے حضرت بھٹوی کے نکتہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا، اول تو ہمارے اراکین کی تعداد اتنی قلیل نہیں ہو گی [1] کہ وہ ایوان میں کسی غریب الوطن کی حیثیت سے پہچانے جائیں لیکن اگر ہماری تعداد ایوان کے اندر قلیل بھی ہوئی تب بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ اقلیت ایوان کی کسی بڑی سے بڑی طاقتور اکثریت کو اپنی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی چلنے نہیں دے گی۔ انشاء اللہ

آپ صرف وہاں پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ خود حکومت بھی اپنے تمام تر شکوہ کے باوجود آپ کو کسی مرحلہ پر نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ آپ بلاشبہ اقلیت میں ہوں گے لیکن اکثریت ہمیشہ آپ کی محتاج رہے گی اور آپ کو پوچھ کر چلنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پائے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ آپ وہاں اقلیت میں ہوں گے مگر آپ کی یہ اقلیت پورے ملک کے قانون ساز اداروں میں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر جگہ ہی حاکم ہو گی اور حاکم کی حیثیت سے ہی اپنی مرضی چلائے گی۔

آپ وہاں صرف اس جماعت کی حمایت کریں گے جو آپ کے اور آپ کے لیے احترام پیش کر سکے گی اور پھر وہ جس پلڑے میں اپنا قدم رکھے گی وہی پلڑا بھاری ہو گا

[1] علامہ کا یہ خواب ان کی بلند ہمتی کی دلیل تھا۔ جو ان کے بعد ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

اور وہاں کی ہر حکومت اور ہر جماعت آپ سے یہی چاہے گی کہ آپ اس کی حمایت کریں اور پھر آپ اپنی اس حمایت کے عوض قرآن وسنت کے جس جس صفحہ پر بھی اپنی حلیف طاقت سے دستخط طلب کریں گے، اسے اس سے انکار نہیں ہوگا۔ وہاں کے سب لوگ آپ کے در کے بھکاری ہوں گے۔ [1]

بلاشبہ قرآن وسنت کی منزل تک پہنچنے کے لیے یہ راہ بڑی طویل ہے لیکن اگر کوئی بااختیار شخص اپنے اختیار کو کام میں نہ لائے اور قرآن قرآن پکارنے کے باوجود قرآن سے انحراف جاری رکھے، اسلام کے نفاذ کے نام پر اسلام کا حلیہ بگاڑے، اسلام سے استہزاء کرے تو ظاہر ہے کہ پھر بامر مجبوری یہ طویل راستہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ علامہ نے کہا میں پھر کہتا ہوں کہ میں اس جمہوریت کو اسلام نہیں سمجھتا اور اس جمہوری نظام کو کتاب وسنت قرار نہیں دیتا مگر میری سوچ مجھے یہی بتلاتی ہے کہ ہم اسلام کو یہاں اب اس جمہوریت اور اس جمہوری نظام کے ذریعے ہی حاکم بنا سکتے ہیں اور بحالات موجودہ اسلام کے یہاں داخلہ کی کوئی دوسری راہ موجود نہیں ہے۔ ۱۱ بجے دوپہر سے اب سہ پہر کے چار بجے تھے۔ پانچ گھنٹے کی اس طویل نشست میں صرف کھانے کا مختصر سا وقفہ آیا تھا۔ کام کی زیادتی اور وقت کی کمی کے سبب ظہر اور عصر کی نمازوں کو یکجا کر لیا گیا تھا۔ چار بجے کے بعد اہل مجلس اگلے مہینے کے اجتماع میں شرکت کا شوق لے کر اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ مگر آہ یہ شوق پھر ناتمام ہی رہا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے جو تاریخ مقرر کی گئی تھی، وہ پھر کبھی نہ آ سکی۔

---

[1] موجودہ حالات میں مولانا فضل الرحمٰن یا ایم کیو ایم کے آٹھ دس افراد جو اسمبلی میں ہوتے ہیں علامہ کی اس دلیل کا ثبوت ہیں اگرچہ مولانا فضل الرحمٰن کے مقاصد اپنی اس طاقت کے باوجود نہایت محدود ہوتے ہیں۔ جو عموماً ذاتی دائرے میں رہتے ہیں۔

شریعت بل

حکمران اپنی حکومتوں کو طول دینے کے لیے اور عوام کو مصروف رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی ڈرامہ رچائے رکھتے ہیں۔ ہم تو ہیں ہی تیسری دنیا کے باشندے، یہاں کے تو جمہوری حکمران بھی ان چیزوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کو تو مزید ضرورت ہوتی ہے کہ اب عوام کے لیے کیا نئی مصروفیت نکالی جائے۔ آپ یاد کر سکتے ہیں عید میلاد النبی کی موجودہ شکل وصورت کو رواج جنرل ضیاء کے دور میں ہی ملا۔ پھر 14 اگست کو اس طرح منانے کا جیسے اب منائی جاتی ہے کہ ہر طرف جھنڈے لگانے، چراغاں کرنا اور ایک طوفان بدتمیزی بپا کرنا، اس کی سعادت بھی امیر المومنین ضیاء الحق کو حاصل ہوئی۔ کرکٹ کا اس حد تک فروغ کہ ساری قوم میچ کے روز ہر کام چھوڑ دے، جنرل ضیاء کے دور کا تحفہ ہے۔ بسنت کی بے حیائی کی حد تک پذیرائی جنرل مشرف کی مہربانی رہی۔

اسی طرح کا ایک شوشہ جنرل ضیاء الحق کا شریعت بل تھا۔ شاید جنرل ضیاء کو احساس ہو گیا تھا کہ نو برس ہو گئے، اسلام کے نام کو کافی استعمال کر لیا ہے۔ اب کوئی ایسا اقدام کر لیا جائے کہ لوگوں کو اسلام نظر بھی آئے۔ اس بات کو کہ جنرل ضیاء کا اسلام سے کتنا تعلق تھا، آپ یوں سمجھ لیں کہ جتنا ذوالفقار علی بھٹو کا سوشلزم سے تعلق تھا۔ وہ بھی

سوشلزم کا نام اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ورنہ اسلامی سوشلزم سے زیادہ مزاحیہ اصطلاح سیاست میں کبھی رائج ہوئی ہے؟۔ جنرل ضیاء کے ایما پر جماعت اسلامی اور جنرل ضیاء الحق کی حامی چند مذہبی جماعتوں نے اسمبلی میں یہ بل پیش کیا۔ اسمبلی میں جو بل پیش کیے جاتے ہیں، ان کے قانون بننے کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ پہلے اسمبلی میں بل پیش ہوتا ہے پھر سینٹ میں۔ اگر وہاں مسترد ہو تو دوبارہ اسمبلی میں پیش کیا جاتا ہے پھر وہاں سے سینٹ میں۔ خیر یہ ایک لمبا کھیل ہے، اس کو چھوڑیں، شریعت بل اسمبلی میں پیش کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسمبلی سے باہر اور اخبارات میں اس پر بحث کا آغاز ہو گیا۔ غیر جماعتی الیکشن کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی ان اسمبلیوں کی اکثریت نمائندے ہونے کے باوجود غیر نمائندہ شمار کی جاتی تھی۔ اب تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر کی جمعیت اہل حدیث، مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام، شاہ احمد نورانی کی جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ اس بل کے خلاف جماعتیں تھیں۔ اس کے علاوہ لبرل افراد اور جماعتیں تو قدرتی طور پر اپنے مذہب گریز رجحانات کی بنا پر اس بل کے خلاف تھیں۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ دکھ سب کے اپنے اپنے تھے، لیکن اس بل کے خلاف اکٹھے ہو گئے۔ دوسری طرف بل کی حمایت میں پیش پیش جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام (قاضی عبداللطیف گروپ) ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی، مرکزی جمعیت اہل حدیث میاں فضل حق گروپ تھے۔

اسمبلی سے باہر علامہ احسان الٰہی ظہیر کی آواز اس بل کی مخالفت میں سب سے توانا تھی اور آپ کی آواز سے اس بل کے مخالف حوصلہ پاتے تھے۔ تحرک اور قوت عمل تو آپ میں ویسے ہی بہت زیادہ تھی، پرجوش زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ اس لیے چند روز میں پورے ملک میں آپ نے ایسا ماحول بنا دیا کہ جماعت اسلامی اور اس بل کے دوسرے محرکین جو جنرل ضیاء الحق کو امیر المومنین بنانے چلے تھے، ان کو دفاعی پوزیشن

میں آنا پڑا۔ اہل حدیث حضرات میں سے بھی بعض سادہ طبیعت بزرگ اس بل کے حامی تھے۔ جبکہ مرکزی جمعیت اہل حدیث (میاں فضل حق گروپ) تو شاید علامہ کی مخالفت کی وجہ سے اس بل کا حامی ہو گیا ورنہ اس گروپ کا ''وزن'' کہاں ایسا تھا کہ حمایت کرے یا مخالفت۔

علامہ شہید کے جوش اور جذبات کا اندازہ آپ اس واقعہ سے کر سکتے ہیں۔ مدرسہ تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ لاہور پر شریعت بل کے حامی اہل حدیث علماء نے اس پر غور وخوض کرنے کے لیے علمائے کرام کا ایک اجلاس بلایا۔ حیرانی کی بات ہے اس اجلاس میں ایسے بزرگ بھی شریک تھے کہ جو ویسے تو جمہوریت کو کفر کہتے ہیں لیکن جنرل ضیاء الحق کی قائم کردہ ''جمہوریت'' اور اس کی اسمبلی کے ذریعے نافذ کردہ ''شریعت'' کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ یعنی ''نفاذ شریعت بذریعہ کفر''

این چہ بو العجبی است

اب اس اجلاس کی انتظامیہ نے علامہ احسان الٰہی ظہیر کو دعوت نہ دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شریعت بل کے سب سے بڑے مخالف (جو آپ کے مسلک کا ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بلاشک وشبہ سب سے بڑا راہنما اور نمائندہ بھی تھا) کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ یا ممکن ہے ان کو علامہ احسان الٰہی ظہیر کا ''علم'' نہ ہو کہ یہ بندہ بھی لاہور میں رہتا ہے۔ اب ہوا یوں کہ اجلاس کی کارروائی جاری تھی۔ میرے والد بھی اس میں شریک تھے کہ ایک دم سے ماحول متحرک سا ہو گیا۔ کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر خود ہی تشریف لے آئے ہیں۔ حافظ صلاح الدین یوسف اسٹیج سیکرٹری تھے۔ آپ آئے اور سیدھے ڈائس پر چلے گئے۔ حافظ صاحب کو آرام سے پیچھے ہٹایا اور مائیک سنبھال لیا اور بہت عمدہ طریقے سے شریعت بل پر اپنا موقف پیش کیا۔ آپ کی آمد اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھی کہ کسی کو مزاحمت کا موقع ہی نہ ملا۔ میں بھی وہاں

موجود تھا۔ کاش اس روز مجلس شوریٰ کے اجلاس کی طرح ہم کو خبر ہوتی۔ آپ کے پاؤں میں بیٹھ کر وہ تقریر ریکارڈ کر لیتا۔

ان دنوں ٹی وی چینلز کا سیلاب نہیں آیا تھا۔ صرف ایک سرکاری ٹی وی ہوتا تھا جس پر سرکار کی خبریں ہوتی تھیں۔ اختلاف کی کہاں گنجائش۔ اب لے دے کے اخبار ہی رہ جاتے تھے ورنہ تو لوگ دم گھٹ کر مر جاتے۔

ان ہی دنوں روزنامہ جنگ نے شریعت بل پر تاریخ ساز مباحثے کا اہتمام کیا۔ دونوں طرف سے علماء اور سکالرز کا ایک پینل ترتیب دیا گیا اور چند معروف صحافیوں اور وکلا پر مشتمل جیوری تشکیل دی گئی۔ روزنامہ جنگ میں اس مذاکرے کے اشتہارات آنے شروع ہو گئے۔ جن میں فریقین کے نام شائع ہو رہے تھے۔

شریعت بل کے حامیوں میں قاضی حسین احمد، قاضی عبداللطیف (سینیٹر) مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا وصی مظہر ندوی، ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔ جبکہ شریعت بل کے مخالف پینل میں سرفہرست نام علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کا تھا جب کہ پینل کے دیگر اراکین میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے ساجد نقوی، پروفیسر وارث میر، مولانا عبدالستار خاں نیازی وغیرہ شامل تھے۔

جیوری کے فرائض سابق وزیر قانون اور ممتاز وکیل ایس، ایم ظفر، جسٹس ریٹائرڈ چوہدری محمد صدیق، جسٹس ریٹائرڈ خلیل الرحمٰن، جسٹس ریٹائرڈ محمد سرور اور ممتاز صحافی ارشاد احمد حقانی پر مشتمل پینل کے ذمے تھے۔

ہم اس مذاکرے میں شرکت کے لیے علامہ شہید کے گھر پہنچے ہوئے تھے کہ ایک روز پہلے ہی علامہ نے ہمیں ہدایات دے دی تھیں کہ گھر ہی آ جانا۔ وہاں سے اکٹھے چلیں گے اور اس سے ایک روز پہلے آپ مکتبہ قدوسیہ تشریف لائے۔ میرے والد اور علامہ مل کر اس مذاکرے کی تیاری کرتے رہے۔ دونوں دوست آپس میں طے کرتے

رہے کہ وہاں کیا بات کرنی چاہیے اور کیسے کرنی چاہیے۔

مذاکرے کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ علامہ شہید کی بڑی گاڑی میں ہم لوگ بیٹھے اور جنگ اخبار کے دفتر کی طرف چل دیئے۔ عطاء الرحمٰن ثاقب، رانا جاوید رفیق، محمد یعقوب، محمد زبیر اور چند دوسرے افراد بھی علامہ کے ہمراہ تھے۔ جب وہاں پہنچے تو ماحول گرم تھا ...... وہ اس طرح کہ قاضی حسین احمد مرحوم اکیلے نہیں آئے تھے بلکہ "لشکر" ساتھ لے کر آئے تھے۔ یعنی پنجاب یونیورسٹی سے اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنان کی دو بسیں بھی وہاں موجود تھیں یاد رہے کہ یہ یونیورسٹی کی سرکاری بسیں تھیں۔ خدا جانے اپنی سیاست کے لیے سرکاری ذرائع کا اس انداز سے استعمال کس حد تک جائز ہے۔ جمعیت کے لڑکے جوش وخروش سے نعرے بازی کر رہے تھے۔ علامہ کو دیکھ کر ان کے نعرے بد تمیزی کی حد تک بلند آہنگ ہو گئے۔ پہلے تو علامہ طرح دے گئے پھر ذرا غصے میں آ گئے۔ جب ہال کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے تو مڑ کر غصے میں بولے "میں نے نافذ نہیں کرنا، جاؤ جا کر ضیاء الحق کو کہو کہ نافذ کرے۔" یہ کہہ کر ہال میں داخل ہو گئے۔ اندر حاضرین اور مہمان آ چکے تھے۔ علامہ نے اپنے ہاتھ میں فائل پکڑی ہوئی تھی جس میں آپ کے حوالہ جات اور اخبارات کی کاپیاں تھیں جو بل سے متعلقہ تھیں۔ آپ جب اندر داخل ہوئے۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

والا منظر تھا۔ آپ کیا آئے، ہر سو خوشبو پھیل گئی، روشنی سی بکھر گئی۔ آپ کے ہاتھ میں پکڑی فائل دیکھ کر کچھ چہرے زرد سے ہو گئے۔

مذاکرے کے میزبان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ جیوری کا تعارف کرایا۔ فریقین کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ مذاکرے کے اصول وضوابط بتائے اور سب سے پہلے استغاثہ کے

طور پر قاضی حسین احمد کو گفتگو کی دعوت دی۔ قاضی حسین احمد نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ''اخبار نے اس طرح کا ماحول بنا دیا ہے جیسے علمائے دین آپس میں متحارب فریق ہیں اور یہ کوئی جنگ ہو رہی ہے۔ میں اس تاثر کی نفی کرتے ہوئے اپنے ڈائس سے بات کرنے کی بجائے شریعت بل کے مخالفین کے ڈائس پر جا کر بات کروں گا۔'' یہ کہا اور علامہ کی طرف والے ڈائس پر تشریف لے آئے۔ آپ نے اپنا دعویٰ اور دلائل پیش کیے۔ قاضی حسین احمد مرحوم کے خلوص میں کوئی شبہ نہ تھا مگر خدا جانے وہ ضیاء الحق کی طرف سے کس خوش فہمی کا شکار تھے۔ قاضی صاحب کی گفتگو ختم ہوئی تو میزبان نے علامہ کو دعوت دی کہ گفتگو کا آغاز کریں۔ ہم سب دوست بھی بہت پر جوش تھے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کے دوست بھی کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور مرنے مارنے پر اترے ہوئے تھے۔ کچھ شریعت کے نفاذ کی خوش فہمی، ادھر سے ضیاء الحق کی محبت کا تڑکا۔ ماحول خاصا کشیدہ ہونے کو جا رہا تھا۔

علامہ شہید نے آغاز کیا۔ کیا شیر آدمی تھا، کیا خطیب تھا، کیا قوت استدلال تھی، کیسا حسین اور بارعب شخصیت تھی، اور اس روز ان کے یہ اوصاف درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ یقین کریں سب خواب لگ رہا ہے آج بھی۔ بس وہ بندہ ہی کمال کا تھا۔ علامہ نے اس روز ضیاء الحق اور اس کے ہم نواؤں کی ''پھٹیاں اکھیڑ'' دیں۔ علامہ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً یہ جنگ نہیں مذاکرہ ہے، علمی گفتگو ہے اور میں بھی قاضی حسین احمد صاحب والی طرف کے ڈائس پر جا کر بات کرتا ہوں، لیکن معذرت کے ساتھ یہ جنگ والا ماحول کس نے بنایا ہے۔ میں تو چار بندوں کے ساتھ یہاں آ گیا ہوں، باہر جا کر دیکھیں سرکاری بسوں میں بندے بھر بھر کر کون لایا ہے؟'' اس بات کا قاضی صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس کے بعد علامہ شہید نے شریعت بل کے حوالے سے گفتگو شروع کی۔ دلائل کا

ایک سیلاب تھا جو سیلِ رواں بن کر بل کے حامیوں کو بہائے لیے جا رہا تھا۔ آپ فائل کھول کھول کر بل کے حامیوں کے سابقہ بیانات کے تضادات دکھا کر ان کے دلائل کے تار و پود بکھیر رہے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ؏

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

آپ کی گفتگو ختم ہوئی تو دوسرے مقررین باری باری خطاب کرنے لگے۔ ہر بندہ اپنے دلائل دے رہا تھا۔ مگر جو فسوں آپ نے پھونکا تھا، وہ ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ اس طرح کہ علامہ کے دلائل اتنے جاندار تھے کہ اس کے جواب دینے میں شریعت بل کے حامی آپس میں الجھ رہے تھے۔ قاضی عبداللطیف نے تو صاف کہہ دیا کہ بھئی میں نے ان کو منع کیا تھا کہ یہ بات نہ کریں مگر یہ مانے ہی نہیں۔ اب سارے مقررین اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کر کے فارغ ہونے کو تھے اور علامہ کو احساس ہو رہا تھا کہ سب سے پہلے گفتگو کر کے ''میں تو گھاٹے'' میں رہ گیا۔ یہ سب لوگ میرے بعد بات کر رہے ہیں۔ کتنی ہی باتیں تھیں جو جواب طلب تھیں اور کتنی ہی ایسی، جن پر اچھی خاصی خبر لی جا سکتی تھی۔ ایسے میں علامہ نے پروفیسر وارث میر سے کہا ''میر صاحب آپ اعلان کریں کہ اپنے حصے کا وقت میں نے علامہ احسان الٰہی ظہیر کو دیا۔'' پروفیسر وارث میر کے لیے یہ بات قطعی غیر متوقع تھی۔ انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا ''علامہ صاحب میں اتنی تیاری کر کے آیا ہوا ہوں، آپ کیا بات کر رہے ہیں۔'' علامہ نے اصرار کیا۔ بے تکلفی بھی تھی دوستی بھی ''یار میں تینوں کہہ رہیا آں تو اعلان کر دے۔''

یہ تو تھے الفاظ لیکن اس انکار اور اصرار کی دل چسپ روداد آپ وارث میر صاحب کے قلم سے ہی پڑھیے۔

شریعت بل پر جنگ فورم کی طرف سے قائم کردہ عدالت (مذاکرہ) میں علامہ صاحب اور دوسرے علماء کے ساتھ میں بھی مخالف پینل کی طرف سے پیش ہو رہا تھا۔

علامہ صاحب مذاکرے کے آغاز میں اپنی زوردار تقریر کر چکے تھے۔ ان کی تقریر کے دوران جنگ دفاتر سے باہر نعرے لگتے رہے۔ میں نے اپنے دلائل مذاکرے کے اختتام پر پیش کرنے تھے۔ علامہ صاحب میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھے تھے۔ نماز ظہر کے وقفے کے بعد علامہ صاحب نے اچانک میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نہایت ملائمت سے میرے کان میں کہا ''وارث صاحب! میری درخواست ہے کہ آج آپ اپنی تقریر نہ کریں۔'' ''کیوں؟'' میں نے مزاحمتی انداز میں سوال کیا۔ ''بس میں نے کہہ دیا ہے آپ نہیں بولیں گے۔'' ان کا لہجہ سخت ہو گیا، پھر حتمی انداز میں کہا ''آپ کی باری میں لوں گا، میں نے علامہ صاحب کو بہت سمجھایا کہ اس مذاکرے کی بہت پبلسٹی ہو چکی ہے، لوگ دور دور سے سننے کے لیے آئے ہیں، میں نے تیاری بھی کر رکھی ہے۔ میں نہ بولا تو اس کا غلط مفہوم لیا جائے گا۔ علامہ صاحب نے اپنے مطالبے پر اصرار کرتے ہوئے کہا ''یہ مولویوں کا اجتماع ہے، آپ اس تالاب کی مچھلی نہیں ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ آئین اور پارلیمنٹ کی بات کریں گے، میرے پاس ابھی بہت سا مواد ہے۔ میں ان کی ''پھٹیاں'' توڑ دوں گا۔ ہم دونوں کا ''کاز'' ایک ہے۔ مان جائیے اور اپنا وقت مجھے دے دیجیے۔'' پھر پیچھے مڑ کر ہال کی دیواروں کے ساتھ کھڑے سامعین پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا ''کیا خیال ہے یہ لوگ آپ کو تقریر کرنے دیں گے؟'' علامہ صاحب لاہور کے مذہبی حلقوں میں میرا بہت بڑا نفسیاتی سہارا تھے۔ انہوں نے ہر جگہ اور ہر محفل میں میرا دفاع کیا تھا، وہ یاروں کے یار تھے۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ میں نے کھڑے ہو کر اعلان کر دیا ''شریعت بل پر میرے خیالات میرے مضامین کے ذریعے عوام تک پہنچ چکے ہیں۔ آج کے مذاکرے میں میری نمائندگی علامہ احسان الٰہی ظہیر فرمائیں گے، میں اپنا وقت انہیں دے رہا ہوں۔ مولانا وصی مظہر ندوی نے میرے ''ایثار'' پر بآواز بلند شکریہ ادا کیا۔ جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد نے کہا

''مولانا ظہیر سے پوچھ لیں، وہ ان کی نمائندگی کے لیے تیار ہیں۔'' علامہ صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''بالکل تیار ہوں'' اور تب آپ سٹیج پر پہنچ گئے۔

پھر علامہ نے تاریخی خطاب کیا۔ میرے عزیز رانا جاوید رفیق کہتے ہیں کہ میں اس روز سوچ رہا تھا کہ ''حالات کیسے بھی کیوں نہ ہو جائیں یہ شخص اہل حدیثوں کی کمر نیچے نہیں لگنے دے گا۔''

مذاکرہ ختم ہوگیا۔ فاتح کون رہا اور کون ہارا، وہ چہرے بتا رہے تھے کہ جن پر شکست اور خفت کی شرمندگی نظر آ رہی تھی اور بعض چہرے دمک رہے تھے۔ اسی اثناء میں پتہ چلا کہ مذاکرے کی جو ویڈیو بن رہی تھی وہ کسی نے غائب کر دی ہے البتہ دوسرا حصہ بچ گیا۔ اس پہلی ویڈیو میں علامہ کی پہلی تقریر تھی۔ یہ اہم ریکارڈ تھا جو ضائع ہوگیا۔ ممکن ہے شریعت بل کے کسی حامی کے گھر میں آج بھی پڑی ہو۔ ویسے غالب گمان یہ ہی کیا گیا کہ جو اتنے متحرک تھے کہ بسیں تک بھر کے لے آئے، ان میں سے کسی کا یہ کارنامہ تھا۔

ہم سب علامہ کی معیت میں باہر نکلے۔ جنگ اخبار کی عمارت کے بیرونی طرف صحن ہے۔ اس میں کھڑے ہو کر علامہ نے اوپر نگاہ بلند کی اور پروفیسر وارث میر سے کہنے لگے ''میر صاحب دیکھیں وہ اوپر میر شکیل کے کمرے میں روشنی ہے، آپ اوپر جائیں، وہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے کہیں آپ پر بہت دباؤ آئے گا مگر ہمارا موقف جو ہم نے بیان کیا ہے، من وعن شائع ہونا چاہیے۔'' اندازہ کریں کتنا بیدار مغز انسان تھا، وارث میر کہنے لگے ''علامہ صاحب رہنے دیں، کچھ نہیں ہوگا۔'' علامہ نے اصرار کیا ''آپ جائیں تو سہی۔'' اس پر وارث میر کہنے لگے ''علامہ صاحب میں دل کا مریض ہوں، مجھے کیوں اتنی سیڑھیاں چڑھانی ہیں۔'' مگر علامہ کے مان بھرے اصرار کے سامنے ایک بار پھر ان کو ہارتے ہی بنی اور وہ اوپر میر صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔

علامہ عمارت سے باہر نکلے تو دیکھا قاضی عبداللطیف سواری کے انتظار میں کھڑے تھے۔

علامہ ان کے پاس گئے، گلے ملے اور ان سے کہا میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ قاضی صاحب نے بہتیرا کہا کہ رہنے دیں۔ مگر آپ نے زبردستی ان کو گاڑی میں بٹھایا اور اسٹیشن، جہاں انہوں نے جانا تھا، چھوڑ کر آئے۔ علامہ صرف دلائل کے فاتح نہیں تھے، حسن اخلاق سے بھی دل جیتنے والے تھے۔ اب تو لیڈران کرام بہت ''بڑے'' ہو گئے ہیں ان کو ان ''چونچلوں'' کے لیے کہاں فرصت؟

اس مذاکرے کی جیوری نے جو فیصلہ لکھا اس کے بارے میں وارث میر لکھتے ہیں ''شریعت بل پر مذاکرے کے دو تین روز بعد سابق ججوں اور قانون دانوں نے جو فیصلہ لکھا، اس پر سب سے زیادہ علامہ احسان الٰہی ظہیر کے دلائل اثر انداز ہوئے۔''

یہ علامہ کی اس روز بہت بڑی فتح تھی۔ اس مذاکرے کے بعد آپ چند روز ہی جیے۔

شریعت بل اسمبلی میں پیش کیا گیا جب کہ علامہ اسمبلی کا حصہ نہیں تھے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح علامہ کی جمعیت اہل حدیث بھی ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کے نتیجے میں اسمبلی سے باہر تھی۔ لیکن شریعت بل کی مخالفت میں علامہ کی آواز اتنی توانا تھی کہ اسمبلی کے اندر اس بل کے مخالف بھی علامہ کی مدد لینے پر مجبور ہو گئے۔ وزیر اعظم محمد خان جونیجو اس بل کے مخالف تھے۔ ایک روز رات کے اندھیرے میں خفیہ طور پر وہ علامہ کے گھر آن پہنچے۔ ان کی آمد کا مقصد شریعت بل کے بارے میں مشترکہ لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

(والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی شہید کے حوالے سے لکھی گئی چند یادیں [1])

ایک قبر جو ایک خاص مقام پر ہے، اس نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس طرح کہ زندگی کا رخ ہی بدل کے رہ گیا۔ تب جمعہ کے روز چھٹی ہوا کرتی تھی۔ میں عصر کی نماز کے بعد گھر سے نکلتا اور راوی کنارے واقع قبرستان پہنچ جاتا۔ ایک قبر پر جا کر کھڑا ہو جاتا، دیر تک دعا کرتا، پھر وہیں قدموں میں ایک طرف بیٹھ جاتا اور دیر تک بیٹھا رہتا۔

اے تن میرا چشماں ہووے
تے میں مرشد ویکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں
اک کھولاں تے اک کجاں ہو

یہ میرے والد محترم کی قبر تھی۔ تقریباً بارہ برس میرا معمول رہا کہ ہر جمعے نماز عصر کے بعد وہاں جاتا اور دیر تک بیٹھے رہتا۔ دائیں بائیں قبریں ہی قبریں۔ ایک مکمل آبادی مکمل زندگی

[1] یہ مضمون میں نے مجلہ ''الاخوۃ'' کے لیے اپنے والد محترم کے حوالے سے لکھا تھا۔ چونکہ اس میں علامہ شہید رحمہ اللہ جمعیت اہلحدیث پاکستان اور اہلحدیث یوتھ فورس کے حوالے سے کافی باتیں آ گئی تھیں اس لیے میں نے اسے بھی اس کتاب کا حصہ بنا دیا۔

الگ ہی دنیا۔ ہر کسی کا اپنا مکان، ایک دوسرے سے بے نیاز، قیامت تک کا سفر۔ میں اس ماحول کا حصہ بن جاتا۔ قبرستان کے بالکل پہلو میں صدیوں سے بہتا ہوا راوی، جس کا سفر ابھی صدیوں تک رہے گا۔ تھوڑا سا آگے بیچ دریا میں کامران کی بارہ دری، چپ چاپ کھڑی جیسے اپنی عظمت کے کھو جانے پر حیران۔ جیسے اسے گردش روز و شب کا یقین نہ آ رہا ہو۔ ذرا آگے مشرق کی سمت راوی کا پل اور اس پر سے گزرتی گاڑیاں کہ ہاں دیکھو وقت تو صدیوں آگے گزر آیا اور گزرتے وقت کا ماتم کیا کرنا لیکن دل کا کیا کیجیے کہ کہے جاتا...... ؎

یہ وقت ماتم کی گھڑی ہے

لیکن وقت کہاں واپس آتا ہے۔ عجیب اداس کر دینے والا ماحول۔ لیکن گہرا سکون کہ یہ وقت یہ ماحول سارا کچھ اپنا ہوتا۔ نہ کسی کی شرکت نہ کوئی شریک۔ یہ اداسی آج تک میرے وجود کا حصہ ہے۔ پرسکون ماحول میں گاہے کوئی پرندہ لمبی اڑان بھرتا ہوا دریا کی سطح کو چھوتے ہوئے پھر سے اڑ جاتا۔

ایسی پرسکون ہوا چل رہی ہوتی کہ جس کا تصور خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔ دریا کی لہروں سے اٹھتی یہ ہوائیں دل میں طوفان برپا کر دیتیں اور خود ہی اس طوفان کو سکون عطا کرتیں...... ؎

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحرا میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

لیکن یہ بے وجہ قرار دل کو مزید بے قرار کر دیتا، جب میں تصور میں انہیں لاتا۔ وہ میرے باپ تھے، دوست تھے، میرا سب کچھ تھے۔ آج چوبیس سال [1] بعد ان کے

---

[1] یہ مضمون 2011 میں لکھا گیا تھا۔

بارے میں لکھ رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے جیسے وہیں ان کے پاس ہی بیٹھا ہوں ان کی قبر کے سرہانے۔ ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ باتیں کہاں، خود کلامی ہے۔

کشف قبور ایک لا یعنی محنت، لا حاصل مگر تصور کی ایک مکمل اور بھر پور طاقت کہ "یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے وہ جا رہے ہیں" والا معاملہ تو بن جاتا ہے۔ میری نظر میں وہ ہوتے، ان سے بات کرتا اگرچہ تصور ہی ہوتا لیکن بہت مکمل۔ پھر میں اٹھ جاتا اور جا کے راوی کنارے جا بیٹھتا۔ سورج ڈوب رہا ہوتا۔ سرخ ہوتا ہوا ایک دم بڑا جیسے قریب آنے کو ہے۔ جیسے ہی راوی کے دوسرے کنارے درختوں کے بیچ میں چھپ جاتا تو میں اٹھ جاتا۔ ؎

وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

سوچ سوچ کر قدم اٹھاتا میں واپس ہو لیتا۔ راوی کے اوپر پرندے بھی قطار اندر قطار اپنے گھروں کو واپس ہو رہے ہوتے، فرق صرف اتنا کہ وہ ہجوم کی صورت رواں دواں ہوتے اور میں اکیلا۔

میں ابھی پانچ سال کا تھا کہ میرے والد نے راوی روڈ میں اپنے ذاتی گھر کے لیے جگہ خرید لی۔ مینار پاکستان کے عین سامنے بستی ہے سمادھی سر گنگا رام۔ چھوٹی سی صاف ستھری آبادی۔ چند گلیوں پر مشتمل محلہ۔ اس محلے میں بمشکل سو گھر ہوں گے۔ آبادی کے ایک طرف نابینا بچوں کا ایک بڑا سکول تھا بلکہ ابھی تک ہے۔ جس کا نام سن رائز تھا۔ سن رائز یعنی ابھرتا ہوا سورج۔ عجیب بات ہے طلوع کے اس منظر کا تعلق خالص نظر سے ہے لیکن سکول نابینا بچوں کا تھا۔ بھگت کبیر نے کہا تھا ناں ؎

رنگی کو نارنگی کہیں
بنے دودھ کو کھویا
الٹے چلن دنیا کے
دیکھ کبیرا رویا

ہمیں ہمہ وقت اس سکول کے بارے میں تجسس رہتا تھا لیکن محلے کے بچوں کو سکول میں جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ بڑا سا میدان اور عمارتوں کا سلسلہ۔ بلا وجہ کی روک ٹوک ...... ہمارے لیے یہ ہمیشہ پراسرار رہا۔ اگر چہ آج یہ تجسس، بچگانہ لگتا ہے لیکن آج بھی اگر ''سمادھی'' جاؤں تو دل میں وہی بچپن کا تجسس ویسا ہی اشتیاق۔

ہمارے گھر سے دوسری طرف سمادھی سر گنگا رام کی عمارت تھی۔ ایک طرف بڑا سا تالاب اور اس کے پہلو میں پنجاب کے مشہور انجینئر سر گنگا رام کی سمادھی واقع تھی۔ ساری عمارت کے گرد مستطیل شکل کی چار دیواری تھی جس کے کونوں پر بہت خوبصورت برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ آٹھ فٹ قطر کے دائرے میں ستونوں کے سہارے اوپر سنگ مرمر کے گنبد، افسوس اس عمارت کی تصویر کشی نہ ہوئی اور نہ ہی اس پر لکھا گیا۔ چار پانچ فٹ گہرا تالاب اور اس کے اندر کی طرف اترتی ہوئی سیڑھیاں۔ اہل محلّہ کوڑا کرکٹ پھینکنے لگ گئے۔ تالاب میں بارش کا پانی جمع رہتا جو تعفن زدہ ہو جاتا۔ برسات کے دنوں میں ٹڈی دل پیدا ہو جاتا جو اڑتا پھرتا۔ ہم لکڑی کے ''کانے'' (سرکنڈے) لے کر تالاب کے کنارے بیٹھ جاتے ہم ان کو ''بمبیریاں'' بولتے اور دوسری قسم کالے رنگ کا ''ہیلی کاپٹر'' ہوتا تھا جس کی شکل واقعی ہیلی کاپٹر کی طرح ہوتی تھی وہ اس ''کانے'' پر بیٹھ جاتے۔ دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں دھاگہ ہوتا جس کے سرے پر ہلکی سی کھلی ہوئی گرہ بندھی ہوتی وہ آہستہ سے اس گانٹھ کو ''بمبیری'' کی دم کے اوپر داخل کر کے باندھ دیتا اور وہ دام میں آ جاتی تین چار فٹ کا دھاگہ ہوتا اور ہم اس کو پتنگ کی طرح اڑاتے کبھی کھینچ لیتے کبھی ''ڈھیل'' دے دیتے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے اسی گناہ کا بدلہ آج ساری قوم چکا رہی ہے۔ ہماری قوم اقوام متحدہ اور اس کی امداد کے ''کانے'' پر بیٹھی رہتی ہے اور امریکہ اور اس کے حواری ہماری دم پر اپنی امداد کی گرہ باندھ دیتے ہیں اور پھر ہمیں

اڑائے پھرتے ہیں۔ ہمیں پتہ ہوتا کہ ہمارے جرم کی سزا ساری قوم کو ملے گی تو ہم کبھی ''پمبیری'' نہ پکڑتے۔

تالاب کے کنارے پر سرگنگارام کی سمادھی تھی مغل طرز تعمیر سے مشابہ یہ عمارت جس کے چاروں طرف کھلے برآمدے، بیچ میں مرکزی کمرہ جس میں قبر بنی ہوئی تھی جس کے اندر سرگنگارام کی راکھ دفن ہے۔ عمارت کے اوپر بڑا گنبد، مکمل مسلم فن تعمیر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ سفید سنگ مرمر کا گنبد آنکھوں کو بھلا لگتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل سر گنگارام کی بیٹی لندن سے آئیں اور اس عمارت کی تزئین و آرائش کروا گئیں۔ پھر حکومت کو بھی کچھ خیال آیا اور نئی چار دیواری کروا کے تالاب کو مٹی سے پاٹ دیا گیا اور باغیچہ بنا دیا گیا۔ پھر بابری مسجد کا افسوس ناک سانحہ پیش آیا تو ردعمل میں ''ایمان کے جذبے سے سرشار'' ہمارے جوان بھی نکلے اور بعض مندر توڑ دیئے گئے۔ ان میں سرگنگارام کی سمادھی بھی تھی۔ اس کے سفید گنبد سے بھی سنگ مرمر کی سلیں اکھاڑ لی گئیں اور محلے کے بعض گھروں کے دروازوں کے تھڑے سج گئے۔ یہ آبادی اور بربادی ہمارے اس محلے کو چھوڑنے کے بعد پیش آئی۔ جب ہم وہاں رہتے تھے تب تک سارا کچھ اصل حالت میں ہی تھا۔

سمادھی کے احاطے سے اگلی طرف محلے کی واحد مسجد اور اس کے پہلو میں کھلا میدان موجود تھا۔ پرانی مسجد کی جگہ تو نئی مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔ میدان میں ایک کونے میں ایک قبر ہوتی تھی۔ قبر کے گرد چار فٹ بلند دیوار تھی اور داخلے کے لیے ایک دروازہ۔ قبر کے اوپر چھت نہیں تھی یہ سلسلہ وارثیہ کے کسی بزرگ کی قبر تھی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اہل محلّہ کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اس قبر کو کوئی ''لفٹ'' نہیں کرواتے تھے۔ کھلے میدان کے مشرقی کنارے پر سمادھی واقع تھی اور مغربی کنارے پر ایک عمارت جس کے صدر دروازے پر لکھا ہوا تھا ''دربار وارثیہ'' اس میں سرکاری

سکول واقع تھا اور ایک حصے میں تصوف کے سلسلہ وارثیہ کی کسی شاخ کے وارث رہتے تھے، جو پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور عمارت کی ملکیت کے حوالے سے ان کا حکومت سے مقدمہ چل رہا تھا۔ آخر کار وہ یہ مقدمہ جیت گئے۔ گھر ان کی ملکیت ٹھہرا اور سکول وہاں سے ختم ہو گیا۔ پھر سال کے سال وہاں قوالی کی محفل ہوتی مگر ہم نہیں جاتے تھے کہ محلے میں واحد گھر ہمارا تھا جو ''وہابی'' تھے۔ اگر چہ چند گھر دیوبندیوں کے بھی تھے اور مسجد بھی ان ہی کے کنٹرول میں تھی اور وہ بھی وہابیوں میں ہی شمار کیے جاتے تھے۔

یہ وہ محلّہ تھا جس میں میرا بچپن گزرا۔ ہمارے محلے کے کنارے پر ایک مزید چھوٹا محلّہ تھا جہاں چنگڑ قوم آباد تھی۔ ان کے وہاں کتنے ہی گھر تھے۔ ایک بار ان کی قوم کا ایک بزرگ وفات پا گیا۔ نوے سال کے لگ بھگ عمر تھی۔ جب اس کا جنازہ اٹھا تو جنازے کے راستے اس کی قوم کے افراد سکے نچھاور کرتے گئے۔ پانچ اور دس پیسے کے سکے تھے۔ تب ان کی حیثیت خاصی معتبر ہوتی تھی اب حیثیت تو کیا، ویسے ہی متروک ہو گئے۔ معلوم نہیں یہ ان کا رواج تھا یا کیا تھا، اپنی موج ہو گئی۔ ہم چھت پر کھڑے تھے۔ وہ لوگ سکے دائیں بائیں گھروں میں بھی نچھاور کر رہے تھے اور ہم حیران ہو رہے تھے اس ''نعمت ناگہانی'' پر...... ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

ہمارا ایک کمرے پر مشتمل گھر تھا۔ آگے بڑا سا صحن۔ ہم چھوٹے تھے۔ اس لیے ہمیں گھر بڑا لگتا تھا ورنہ پانچ مرلے کا گھر کتنا بڑا ہوتا ہے۔ پھر میرے والد نے صحن کے دوسری طرف نیا کمرا تعمیر کر لیا۔ اس کے آگے برآمدہ تھا۔ اب وہ بڑا سا صحن چھوٹا ہو گیا اور دو کمروں کے بیچ میں آ گیا۔ نئے کمرے کے استعمال کا نام ''بڑا کمرا'' ٹھہرا اور پرانے کمرے کو چھوٹا کمرا کہا جانے لگا۔ ہمارے گھر سے پہلو بہ پہلو خالی پلاٹ تھا جو

میرے ماموں کی ملکیت تھا۔ اس کے بیچ میں ''ٹاہلی'' کا ایک ٹنڈ منڈ کھڑا درخت مکمل خشک۔ کبھی تو وہ بھی ہرا بھرا رہا ہوگا اس پر پتے بھی ہوں گے ''بور'' بھی آتا ہوگا، کہیں مدھ بھری آواز بھی ابھرتی ہوگی۔ ع

ٹاہلی اُتے بور
ٹاہلی اتے بور
کرے پیار دیاں گلاں

ایک روز وہ خشک درخت بھی کٹ گیا اور اس خالی پلاٹ پر میرے ماموں نے گھر تعمیر کر لیا اور اس میں آباد ہو گئے۔ ٹاہلی کٹ گئی تھی لیکن ''بور'' چلا آ رہا تھا۔ پہلے آپ بتائیے بور کا اردو میں کیا ترجمہ کیا جائے۔

ویسے تو اردو میں بھی بور ہی کہتے ہیں۔ بعض الفاظ کا ترجمہ تو ممکن ہوتا ہے لیکن وہ لطف نہیں آتا۔ اسحاق بھٹی صاحب کہا کرتے ہیں ''ٹٹ پینا'' کا ترجمہ کیجیے۔

میرے والد رات دیر سے گھر آیا کرتے تھے۔ صحن میں چارپایاں بچھا دی جاتیں۔ ہمیں سونے کا حکم ہوتا۔ میں کبھی ایک چارپائی پر لیٹتا، پھر اٹھ کر دوسری پر چلا جاتا۔ عشاء کی نماز کا سوال ہوتا میں کہتا نہیں ابھی نہیں پڑھی۔ پڑھ لیتا ہوں۔ اب نیند کا غلبہ ہوتا۔ والدہ ڈانٹتیں کہ چلو اٹھو۔ میں کہتا جاگ رہا ہوں، ابھی پڑھ لیتا ہوں۔ جاگنے کا ثبوت دینے کے لیے مسلسل ایک پاؤں کو حرکت دیتا رہتا۔ یہ عادت ایسی پختہ ہوئی کہ آج تک چل رہی ہے۔ میری پانچ سال کی بیٹی سونے کے لیے لیٹتی ہے تو ایک پاؤں کو حرکت دیتی رہتی ہے۔ میں ہنس رہا ہوتا ہوں جیسے کوئی کہہ رہا ہو ''جاگ رہا ہوں، ابھی پڑھ لیتا ہوں۔''

ہمارے صحن میں ہینڈ پمپ لگا ہوتا تھا۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا تھا تب (وہاں پر ابھی سرکاری پانی نہیں آیا تھا) ہم لڑکے قمیض اتار لیتے۔ ہمارے والد نلکا چلاتے،

ٹھنڈے پانی کی پھوار جسم پر پڑتی۔ پھر کہتے چلو اب دوسرا کندھا کرو۔ ؏

اس نے جلتے ہوئے ماتھے پہ، جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی ، تاثیر مسیحائی کی

میں اب جس گھر میں رہتا ہوں وہ بہت جدید ہے، سرکاری نل کا پانی آتا ہے، مگر اس میں وہ ٹھنڈک کہاں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کو ہینڈ پمپ کا پتہ ہی نہیں۔ میں اسے کیا کہوں کہ ''چل ہن دوسرا موڈھا کر'' ویسے تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ بہت جلد لڑکپن سے نکلتے ہی اپنے والد کو اسی کمزور سے ''موڈھے'' پر اٹھائے لے جانا پڑے گا۔ خدا جانے ایسی ہمت اور اتنی طاقت کہاں آ گئی۔

چھوٹا سا گھر تھا اور سادہ سا، آسان سا زمانہ۔ محلے میں بہت زیادہ نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شام کے بعد گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ؏

بہت ہی سادہ ہے تو اور زمانہ ہے عیار
خدا کرے تجھے شہر کی ہوا نہ لگے

البتہ یہ ضرور تھا ہمارے والد نے ہمیں محرومی دی نہ گھٹن۔ اس لیے وہ دن آج بھی کسی خوبصورت خواب کی مانند حسین ہیں۔ گھر میں ذرا سی تبدیلی یا کسی نئی چیز کی آمد سے کئی دن تک ہلچل رہتی۔

وہ ذوالفقار علی بھٹو کے آخری دن تھے۔ تحریک نظام مصطفےٰ ﷺ زوروں پر تھی۔ لوہاری دروازے کے باہر جلوس نکلا تھا۔ پولیس نے وحشیانہ تشدد کیا تھا۔ میں شاید آٹھ نو سال کا تھا کہ ایک روز میرے والد شدید تکلیف میں گھر آئے۔ وہ بھی مضروب ہوئے۔ ان کے سفید بدن پر ڈنڈوں کے نشان ثبت تھے۔ میری والدہ ان کے زخموں پر آئیو ڈیکس لگا رہی تھیں۔ آج بھی ان کی چِٹی سفید کمر نظروں کے سامنے ہے جس پر خون کی گہری سرخ لائنیں بن گئی تھیں۔ کتنی ہی گہری مہندی کیوں نہ لگی ہو، اس کی سرخی آہستہ

آہستہ مدہم ہو جاتی ہے۔ نہ جانے یہ کیسی مہندی تھی آج بھی ویسی ہی ہے۔ ع

بنوں دی مہندی چٹے چٹے ہتھاں اتے بندھ ماہیا

سٹی نہ ڈھولاں تیرے پٹ وچ میری جند ماہیا

تحریک نظام مصطفےٰ ﷺ ختم ہو گئی۔ ''امیر المؤمنین'' ضیاء الحق اقتدار پر قابض ہو گئے اور اسلام کے نام پر ظلم وستم ڈھانے کا آغاز ہوا۔ ظلم کی طویل سیاہ رات جس کا آغاز نوے روز کے جھوٹے وعدے سے ہوا۔ افسوس تو ان دین داروں پر ہوتا ہے جن کے معیار دہرے ہیں اور آج تک ضیاء الحق کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ اس تحریک کے ٹھیک دس سال بعد وہ خون کی گہری لکیریں میرے دامن پر بھی آ گئیں کہ 23 مارچ 1987ء کی رات مجھے ان کا زخموں سے تار تار وجود اٹھانا پڑا۔ ع

مہندی پئی وکدی دھڑیاں

خوش ویکھ نہ سکدی دنیا

ساری رات میں بہہ کہ روئی آں

میرے سامنے ان کا چہرہ اس دن کے تصور کے ساتھ اب بھی رہتا ہے جب میں ان کے لیے کچھ دیر گم ہو گیا تھا۔ مجھے سنٹرل ماڈل سکول لوئر مال (لاہور) میں چھٹی جماعت میں داخل کروایا تھا۔ ان دنوں ہمارا مکتبہ سنٹرل ماڈل سکول کے سامنے تھا۔ سکول سے فارغ ہو کر میں دکان پر آ جاتا۔ سکول میں جماعت اسلامی کے طلبہ نے بزم پیغام بنائی ہوئی تھی۔ ایک روز چھٹی کے بعد مسجد میں درس قرآن کے نام پر انہوں نے بزم سجائی۔ میں بھی اس میں چلا گیا۔ درس کچھ طویل ہو گیا۔ دوسری طرف ہماری ڈھنڈیا پڑ گئی۔ درس ختم ہونے کے بعد میں مزے سے دکان کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچا تو ''بدلا ہوا زمانہ تھا'' والد کا چہرہ تفکر اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اور بعد میں ان کو اس قدر پریشان کبھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے گھر سے بھی معلوم کر لیا

تھا۔ حالانکہ ہمارا گھر کچھ فاصلے پر تھا اور وہ دور موبائل فون کا نہیں تھا بلکہ زمینی فون بھی خال خال ہوتے تھے۔ پھر بھی معلوم نہیں میرا پتا کرنے وہ خود گھر گئے یا کسی کو بھیجا۔ وہ دن اور آج تیس سال بعد کا دن میں کبھی گھر سے بتائے بغیر نہیں نکلا۔ ان کی پریشانی کا احساس تو اب ہوا۔ جب میرا بیٹا تھوڑا سا بڑا ہوا ہے اور بازار اور سکول اکیلا جانے لگا ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ نے ایک تقریر میں عجیب جملہ کہا ہے ''بیٹے کی محبت باپ سے پوچھو'' بات کچھ ایسے ہی ہے۔

سمادھی گنگارام کے ''باب عالی'' کا ذکر کیے بغیر مزہ نہیں آئے گا۔ جی ہاں ہمارے پرانے محلے کا راستہ راوی روڈ سے نکلتا ہے اور قلعہ گجھن سنگھ تو ایک عالم میں مشہور ہو چکا ہے جبکہ اس سے پہلے باوجود ہمارا مسکن ہونے کے غیر مشہور تھا۔ نہ جانے کیوں؟ اس قلعہ گجھن سنگھ کے بازار میں فوارہ چوک ہے جس کے اطراف میں فیصل آباد کے گھنٹہ گھر چوک کی طرح راستے نکلتے ہیں۔ سب سے بڑا بازار جو راوی روڈ سے نکلتا ہے۔ اس کے بالمقابل سڑک کے دوسری طرف گلی داخل ہوتی ہے، وہ سمادھی گنگارام کا راستہ ہے۔ اس راستے کے ایک کونے پر ''بابا چھتری والا'' کا مزار بے انوار اور مرکز ظلمات ہوا کرتا تھا۔ ابھی میاں شہباز شریف نے میٹرو بس بنائی تو اس کی زد میں یہ قبر بھی آ گئی اور اسے یہاں سے ختم کر دیا گیا۔ لوگوں کی تقدیر میں بدلنے والے کی اپنی مٹی کی ڈھیری محفوظ نہ رہ سکی۔ بابا چھتری والا ایک مجنون کشمیری نیم ننگ دھڑنگ بابا تھا۔ گلیوں کی خاک چھانتا رہتا۔ کبھی اس دیوار کے سائے میں کبھی اس دیوار کے۔ پھر شاید اسے کوئی اچھا مینیجر مل گیا اور اس نے یہ خالی جگہ دیکھ کر قبضہ جما لیا۔ سخت گرمیوں میں بھی کمبل اوڑھے رہتا۔ کچی زمین میں ایک فٹ گہرا گڑھا کھود کر اس میں لیٹا رہتا۔ سمادھی گنگارام کے مکین اس کے کچے چٹھے کو جانتے تھے۔ اس لیے مرید اس کو باہر سے امپورٹ کرنا پڑے اور ڈیرہ آباد ہو گیا۔ چرس اور بھنگ کی فراوانی اور دستیابی بابا جی کے ڈیرے کی اہم خوبی تھی۔ نماز

اور صفائی سے بابا جی کو دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ آہستہ آہستہ ڈیرہ آباد ہونے لگا۔ ملنگ تو ملنگ اب ''ملنگنیاں'' بھی نظر آنے لگیں۔ ع

گھوٹ گھوٹ پیتیاں

مولا نال گلاں کیتیاں

غرض سماں بندھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود اہل تصوف و طریقت کے نزدیک بابا ڈبہ پیر ہی تھا۔ ایک دفعہ مشہور بریلوی عالم جنہوں نے صحیح بخاری کی شرح بھی لکھی جناب محمود احمد رضوی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کہیں اکٹھے جا رہے تھے۔ راوی روڈ سے گزر ہوا۔ بابا چھتری والے کے مزار کے سامنے سے گزرے۔ علامہ نے گاڑی روک لی اور رضوی صاحب کو ازراہ تفنن کہنے لگے آپ بابا جی کو سلام کر لیں تو آگے چلیں۔ رضوی صاحب ہنسنے لگے ''جانے دیں علامہ صاحب کیوں تنگ کرتے ہیں۔'' ہنستے ہوئے سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ لیکن پھر وہ دن بھی آیا ہمارے اردو بازار سے عالم فقری نامی ایک صاحب نے ''اولیائے لاہور'' کے حالات پر کتاب لکھی۔ اس میں بابا جی چھتری والے اپنی چھتری سمیت مسکرا رہے تھے۔

یہ وہی عالم فقری ہیں جو اب کئی کتب کے مصنف ہیں۔ کسی سرکاری محکمے سے مناسب عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ تب باریش نہیں تھے۔ میرے والد کے پاس تشریف لائے۔ تعارف کے بعد والد صاحب نے استفسار کیا کہ آپ تو ریٹائر ہو گئے۔ آگے کیا ارادہ ہے؟ فرمانے لگے ''قرآن کی تفسیر کا سوچ رہا ہوں'' والد صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ ''قرآن سے مظلوم آپ کو کوئی نہیں ملا۔''

بابا چھتری والا بھی آخر ایک دن فوت ہو گیا۔ سنا تھا قبر نما گڑھے سے جب بابا چھتری والے کو اٹھایا گیا تو نیچے سے ہزاروں روپیہ برآمد ہوا جو نذرانے تھے۔ مریدوں کے لیے تو بابا جی کا مرنا نہلے پہ دہلا ہو گیا۔ بابا جی بہرحال اب سوا لاکھ کے تھے۔ اسی

گڑھے کو مزید گہرا کر کے اس کی قبر بنائی گئی اور مزار سجایا گیا۔ سالانہ عرس کا آغاز ہو گیا۔ قوال آنے شروع ہو گئے۔ طبلے کی تال پر ؎

تیرے عشق نچایا

تیرے عشق نچایا

کر تھیا تھیا

کی آوازیں گونجنے لگیں۔

جس طرح موسیقی میں شدھ سر اور وکرت سر ہوتے ہیں۔ ایسا تصوف ''تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا'' کے گرد تو گھومتا ہے لیکن یوں سمجھئے جیسے وکرت سر میں۔ اگرچہ ہمارے محلے پر اس ماحول کا اثر تو نہ تھا لیکن کب تک۔ ہمارے والد نے سادھی گنگارام کو خیر باد کہنے کا ارادہ کر لیا۔ اگرچہ بہتر کی تلاش میں ہی انسان ساری زندگی جدوجہد کرتا ہے لیکن نتائج ہمیشہ اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے۔ ایسا ہی اس معاملے میں ہوا۔ میرے والد ان ہی دنوں کاروباری مشکلات کا شکار ہو گئے اور مقروض ہو گئے۔ دونوں گھر فروخت کرنا پڑے۔ کچھ قرض ادا کیا اور کچھ رقم کاروبار میں لگائی۔ کاروبار کیا تھا ؎

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

والا معاملہ بن گیا۔ یعنی انہوں نے اس رقم سے اپنے ذوق کے مطابق امام ابن عبدالبر کی کتاب ''التمہید شرح موطا'' کی ابتدائی اس جلد میں شائع کیں۔ جو ایک بلند پایہ کتاب تھی۔ بہت اعلیٰ کاغذ استعمال کیا۔ حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی مرحوم نے اپنے بلند ذوق کے مطابق اس کی تجلید کی۔ وہ ہمارے مکتبہ پر تشریف لے آتے اور جلد کے ڈیزائن پر خیالات کا تبادلہ کرتے۔ آخر کار ایک ڈیزائن پر اتفاق ہو گیا۔ سادہ مگر بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ کتاب کی طباعت کا کام نہایت اعلیٰ معیار پر سرانجام دیا گیا۔ لیکن ''التمہید'' ان کی امیدوں پر پورا نہ اتر سکی۔ اس کی فروخت بہت ہی کم تھی۔ رقم

ساری پھنس گئی اور ہم کرائے کے مکان میں اٹھ آئے۔ التمہید کا یہ ایڈیشن دس سال تک بھی ختم نہ ہو سکا۔ ہمارے والد محترم کا علمی ذوق بہت بلند تھا اور اس ذوق کی بنا پر انہوں نے یہ کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا لیکن کاروباری حوالے سے یہ سودمند ثابت نہ ہوا۔ عربی کتب سے محبت ان کی زندگی کا حصہ تھا۔ انہوں نے عربی کتب کا کاروبار محض کاروبار کے لیے نہ کیا تھا۔ یہ ان کا عشق تھا اور طبعی ذوق بھی۔ مکتبہ قدوسیہ پر ان کے گاہک محض کتاب خریدنے نہ آتے تھے۔ راہنمائی کے لیے بھی آتے تھے۔ ان کے دوستوں اور گاہکوں میں مختلف مکاتب فکر کے علماء ہوتے تھے۔ مسائل پر آزادانہ ماحول میں گفتگو بھی ہوتی اور کاروبار بھی چل رہا ہوتا تھا۔ ع

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

ایک بڑی سی میز اور لکڑی کی فولڈنگ کرسی جو مکمل آرام کرسی تھی، ان کی دکان پر پڑی ہوتی۔ بہت سادہ سا ماحول ہوتا، غیر کاروباری اور مکمل علمی ماحول۔

جو تیرے حسن کے فقیر ہوئے
انہیں تشویش روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں

وہ اپنے اس عشق میں گم تھے۔ کرائے کی دکان تھی کربلا گامے شاہ کے عین سامنے۔ مدت تک اسی دکان میں کاروبار چلتا رہا کہ زمانے نے ایک بار پھر کروٹ لی اور مالک دکان سے تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یاد پڑتا ہے درجن بھر دکان دار تھے سارے شریف اور مسکین قسم کے لوگ۔ دوسری طرف خاتون اس وقت کے ایک مشہور ایس پی پولیس امان اللہ خان کی ہمشیرہ تھی۔ ان سے سب حضرات کے بڑے اچھے تعلقات

تھے۔ نہایت خوش شکل اور خوش خلق ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ ہماری دکان پر بھی آتیں اور اگر کبھی ہم بیٹھے ہوتے تو بہت شفقت سے پیش آتیں۔ جھگڑا طول پکڑ گیا اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔ پاکستان کی عدالتیں اور نظام عدل...... اللہ کی پناہ۔ مقدمہ چلتا رہا۔ اس مقدمے کے دوران بھی وہ خاتون ہماری دکان پر چلی آتیں۔ ادھر اُدھر کی بات ہو جاتی بلکہ اچھے ماحول میں یہ ساری باتیں چلتیں۔ پاس بیٹھا کوئی شخص تصور بھی نہ کرسکتا کہ یہ دو متحارب فریق ہیں جن میں مقدمے بازی چل رہی ہے۔ ہر کوئی خود کو حق پر خیال کر کے اس کے لیے مصروف جدوجہد ہے۔ اختلاف ضرور تھا، نفرت کہیں بھی نہ تھی۔ اب ایسے ماحول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا دینی داروں میں نہ دنیا داروں میں۔ اس کے باوجود عدالت میں مقدمہ بہرحال ایک دردسر ہوتا ہے جس سے چھٹکارا اتنا آسان نہیں۔ ع

دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید
صندل کو گھسنا درد سر یہ بھی تو ہے

ان مشکل حالات میں میرے والد اور ان کے ایک قریبی دوست چوہدری عبدالباقی نسیم مرحوم نے باہم یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اپنی دکان کا انتظام کیا جائے۔ اس فیصلے کے تحت دونوں دوستوں نے کچھ اور افراد سے مل کر کسی نہ کسی طرح اردو بازار میں غزنی سٹریٹ میں جگہ خرید لی اور مارکیٹ بنانا شروع کر دی۔ رقم کا انتظام بھی ہو گیا، دکانیں بننا شروع ہو گئیں۔ آخر مکمل بھی ہو گئیں۔ جب دکانیں مکمل ہو گئیں تب مقدمے کا معاملہ بھی ختم ہو گیا اور پھر مکتبہ قدوسیہ موجودہ جگہ پر اٹھ آیا۔ یہ 81-1980ء کی بات ہے۔ میرے والد کی شہادت کے بعد وہ خاتون تعزیت کے لیے بھی آئیں اور بعد میں بھی کبھی کبھار تشریف لاتیں۔ پرانی باتیں یاد کرتیں اور آب دیدہ ہو جاتیں۔

مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ منتقل ہو گیا۔ کاروباری لحاظ سے تقریباً بے آباد گلی۔

سامنے ظہور سنز والے تھے جن کا شامیانے اور قناتیں بنانے میں بڑا نام تھا اور دائیں بائیں صرف رہائشی آبادی۔ اگر حدود اربعہ لکھا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ بائیں طرف شکر دین کا گھر، سامنے ظہور سنز، دائیں پہلو سے متصل نگار سینما اور پیچھے خالی پلاٹ۔ میرے والد نے اس مارکیٹ کا نام اہل حدیث مارکیٹ رکھا۔ اب نگار سینما، جس میں میڈم نور جہاں کی آواز میں کبھی ''میریا ڈھول سپاہیا'' کی آواز گونجتی ہو گی۔ یوں سمجھئے ؎

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

والا معاملہ بن گیا۔ البتہ چودھری عبدالباقی مرحوم اس کا نام رحمان مارکیٹ رکھنا چاہتے تھے۔ لمبا واقعہ ہے اور قصہ مختصر یہ کہ والد محترم کی شہادت کے بعد ہم نے بھی اس معاملے کو طول دینا اچھا نہ سمجھا۔ مارکیٹ کا نام رحمان مارکیٹ ہی طے پایا۔ اگرچہ اہل حدیث مارکیٹ کے آثار ابھی تک وہاں موجود ہیں۔

میرے والد اور چوہدری عبدالباقی رحمہ اللہ دونوں کی خواہش تھی کہ غزنی سٹریٹ میں اچھا ماحول ہو اور بڑے ادارے یہاں آ کر اپنا کاروبار جمائیں۔ ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور آج غزنی سٹریٹ میں تمام مکاتب فکر کے بڑے ناشران کی دکانیں اور دفاتر ہیں۔ اس چھوٹی سی گلی میں متنوع نظریات کے حامل ناشران اپنے اپنے انداز میں علم کی شمع منور کیے ہوئے ہیں، جس کی روشنی پوری دنیا کو منور کر رہی ہے۔

اردو بازار میں چھ دوست تھے۔ سارے کے سارے اسلامی کتب کے کاروبار سے وابستہ۔ مثالی دوستی اور پیار۔ ''ویک اینڈ'' پر ''ہوٹلنگ'' کرتے۔ ایک ہی کاروبار لیکن رقابت اور حسد سے دور۔ چھ کی مناسبت سے لوگ انہیں ''صحاح ستہ'' کہتے تھے۔ میرے والد محترم اور ان کے دوست اس صحاح ستہ کا حصہ تھے۔ جناب بشیر احمد نعمانی، نعمانی کتب خانہ کے مالک تھے۔ محترم حاجی مقبول الرحمان (مکتبہ رحمانیہ) حافظ احمد

شاکر (مکتبہ سلفیہ) منصور احمد صاحب (اسلامی اکادمی) اور جناب نذیر احمد سبحانی (سبحانی اکیڈمی) پر یہ گروپ مشتمل تھا۔

پھر میرے والد اللہ کے پاس چلے گئے اور بہت جوان عمری میں ہی چلے گئے۔

غلام فرید نے کہا ہے نا ؏

غلام فریدا میں تے ایویں وچھڑی

جیویں وچھڑی کونج قطاراں

اس طرح صحاح ستہ کہلانے والا گروپ ٹوٹ گیا۔ چند برسوں بعد مولانا بشیر احمد نعمانی بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ہمارے باقی بزرگوں کا سایہ دیر تک ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میرے والد کے حلقہ احباب میں جناب مولانا بشیر احمد نعمانی بڑی باغ و بہار شخصیت تھے۔ میرے ساتھ بڑی شفقت کا سلوک روا رکھتے۔ ان کے کئی دلچسپ واقعات اب بھی اردو بازار کی مجالس میں نوک زبان پر آ جاتے ہیں۔

یہ غالباً ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ کی بات ہو گی۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر نے ادارہ ترجمان السنہ کے زیر اہتمام کچھ کتب شائع کیں۔ نعمانی صاحب نے بھی ان سے کتب خرید کر لیں اور مطلوبہ رقم کی ادائیگی کا وعدہ کر لیا۔ ادھر علامہ شہید کو وعدے سے پہلے ہی رقم کی ضرورت آن پڑی۔ وہ نعمانی صاحب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ ''مجھے رقم کی ضرورت ہے اگر چہ وعدہ تو نہیں آپ کا لیکن اگر دے دیں تو اچھا ہے۔'' نعمانی صاحب نے بے نیازی سے انکار کر دیا کہ ابھی تو ادائیگی کی تاریخ میں کچھ وقت باقی ہے۔ اس کشمکش میں نعمانی صاحب جیت گئے، علامہ صاحب ہار گئے۔ آخر وقت موعود نے بھی آ ہی جانا تھا اور وہ وقت چلا آیا۔ اب وعدے کے دن علامہ شہید نعمانی صاحب کے پاس گئے پیسے کے تقاضے کے لیے۔ نعمانی صاحب کے پاس انتظام نہ

تھا۔ نعمانی صاحب نے مختلف عذر پیش کیے۔ لیکن آج ان کی باری نہیں تھی، علامہ شہید کا دن تھا۔

''علامہ صاحب میرے والد فوت ہو گئے تھے، مصروف رہا'' نعمانی صاحب نے ایک اور عذر پیش کیا۔

''یار نعمانی تمہارے والد فوت ہوئے تھے، کوئی امام ابن تیمیہ تو فوت نہیں ہو گئے۔''

علامہ نے جواب دیا۔ آج جب حاجی مقبول الرحمان صاحب مکتبہ رحمانیہ والے یہ واقعہ سناتے ہوئے یہ جملہ دہراتے ہیں تو محفل کشت زعفران بن جاتی ہے۔

حاجی مقبول الرحمان میرے والد کے گہرے دوست تھے۔ ان کی محبت اور شفقت نے نہ جانے کتنی بار زندگی کی مشکل راہوں میں جینے کا حوصلہ دیا اور کتنے ہی دلچسپ واقعات ان کی زبانی ہم تک پہنچے اور پھر منظر کشی کا ان کا خاص انداز۔

ایک بار جمعیت اہلحدیث برطانیہ کے امیر مولانا محمود احمد میر پوری مرحوم پاکستان آئے۔ نعمانی صاحب سے ان کی قریبی رشتہ داری بھی تھی۔ میرے والد سے بھی ان کے اچھے مراسم تھے۔ ان دوستوں نے ان کے اعزاز میں چائنیز ہوٹل میں ضیافت کا اہتمام کیا۔ فیصل آباد سے مولانا عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلوی ان دنوں سعودی عرب سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس دعوت میں موجود تھے۔ چائنیز کھانے اور اہتمام ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ کھانے کے اختتام پر مولانا عبدالرحمٰن عاجز جب اٹھنے لگے تو نذیر احمد سبحانی بولے ''بیٹھیے ابھی ایک ڈش باقی ہے۔'' ''سفید کباب۔'' مہمان ٹھہر گئے۔ واقعی چند لمحے بعد بیرا تھال میں سفید رنگ کے ''کباب'' سب کے آگے رکھنے لگا۔ اب سارے اس ''سفید کباب'' کی حقیقت سے آگاہ تھے سوائے مولانا عبدالرحمٰن عاجز کے۔ اس لیے دبی دبی ہنسی سے خاموش بیٹھے رہے۔ مولانا عبدالرحمٰن عاجز نے ہی اس ڈش کا

آغاز کرنا تھا۔ انہوں نے کھانے کے لیے جب لقمہ لیا تو قہقہے کی آواز اور اس کباب کی ہیئت ترکیبی سے انہیں پتہ چلا یہ کیا ہے۔ جی ہاں چائینز ہوٹلز میں کھانے کے آخر میں سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے تولیے والے رومال گرم پانی میں ابلے ہوئے، بھاپ نکالتے، کباب کی شکل میں ہاتھ پونچھنے کو پیش کیے جاتے ہیں۔

آج کے دور میں مقابلے بازی نے کاروباری اخلاقیات کا جنازہ تو نکال ہی دیا ہے دلوں میں بھی فاصلے پیدا کر دیئے ہیں۔ مگر یہ دوست اس طرح کی مقابلہ بازی سے ماوراء تھے۔ ایک دوست دوسرے کو مشورہ دیتا، دوسرا تیسرے کو، کہ فلاں کتاب شائع کر لو۔ دلوں میں تنگی نہ سوچ میں بخل۔ مجلسیں بپا رہتی ہیں تو نت نئے منصوبے بھی تشکیل پاتے ہیں۔ ان دوستوں نے مل کر ''ابن کثیر اکیڈمی'' بنائی۔ اس اکیڈمی نے تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی کا تھا۔ اس سے پہلے کراچی کے ادارے ''نور محمد کارخانہ تجارت کتب'' نے یہ ترجمہ شائع کیا تھا۔ لیکن اس ادارے نے اس پر مولانا محمد جونا گڑھی کا نام نہیں دیا ہوا تھا۔ ابن کثیر اکیڈمی نے مولانا کا یہ قرض ادا کر دیا۔ لیکن مولانا کی اولاد جو کراچی میں رہائش پذیر تھی، اسے قرض کی یہ ادائی پسند نہ آئی۔ انہوں نے اس اشاعت پر اعتراض بھی کر دیا اور رائلٹی کا دعویٰ بھی۔ اب یہ سارے دوست مقدمے بازی سے کوسوں دور۔ نعمانی صاحب کو معاملہ فہمی کے لیے کراچی بھیجا گیا پھر مولانا جونا گڑھی کے صاحبزادے لاہور آئے۔ بصد مشکل یہ قضیہ تمام ہوا لیکن اس کتاب کی اشاعت پذیری کے ساتھ ہی ابن کثیر اکیڈمی بھی اختتام پذیر ہوگئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں نے اس کتاب کو دوبارہ مکتبہ قدوسیہ کے زیر اہتمام اس کے شایان شان طریقے سے شائع کیا۔ اس کی طباعت اور صحت کا معیار ماضی کی کسی بھی اشاعت سے بدرجہا بہتر تھا۔ احادیث کی تخریج اور تحقیق بھی کروائی گئی لیکن تب، جب یہ کتاب رائلٹی اور حقوق کی بندشوں سے آزاد ہو چکی تھی۔ میں نے

مولانا محمد جونا گڑھی کا نام بہت نمایاں طور پر لکھوایا۔ ان کے حالات بھی لکھوا کر شروع میں درج کروائے۔ ان کا تعارف اتنا ہوا کہ اب قرآن کا ہر طالب مولانا کے نام سے واقف ہے اور جس محترم بزرگ نے میرے ان بزرگوں سے یہ کام بند کروا دیا اور خود بھی نہ کیا، انہوں نے اس اشاعت پر صرف اسی قدر تبصرہ کیا بھلا ہمیں بھی خبر کر دیتے، ہم نے کیا کہنا تھا۔ میں مذاق میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ میں نے ابن کثیر اکیڈمی کا بدلہ لے ہی لیا۔

علامہ شہید کے سب سے چھوٹے بھائی حافظ عابد الٰہی ذکر کرتے ہیں کہ

"ایک روز میں علامہ رحمہ اللہ کے ہمراہ مکتبہ قدوسیہ آیا۔ گاڑی کھڑی کر کے ہم پیدل مکتبہ قدوسیہ کی جانب آ رہے تھے کہ مولانا عبدالخالق قدوسی پہ نگاہ پڑی۔ آپ اپنی نشست پہ فروکش تھے اور حسب معمول محوِ مطالعہ۔ علامہ نے دُور سے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا "عابد وہ دیکھو علم کا سمندر بیٹھا ہوا ہے۔"

اسی طرح مولانا شمشاد احمد سلفی بتاتے ہیں کہ

"ایک روز میں اور علامہ کسی مسئلے پر الجھے ہوئے تھے کہ ایک دم علامہ اٹھے اور کہنے لگے "چلیں قدوسی صاحب کے پاس چلتے ہیں، یہ مسئلہ وہیں حل ہو گا۔" اور ہم تھوڑی دیر میں مکتبہ قدوسیہ پہنچ گئے۔"

مولانا سلفی مزید بتاتے ہیں کہ

"وہ مناظرہ کرنے سے پیشتر مکتبہ قدوسیہ آتے اور گھنٹوں مولانا قدوسی کا وقت لیتے، ان سے پیش آمدہ کئی مسائل پر بحث کرتے اور جب مولانا مطمئن ہو جاتے تو کہتے اب آپ مناظرہ نہیں ہاریں گے۔"

اسی طرح علامہ شہید بھی اپنی کتب کا مسودہ لے کر عموماً مکتبہ قدوسیہ آ جاتے اور

مولانا قدوسی کے ساتھ مشاورت کرتے۔ خاص طور پر اپنی آخری چند کتب میں تو ان کی خاصی مشاورت رہی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ علامہ نے اپنی کتاب الشیعہ والقرآن کی ایک طبع کا انتساب مولانا عبدالخالق قدوسی کے نام کیا۔

میرے والد محترم کی زندگی کا ایک اہم پہلو ان کی جماعتی زندگی ہے۔ وہ جماعت اہلحدیث کی سیاست میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ جامعہ سلفیہ کے طالب علمی کے دور سے لے کر ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کی رات تک وہ جماعتی امور سے کبھی غیر متعلق نہ رہے۔ جمعیت اہلحدیث اور اہلحدیث کی تاریخ کے اس دور کے بڑے بڑے واقعات اور فیصلے مکتبہ قدوسیہ پر بیٹھ کر ہوئے۔ اس طرح جماعتی سیاست سے میری دلچسپی بھی وراثت میں ہی آئی تھی۔

اہلحدیث یوتھ فورس کا قیام جب عمل میں آیا، تب میں سنٹرل ماڈل سکول (لوئر مال) میں طالب علم تھا اور جلد ہی میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہو گیا۔ ان دنوں اہل حدیث یوتھ فورس کا کنونشن ۳۵ شاہ جمال والے دفتر میں ہونے والا تھا۔ میں نے ان تیاریوں میں فراغت کے سبب خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اہل حدیث یوتھ فورس کے پہلے صدر محمد خان نجیب اور پہلے سیکرٹری جنرل قاضی عبدالقدیر خاموش تھے اور 23 مارچ 1987ء تک یہ دونوں دوست ہی اس نظم کو چلاتے رہے۔ دونوں ہی بہت باصلاحیت اور ذہین تھے اور اس پر مزید یہ کہ باذوق بھی تھے۔ چنانچہ اس کنونشن کی تیاریاں بہت خوبصورت اور عمدہ انداز میں کی جا رہی تھیں۔ مشہور خطاط عبدالرشید قمر سے کنونشن کے اشتہار طبع کروائے گئے۔ بہت خوبصورت دعوت نامہ بھی تیار کروایا گیا۔ یہ دعوت نامہ اتنا خوبصورت تھا کہ آج بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ گلابی رنگ کی زمین پر سنہری بیل بوٹوں سے مزین یہ دعوت نامہ خطاطی اور طباعت کا شاہکار تھا۔ اس کے علاوہ تنظیم کا دستور بھی مرتب کیا گیا۔ وہ بھی اسی اعلیٰ معیار پر شائع

کیا گیا۔ اس کے سرورق کے رنگ سیاہ، سرخ اور سبز پٹیوں میں تھے، ترتیب کے فرق کے باوجود ان کی پیپلز پارٹی کے جھنڈے سے مماثلت ہو گئی۔ اس پر بہت اعتراض اٹھا لیکن کچھ دن بعد اعتراض کرنے والے 'ٹھنڈے'' ہو گئے۔ ویسے بھی پیپلز پارٹی کا نام سن کر ہمارے مذہبی ''دانش ور'' ذرا جذباتی ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی برائی بڑی برائی کے خود ساختہ معیار اور وہ بھی بغیر دلیل کے، ذاتی تعلقات، پسند اور ناپسند کی بھینٹ نظریات کو بھی چڑھا دیا جاتا ہے۔ ایک لوٹا بن کر پی پی میں چلا جاتا ہے تو بڑی برائی بن بن جاتا ہے، واپس مسلم لیگ میں آ جاتا ہے تو پھر چھوٹی برائی ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض افراد کے نزدیک وہ برائی رہتا ہی نہیں۔ اس لیے کہ مسلم لیگ ان کے ہاں پاک پوتر لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے کہ جس کی قیادت شرفاء کے پاس ہے۔ ؏

ہے الگ ہی سارے جہاں سے حضرتِ شیخ کا فلسفہ
جو یہاں پیو تو حلال ہے جو وہاں پیو تو حرام ہے

کنونشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ میں روزانہ جمعیت کے دفتر چلا جاتا۔ خوب مزے کے دن تھے۔ آخر کنونشن کا دن آ گیا۔ بہت شاندار کنونشن تھا۔ بہترین تقاریر، نوجوان جذبات سے معمور، سارا کچھ ہی بہت اچھا تھا۔

عبداللطیف انور میرا بہت اچھا دوست ہے۔ خانیوال سے اس کا تعلق ہے۔ حضرت علامہ کا جیالا ہے۔ علامہ بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ بھی کنونشن کے انتظامات میں شریک تھا۔ اس روز وہ میرے پاس آیا۔ ایک نوجوان مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے ''یار ابو بکر اس کی تقریر کروانی ہے'' میں ان صاحب کو لے کر سٹیج پر چلا گیا۔ ان کی تقریر ہو گئی۔ آج کل وہ مولوی صاحب بھی بڑے لیڈر بن چکے ہیں۔ انہوں نے الگ ذاتی جماعت بنا لی ہے اور اس کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ کچھ لوگ جن کا اس کنونشن میں وجود بھی نہ تھا، کسی شمار میں تھے نہ قطار میں، سنا ہے آج کل شمار میں بھی ہیں قطار میں بھی۔

مولانا قدوسی کے ساتھ مشاورت کرتے۔ خاص طور پر اپنی آخری چند کتب میں تو ان کی خاصی مشاورت رہی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ علامہ نے اپنی کتاب الشیعہ والقرآن کی ایک طبع کا انتساب مولانا عبدالخالق قدوسی کے نام کیا۔

میرے والد محترم کی زندگی کا ایک اہم پہلو ان کی جماعتی زندگی ہے۔ وہ جماعت اہلحدیث کی سیاست میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ جامعہ سلفیہ کے طالب علمی کے دور سے لے کر ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کی رات تک وہ جماعتی امور سے کبھی غیر متعلق نہ رہے۔ جمعیت اہلحدیث اور اہلحدیث کی تاریخ کے اس دور کے بڑے بڑے واقعات اور فیصلے مکتبہ قدوسیہ پر بیٹھ کر ہوئے۔ اس طرح جماعتی سیاست سے میری دلچسپی بھی وراثت میں ہی آئی تھی۔

اہلحدیث یوتھ فورس کا قیام جب عمل میں آیا، تب میں سنٹرل ماڈل سکول (لوئر مال) میں طالب علم تھا اور جلد ہی میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہو گیا۔ ان دنوں اہل حدیث یوتھ فورس کا کنونشن ۳۵ شاہ جمال والے دفتر میں ہونے والا تھا۔ میں نے ان تیاریوں میں فراغت کے سبب خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اہل حدیث یوتھ فورس کے پہلے صدر محمد خان نجیب اور پہلے سیکرٹری جنرل قاضی عبدالقدیر خاموش تھے اور 23 مارچ 1987ء تک یہ دونوں دوست ہی اس نظم کو چلاتے رہے۔ دونوں ہی بہت باصلاحیت اور ذہین تھے اور اس پر مزید یہ کہ باذوق بھی تھے۔ چنانچہ اس کنونشن کی تیاریاں بہت خوبصورت اور عمدہ انداز میں کی جا رہی تھیں۔ مشہور خطاط عبدالرشید قمر سے کنونشن کے اشتہار طبع کروائے گئے۔ بہت خوبصورت دعوت نامہ بھی تیار کروایا گیا۔ یہ دعوت نامہ اتنا خوبصورت تھا کہ آج بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ گلابی رنگ کی زمین پر سنہری بیل بوٹوں سے مزین یہ دعوت نامہ خطاطی اور طباعت کا شاہکار تھا۔ اس کے علاوہ تنظیم کا دستور بھی مرتب کیا گیا۔ وہ بھی اسی اعلیٰ معیار پر شائع

کیا گیا۔ اس کے سرورق کے رنگ سیاہ، سرخ اور سبز پٹیوں میں تھے، ترتیب کے فرق کے باوجود ان کی پیپلز پارٹی کے جھنڈے سے مماثلت ہوگئی۔ اس پر بہت اعتراض اٹھا لیکن کچھ دن بعد اعتراض کرنے والے 'ٹھنڈے'' ہو گئے۔ ویسے بھی پیپلز پارٹی کا نام سن کر ہمارے مذہبی ''دانش ور'' ذرا جذباتی ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی برائی بڑی برائی کے خود ساختہ معیار اور وہ بھی بغیر دلیل کے، ذاتی تعلقات، پسند اور ناپسند کی بھینٹ نظریات کو بھی چڑھا دیا جاتا ہے۔ ایک لوٹا بن کر پی پی میں چلا جاتا ہے تو بڑی برائی بن بن جاتا ہے، واپس مسلم لیگ میں آ جاتا ہے تو پھر چھوٹی برائی ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض افراد کے نزدیک وہ برائی رہتا ہی نہیں۔ اس لیے کہ مسلم لیگ ان کے ہاں پاک پوتر لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے کہ جس کی قیادت شرفاء کے پاس ہے۔ ع

ہے الگ ہی سارے جہاں سے حضرتِ شیخ کا فلسفہ
جو یہاں پیو تو حلال ہے جو وہاں پیو تو حرام ہے

کنونشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ میں روزانہ جمعیت کے دفتر چلا جاتا۔ خوب مزے کے دن تھے۔ آخر کنونشن کا دن آ گیا۔ بہت شاندار کنونشن تھا۔ بہترین تقاریر، نوجوان جذبات سے معمور، سارا کچھ ہی بہت اچھا تھا۔

عبداللطیف انور میرا بہت اچھا دوست ہے۔ خانیوال سے اس کا تعلق ہے۔ حضرت علامہ کا جیالا ہے۔ علامہ بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ بھی کنونشن کے انتظامات میں شریک تھا۔ اس روز وہ میرے پاس آیا۔ ایک نوجوان مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے ''یار ابوبکر اس کی تقریر کروانی ہے'' میں ان صاحب کو لے کر سٹیج پر چلا گیا۔ ان کی تقریر ہوگئی۔ آج کل وہ مولوی صاحب بھی بڑے لیڈر بن چکے ہیں۔ انہوں نے الگ ذاتی جماعت بنا لی ہے اور اس کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ کچھ لوگ جن کا اس کنونشن میں وجود بھی نہ تھا، کسی شمار میں تھے نہ قطار میں، سنا ہے آج کل شمار میں بھی ہیں قطار میں بھی۔

اس کنونشن کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ علامہ شہید اس کنونشن کے موقع پر پاکستان سے باہر تھے اور کچھ دن بعد واپس تشریف لائے۔ کامیاب پروگرام پر اپنے نوجوانوں سے بہت خوش ہوئے۔ اس پر ناراض ہوئے نہ سیخ پا کہ اتنا بڑا کنونشن کیا، سارے پاکستان سے نمائندہ افراد آئے اور میرا انتظار تک نہ کیا کہ چند روز پروگرام ہی مؤخر کر لیا ہوتا۔

ایک روز مکتبہ قدوسیہ پر محمد خان نجیب، قاضی عبدالقدیر خاموش اور ان کے ساتھ آغا محمود یورش تشریف لائے۔ اسی دستور کا مسودہ ان کے پاس تھا۔ وہ میرے والد کو یہ مسودہ پڑھ کر سنا رہے تھے اور راہنمائی چاہ رہے تھے۔ میرے والد جا بجا تصحیح کرا رہے تھے۔ آخر کار یہ مسودہ پایہ تکمیل کو پہنچا اور رنگوں میں لپٹا دستور منظر عام پر آیا۔ اس طرح یہ بات طے ہے کہ اہل حدیث یوتھ فورس کا دستور ان حضرات نے لکھا تھا اور اس دستور میں یہ بات کہیں بھی درج نہیں تھی کہ اہل حدیث یوتھ فورس جمعیت اہلحدیث کی ذیلی تنظیم ہو گی۔ یہ نوجوانوں کی ایک آزاد تنظیم تھی جس کے مقاصد وہی تھے جو جمعیت اہلحدیث کے تھے۔ اس کی اپنی شوریٰ، اپنی عاملہ تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جمعیت اہلحدیث دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کی قیادت جمعیت علماء اہلحدیث کے نام سے قاضی عبدالقدیر خاموش کر رہے تھے، دوسرے دھڑے کا ذکر؟ یاروں کے مزاج نازک ہیں اور اپنے پر جلتے ہیں۔ کچھ سالوں بعد قاضی عبدالقدیر خاموش بھی خاموش ہی ہو گئے اور ہم تو پہلے ہی تھکے بیٹھے تھے۔ چپکے سے اپنے کاروبار میں مگن ہو گئے۔ میری تو اب یہ کیفیت ہے کہ میں اپنے دفتر میں جماعتی سیاست پر گفتگو بھی کرنا پسند نہیں کرتا۔ ع

کبیر کھڑے باجار میں
سب کی مانگیں خیر
نہ کسو سے دوستی
نہ کسو سے بیر

بہرحال علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید والی جمعیت اہلحدیث باضابطہ ختم ہوگئی۔ ممکن ہے کسی کو اس جملے پر اعتراض ہو۔ مگر میں ایسے ہی سمجھتا ہوں البتہ بات احتیاط سے کرتا ہوں کہ ہماری جماعت میں رواداری اور برداشت کا فقدان ہے۔ اگر آپ کسی پر ذرا سی بھی تنقید کر دیں تو اس کی آنکھیں سرخ ہو جائیں گی۔ کف اڑاتا آپ کی ذات پر براہِ راست کیچڑ اچھالنے پر آ جائے گا۔ بلکہ اس پر وہ قناعت نہیں کرے گا، آپ کے بزرگوں تک پہنچے گا۔ دین متین کے علمبرداروں کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ وہ کس قسم کی روایات کو فروغ دے رہے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ ترین جماعتی سطح پر تنقید کو شخصیت کا انکار سمجھا جاتا ہے اور یہ کسی کو گوارا نہیں۔ حالانکہ اگر کوئی صاحب عقل ہو تو وہ تنقید سے گھبرانے کی بجائے اس سے اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے کہ ان کا تدارک کر سکے۔ مگر یہاں ؏

ہم الٹے ، یار الٹا ، ہر کار الٹا

بہرحال اس جھگڑے میں جس میں ہم بھی فریق تھے، جمعیت اہلحدیث کے دو ٹکڑے ہو گئے اور میں سمجھتا ہوں یہ ایک بڑا جماعتی المیہ تھا، جس کا تجزیہ کرنا آج بھی ضروری ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ ؏

نہیں حالِ دلی سنانے کے قابل
یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل

ذکر تنقید برداشت کرنے کا ہو رہا تھا۔ ایک دلچسپ واقعہ مجلس شوریٰ کے اجلاس کا بھی تھا۔ جمعیت اہلحدیث کی شوریٰ کا اجلاس لارنس روڈ پر ہو رہا تھا۔ یہ حضرت علامہ کی زندگی کا شاید آخری اجلاس تھا مجلس شوریٰ کا۔ وہ اجلاس وہ مناظر اس دن کے واقعات آج بھی ایک فلم کی طرح میری لوح دماغ پر چل رہے ہیں۔ اس دن کئی دلچسپ واقعات پیش آئے۔ میں سولہ کے سن میں تھا، اور یہ بڑا خطرناک سن ہوتا ہے۔ مجھے بھی

"دور کی سوجھی" کہ محبت تو بہرحال اندھی ہوتی ہے۔ میں نے اہل حدیث یوتھ فورس کے درجن بھر جھنڈے لیے اور دفتر کی عمارت پر چڑھ گیا۔ جا بجا جھنڈے لگا دیئے بلکہ یوں کہیے "پھریرے لہرا دیئے"۔ ابھی جھنڈے کا تعارف نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بہت سوں کے لیے یہ کپڑے کا اجنبی ٹکڑا ٹھہرا۔ ایک صاحب نے مائیک پر آ کر کہہ دیا کہ یہ کس جماعت کے جھنڈے لہرائے جا رہے ہیں۔ کچھ تکرار ہوئی مگر معاملہ تھوڑے پر ہی ختم ہو گیا۔ اب جب سوچتا ہوں تو درجن بھر جھنڈے لہرانے کی اپنی منطق بھی سمجھ نہیں آتی۔ پھر ایک اور جھگڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا جب مولانا یزدانی شہید کے ڈرائیور نے ایک مولانا کو چپت دے ماری۔ اس کی کچھ تفصیل گذر چکی۔

شوریٰ کا اجلاس جاری تھا۔ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے مولانا بشیر احمد سیالکوٹی نے تقریر شروع کی۔ دوران تقریر انہوں نے بعض عجیب باتیں کر دیں، جس سے ماحول اچھا خاصا تلخ ہو گیا۔ مولانا شمشاد احمد سلفی ان دنوں جمعیت کے دفتر میں ہوتے تھے اور اہل حدیث یوتھ فورس کی تنظیم سازی کے لیے خاصے سرگرم تھے۔ دوسری طرف مولانا سلفی پیپلز پارٹی کے باقاعدہ رکن تھے اور ضلع شیخوپورہ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اسی طرح مولانا سلفی ان دنوں میدان مناظرہ میں بھی اہل حدیث کا واحد دفاعی حصار تھے۔ خاصی دل چسپ صورت حال تھی۔ مولانا بشیر احمد سیالکوٹی نے اس حوالے سے تنقید شروع کر دی۔ مولانا کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ کہنے لگے کہ دفتر پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہے۔ بہرحال یہ بات دینی حوالے سے گالی کے مترادف تھی اور حقیقت سے بھی کوسوں دور تھی۔

مولانا شمشاد سلفی پیپلز پارٹی میں ضرور تھے مگر جمعیت میں وہ باضابطہ کسی عہدے پر متمکن نہ تھے نہ جمعیت کے باضابطہ رکن تھے۔ علامہ شہید نے ان کے تحرک اور ان کی تنظیمی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں اپنی معاونت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ دوسری طرف

جب پورے پاکستان میں (مولانا) امین اوکاڑوی نے اہل حدیث کے خلاف نفرت اور تعصب کا محاذ گرم کیا ہوا تھا۔ اہل حدیث کی طرف سے یہ ''کمیونسٹ'' ہی ہر محاذ پر پہنچ رہا تھا۔

مولانا بشیر احمد نے جب یہ جملہ کہا تو ماحول کشیدہ ہو گیا۔ میرے والد شدید غصے میں آ گئے اور ان کی تقریر کے دوران ہی ان کو جواب دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ مولانا بشیر احمد ان کے گہرے دوست تھے۔ جامعہ سلفیہ میں روم میٹ بھی تھے اور ہاسٹل کی زندگی کا یہ رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ جب میرے والد ان کی طرف بڑھے تو علامہ شہید نے ان کے تیور بھانپ لیے۔ انہوں نے میرے والد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''قدوسی صاحب رہنے دیں یہ جو کہتے ہیں، کہنے دیں۔'' اس پر میرے والد رک گئے اور تب مولانا بشیر احمد نے جو دل چاہا کہا۔ ہاؤس میں بے چینی بھی پھیل رہی تھی۔ جب ان کی گفتگو ختم ہوئی تب علامہ شہید مائیک پہ آئے اور تاریخی تقریر کی۔ کمال کا ضبط تھا اس بندے میں۔ اتنے حوصلے سے تنقید سننا ان کا ہی یارا تھا۔ آج کل کے لیڈر۔ اس قدر تلخ گفتگو کا عشر عشیر سن کر ہی بندے کا نام خاموشی سے اگلے اجلاس سے نکلوا دیتے ہیں یا اس کے حامی اس کو اٹھا کر باہر پھنکوا دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب علامہ شہید نے مولانا کی گفتگو کا جواب دینا شروع کیا تو مولانا سے برداشت ہی نہ ہو سکا۔ حالانکہ علامہ کا جواب کہیں زیادہ مہذب اور کہیں کم تلخ تھا اور مولانا اجلاس کا بائی کاٹ کر کے چل دیئے۔

اس دن اجلاس کی کاروائی ریکارڈ کرنے کا انتظام نہ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر بھائی عبدالمجید شاکر نے ریکارڈنگ کا انتظام کیا۔ میں نے چھوٹی سی ٹیپ ریکارڈر ہاتھ میں پکڑ کر علامہ شہید کے قدموں میں بیٹھ کر یہ تاریخی گفتگو ریکارڈ کی۔ آج جب یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں، میرا تصور مجھے وہیں علامہ شہید کے قدموں میں لیے بیٹھا ہے، سامنے

صوفے پر بیٹھے میرے والد بھی دیکھ رہے ہیں...... ؏

مٹی قبر تیری دی لے کے

اکھیں سرہاں پانواں

اس اجلاس کے کچھ دن بعد ہی مارچ کا پہلا عشرہ آن پہنچا۔ علامہ سعودی عرب اور دیگر ممالک کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے چند روز ہو چلے تھے کہ علامہ کا فون آیا۔ میرے والد سے شکوہ کرنے لگے کہ ''آج تیسرا روز ہے، واپس آئے ہوئے اور آپ نے خبر تک نہ پوچھی۔'' پھر کہنے لگے۔ ''بس پھر میں خود آ رہا ہوں۔'' کچھ ہی دیر میں مکتبہ قدوسیہ آ موجود ہوئے۔ میں بھی کالج سے فارغ ہو کر مکتبے پر ہی موجود تھا۔

والد محترم اور علامہ باہم گفتگو میں مصروف ہو گئے اور میں پاس ہمہ تن گوش ہو کر ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ علامہ اپنے سفر بیت اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔

''قدوسی صاحب اس بار عجیب سی بات ہوئی۔ میں حرم میں بیٹھا تھا کہ سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کی (فلاں) عبارت ذہن میں آ گئی۔ بس ایک دم دل بھر آیا اور جیسے خیالوں میں رب سے کہنے لگا: اللہ! میں نے تیرے دین کی سربلندی کے لیے اپنی جان و مال اور عزت کی پروا تک نہیں کی۔ سب کچھ داؤ پر لگا دیا تیرے راستے میں اور میرے دشمن میرے حاسد پھر بھی زندہ اور خوش باش نظر آتے ہیں۔ مایوسی کی یہ سوچ دل اور دماغ پر غالب تھی کہ اونگھ آ گئی اور یوں جیسے کسی نے کان میں کہا:

''تم عجیب آدمی ہو، ہم نے تجھے عزت دی، دولت دی، شہرت دی اور ایسی عزت دی کہ تیرے مخالف روز صبح اٹھتے ہیں۔ تیرا ذکر سنتے، دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور روز جلتے اور مرتے ہیں کیا تو چاہتا ہے کہ ایک بار ہی مر جائیں۔'' اس کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ بے اختیار میں نے اللہ کا شکر ادا

کیا، کہ جس نے یہ بات سمجھا دی اور مایوسی کی لہر دل سے دور کر دی۔

یہ علامہ کی مکتبہ قدوسیہ آخری آمد تھی۔

اور پھر یہ ہوا کہ بہت جلد، بہت ہی جلد تیئس مارچ کی شام آن پہنچی۔ راوی کے پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر گیا، لیل و نہار نے کتنی گردشیں مکمل کر لیں۔ مگر سارا کچھ وہیں پر ٹھہر گیا ہے۔ ان کا چہرہ مسکراتا ہوا آج بھی نظر کے سامنے ہے۔ اور پھر جب میں ان کے تار تار وجود کو اٹھائے چل دیا۔ وہ شدید زخمی تھے۔ نیم بے ہوش۔ سارا وجود چھلنی۔

وہ میری بانہوں میں تھے۔ میں نے ان کو پکارا۔ خون آلود سانس جیسے جواب دینے کی کوشش۔ میرے جو احساسات تھے وہ تو تھے، مگر دل پر عجیب واردات گزری۔ میں جیسے اس حالت میں ان کے محسوسات میں اتر گیا۔ ع

تن من میرا پرزے پرزے
جیویں درزی دیاں لیراں ہو

مجھے لگ رہا تھا ان کو شدید جسمانی تکلیف تھی مگر وہ میرے لیے اذیت میں تھے، فکر مند تھے۔ ع

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زبان میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا، بہت لطف وصل و درد فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم کہیں بھی نہیں

ہمارا راستہ ابتلاؤں کا راستہ ہے ہمارا راستہ آزمائشوں کا راستہ ہے، ہمارا راستہ کٹھنائیوں کا راستہ ہے، ہمارے ساتھ چلے تو کوئی آبلہ پا چلے۔ جس نے اپنے پیروں کو پھول باندھے ہوئے ہوں وہ بازارِ گناہ میں چلا جائے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم کانٹوں پہ چلنا سیکھے، ہم تلواروں کی دھاروں پر رقص کرنا سیکھے، ہم بندوقوں کے سامنے محمد ﷺ کی عظمت کے لیے کھڑا ہونا سیکھے۔ ہم مارشل لاء کے سامنے قرآن وسنت کی بالا دستی کے لیے سر اُٹھا کے جینا سیکھے۔ جو سر جھکانا چاہے وہ داتا دربار چلا جائے ہم کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہنستے ہو میں صاف کہتا ہوں جس نے سر جھکا کے جانا ہے پھر وہ اہلحدیثوں کو بدنام نہ کرے۔

23 مارچ۔ 1987

ما کنت احسب قبل دفنك فی الثریٰ
ان الکواکب فی التراب تغور
ما کنت آمل قبل نعشك ان اریٰ
رضویٰ علی ایدی الرجال تسیر

تیرے دفن سے پہلے مجھے گماں نہ تھا
کہ چمکتے ہوئے تارے بھی مٹی میں مل جاتے ہیں۔
تیرا جنازہ اُٹھنے سے پہلے مجھے خیال نہ تھا
کہ رضویٰ پہاڑ آدمیوں کے ہاتھوں پر چلے گا۔

جنّت کا راستہ

لوگو آ ؤ! مجھے تمہاری ضرورت ہے اپنی ذات کے لیے نہیں۔ خدا کی قسم ہے اپنی ذات کے لیے نہیں، اپنے مقاصد کے لیے نہیں، مجھے تمہاری ضرورت ہے رب کی کبریائی کے لیے، محمد ﷺ کی مصطفائی کے لیے لیکن یاد رکھو میرا راستہ پُر خطر ہے۔

اور انشاء اللہ پھر سن لو کبریا کی ذات والا صفات کی قسم ہے میں اپنے جیتے جی میں تمہیں جنت کی طرف لے کر جاؤں گا۔ میں تمہیں لڑاؤں گا اور انشاء اللہ ہم اس طرح لڑیں گے جس طرح لڑنے کا سبق ہمارے آقا ﷺ نے دیا ہے۔

23 مارچ 1987ء

23 تاریخ تھی۔ اس روز میرے والد بہت خوش ہوں گے جو انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ آج میرے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام میں نے ابوبکر رکھا۔ پھر سات روز بعد 30 تاریخ تھی۔ آج پھر وہ ڈائری لکھ رہے تھے۔ آج ابوبکر کا عقیقہ تھا جس میں مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا حنیف ندوی اور حافظ احسان الٰہی ظہیر بھی شریک ہوئے۔

پھر کئی ماہ و سال بیت گئے۔ آج پھر 23 تاریخ تھی مگر وہ گھر ہی واپس نہ آئے اور نہ ڈائری لکھ سکے۔ آج وہ دنیا سے چلے گئے۔ ٹھیک سات روز بعد پھر 30 تاریخ تھی نہ ڈائری تھی نہ صاحب قلم۔ ہاں ڈائری کے مہمان حافظ احسان الٰہی ظہیر تھے لیکن صبح دم وہ بھی ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ ؎

ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

پتا نہیں کیوں ہم دوستوں کو فروری کے اواخر میں کیا خیال دل میں سمایا کہ ہم بھی ایک بڑا جلسہ کریں۔ میں نے اپنے والد سے کہا کہ ہم راوی روڈ میں جلسہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے منظوری دے دی۔ ہم دوست مل کر 50۔ لوئر مال جا پہنچے۔ اوپری منزل پر علامہ نے اپنی لائبریری بنائی تھی۔ بالکل نئی جگہ۔ اجلی اجلی سی ہر شے نکھری ہوئی۔

بالکل علامہ کے حسن کی طرح، اوپر سے علامہ کے شوق۔ ہم ہاتھ سے بنے ہوئے قالین پر جہاں علامہ شہید کی نشست تھی، دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ ؏

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے! بیٹھ گئے

ہم علامہ سے جلسے میں آنے کا وعدہ لے کر اٹھے۔ کسے معلوم تھا کہ آہوں اور حسرتوں کا دھواں اٹھا ہے، ہم نہیں اٹھے۔

دیکھ کہ دل سے کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

چند روز گزارے اور دوستوں کی معیت میں گوجرانوالہ کی نواحی بستی کامونکی جا پہنچے۔ جہاں حضرت یزدانی کی بیٹھک تھی۔ مسکراتا ہوا روشن چہرہ، سرخ وسفید رنگ، شرم وحیا کا مجسمہ، خوبصورت آدمی تھے۔ برفی سے ہماری تواضع کی۔ جس کی مٹھاس آپ کے مزاج کی طرح آج بھی تازہ ہے۔

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقی گلفام
وہ عکسِ رخ یار سے لپکے ہوئے ایام

مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی کو 23 مارچ کو کوئی مصروفیت تھی۔ کامونکی کے قریب واقع قصبے سادھوکی گاؤں میں ان کی تقریر ہونا تھی۔ ہمارے اصرار پر آپ نے وہاں سے فارغ ہو کر جلسے میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ ہمارا کیا اصرار تھا، مشیت الٰہی انہیں لے کر آ رہی تھی۔ اسی طرح دوسرے احباب اور بزرگوں سے وقت طے کر لیا گیا۔ اب اشتہار چھپوانے کا مرحلہ تھا۔ طے یہ پایا کہ اشتہار انتہائی اعلیٰ معیار کا ہونا چاہیے۔ ہمارا تعلق طباعت کے میدان سے تھا اس لیے یہ فریضہ بھی ہمارے کاندھوں پر تھا۔ چنانچہ اس کے لیے معروف خطاط عبدالرشید قمر سے رابطہ کیا گیا۔ عبدالرشید قمر خطاطی میں پاکستان میں نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں۔ ان

دنوں استاد عبدالرشید قمر کے لکھے ہوئے اشتہارات در و دیوار پر چھائے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان کے ہاں جا پہنچے۔ ہم نے ان سے مطالبہ کیا کہ جو لکھا گیا سو لکھا گیا اور آج تک جو اشتہار چھپ گئے سو چھپ گئے۔ لیکن اب کے کچھ جدا ہونا چاہیے۔ وہ بھی اس بات پر متفق تھے بلکہ کچھ پرجوش بھی۔ عمر کے تفاوت کے باوجود میرا ان کا یارانہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ میرے اور میرے والد کے مشترکہ دوست تھے۔

شاید 1982ء کے سال کی کوئی شام تھی۔ ایک صاحب گورے چٹے میرے والد کے پاس بیٹھے اپنے ساتھ بیتے حادثے کا ذکر کر رہے تھے کہ کس طرح موٹر سائیکل چلاتے چلاتے تیز ڈور نے ان کا ہاتھ اور چہرے کا کچھ حصہ کاٹ کر رکھ دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کون تھے؟ انہوں نے بتایا یہ مشہور خطاط عبدالرشید قمر تھے۔ پھر 1982ء میں ہی ہم نے اہل حدیث یوتھ فورس راوی روڈ کے زیر اہتمام ہفتہ وار درس کا پروگرام رکھا تو اس کے دعوت نامے کی خطاطی کے لیے میں ان کے پاس گیا اور یہ جانا دوستی میں بدل گیا۔

ذکر تھا قمر صاحب سے اپنے مطالبے کا کہ اشتہار کمال کا ہونا چاہیے۔ سو جناب عبدالرشید قمر نے ایسا ہی اشتہار لکھا۔ شاید ویسا دوبارہ نہ لکھا۔ سرخ زمین پر سفید اُجلے الفاظ۔ اس سے پہلے کبھی انہوں نے اتنی سرخ زمین والا اشتہار نہ شائع کیا تھا۔ انفرادیت کے شوق میں ہم نے بھی پسند کیا۔ یہ خون رنگ اشتہار جب شائع ہوا تو ہر کسی نے پسند کیا۔ پورے اشتہار پر حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر کا نام چھایا ہوا تھا۔ دائیں طرف نچلے کونے سے شروع ہو کر بائیں طرف بلندی کو چھو رہا تھا۔ یہ اشتہار علامہ کو بھی بہت پسند آیا۔ انہیں تو ویسے بھی عبدالرشید قمر کی خطاطی پسند تھی۔ دونوں شیخ بھی تھے اور شیخوں والی کوئی بات عبدالرشید قمر میں ہے نہ علامہ میں تھی۔ دل کے بھی کھلے اور ہاتھ کے بھی کھلے۔ بادشاہوں کا سا مزا۔ ایک بار علامہ کا مزاج کچھ برہم ہو گیا کہ عبدالرشید قمر

کا ہر کام میں تاخیر کرنا ضرب المثل تھا۔ لیکن پھر یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے بات ختم کر دی کہ "چلو یار ظالم لکھتا بھی تو بہت کمال کا ہے۔"

اب مرحلہ تھا اشتہار لگانے کا۔ ہم سب دوست روزانہ رات کو خود یہ اشتہار سارے شہر میں لگاتے رہے۔ یہاں میں ان دوستوں کا کچھ تعارف کرا دوں جو اس جلسے کے انتظامات میں ہر چیز بھولے ہوئے تھے۔

رانا جاوید رفیق میرے ماموں زاد تھے۔ ان کے علاوہ اس وقت کے ناظم دفتر جمعیت محمد یعقوب، افضل انصاری اور محمد حنیف وغیرہ۔ ہم دوست رات کو اشتہار لگانے نکل جاتے۔ چوراہوں میں اشتہار لگانے کے لیے شاندار اور نمایاں قسم کے کونے ڈھونڈنے میں یعقوب کا ثانی کوئی نہ تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، لمبی داڑھی و شوخ طبیعت۔ جملے بنانا اور شغل لگائے رکھنا اس کا خاصہ تھا۔ ہم اس کو مولوی یعقوب کہتے تھے۔ وہ کچھ تک بندی کر لیتا تھا اور ہم اسے مذاق میں شاعر جنوب آفتاب یعقوب بھی کہتے۔ جب بہت نمایاں اور اونچی جگہ اشتہار لگا لیتا اور پھر ہمارے انکار کے باوجود وہ اکٹھے دو تین اشتہار ایک ہی جگہ لگا لیتا تو مسکراتے ہوئے کہتا "دیکھا کیسا ڈیزائن بنایا ہے۔" کبھی ہم ہنس پڑتے کبھی الجھتے۔ "چل یار اگے چل" لیکن ہوا یوں کہ اس کے بنائے ہوئے یہ ڈیزائن علامہ شہید کو بہت پسند آئے۔ چند روز بعد یہ منظر تھا کہ لاہور میں جس طرف نکل جایئے مولوی یعقوب کے ڈیزائن نظر آ رہے تھے۔ چن چن کر نمایاں جگہوں پر اس طرح اشتہار لگائے گئے کہ "جدھر دیکھتا ہوں تو ہی تو" کا منظر تھا۔

چند روز میں ہی لاہور کے چند دوست علامہ سے تقریر کے لیے وقت لینے گئے تو آپ نے ان سے بھی ذکر کیا کہ دیکھو کام اس طرح کرنا چاہیے جس طرح راوی روڈ والوں نے کیا ہے۔

انہی تیاریوں میں 23 مارچ 1987ء کا دن بھی آ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا، جب ہم

نے جلسہ گاہ کی تیاری کا آغاز کیا۔ ہم دوست قلعہ چھمن سنگھ چوک میں اکٹھے ہوئے۔ تب اسے گول چوک کہا جاتا تھا، کہ اس کے بیچ میں ایک گول چبوترہ بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف بازار نکلتے تھے۔ پہلو میں ایک پارک تھا۔ اب سوال اٹھا کہ اسٹیج کہاں بنایا جائے۔ بعض دوستوں کی رائے تھی کہ جلسہ اسی سبزہ زار میں کرلیا جائے۔ جب ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچے تو سب دوست مل کر میرے والد محترم مولانا قدوسی کی طرف چل دیئے۔ وہ اس وقت چھٹی کی وجہ سے گھر میں تھے اور مطالعے میں مصروف تھے۔ ہماری استدعا پر وہ گول چوک تک تشریف لائے۔ ہم نے ان سے راہنمائی چاہی تو انہوں نے فرمایا اس گول چبوترے پر اسٹیج سجا لو اور کرسیاں سر بازار لگا لو۔ سو اس پر سب نے سر تسلیم خم کر دیئے اور اسٹیج کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا۔ جب حادثہ ہو گیا تو بڑے بڑے بزرجمہر اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے اور اپنے اپنے فلسفے ''رولتے'' رہے کہ اسی کو پکڑو جس نے یہاں اسٹیج بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہم سنتے اور ہنس دیتے۔ میرے ماموں زاد رانا جاوید کی دکان سے اینٹیں منگوائی گئیں اور دیگر سامان بھی۔ مغرب کے وقت تک اسٹیج تیار تھا۔ اس پر قالین بچھائے گئے۔ یہ قالین ہاتھ کے بنے ہوئے تھے اور بہت قیمتی تھے۔ آج ان کی قیمت کئی لاکھ روپے ہوگی۔ مولوی یعقوب کے کچھ عزیز ان قالینوں کا کاروبار کرتے تھے اور وہ ان کے ہاں سے اٹھا لایا۔ سٹیج کا سامان ساتھ ہی واقع محفل ٹینٹ سروس سے لے لیا گیا تھا۔ یہ ہی آج تک حافظ ابتسام الٰہی ظہیر کی عید گاہ کے انتظامات بھی کرتے ہیں۔ اس کے مالک محمد سلیم میرے کلاس فیلو بھی ہیں کہ مولانا محمد ادریس ہاشمی جماعت غربا والے، ہم دونوں کے استاد تھے۔ قالین بچھ گئے تو اس پر رکھنے کے لیے صوفے میرے بڑے ماموں رانا محمد اکرام ایڈووکیٹ کے گھر سے منگوائے گئے۔ میرے ماموں پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر میرے والد کی وجہ سے علامہ شہید سے ایک اچھا تعلق تھا۔ میرے والد کی شہادت کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو آپ سے

تعلق کی بنا پر میرے والد کی تعزیت کرنے ہمارے ہاں تشریف لائی تھیں۔ بہر حال ''میڈ ان پی پی پی'' صوفے بھی آ گئے اور اسٹیج تیار ہو گیا۔ طارق ساؤنڈ سروس والے بھی اپنے ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے۔ یہ کمپنی ہی علامہ شہید کے اہم جلسوں اور نماز عید وغیرہ کے مواقع پر ہارن وغیرہ لگاتی تھی۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ لوگ آنے شروع ہو گئے اور روشنیاں بھی جلا دی گئیں یا یوں کہیے کہ مقتل سج چکا تھا۔ کربلا کا میدان معرکہ آرائی کا منتظر تھا۔

ہم نے پیسے اکٹھے کر کے روزنامہ جنگ میں جلسے کا اشتہار دیا تھا۔ اس وجہ سے اس جلسے کی خبر دور دور تک پھیل گئی۔ اس اشتہار میں حضرت علامہ شہید، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی، جناب محمد خان نجیب اور قاضی عبدالقدیر خاموش کے نام نمایاں تھے۔

اسی شام ایک بے حد اہم واقعہ یہ ہوا کہ مغرب سے ذرا پہلے قاضی عبدالقدیر خاموش کے ماموں حاجی رحمت اللہ صاحب لاہور کے میو ہسپتال میں وفات پا گئے۔ وہ پشاور کے رہائشی تھے اور علامہ کی جمعیت اہل حدیث صوبہ سرحد کے امیر بھی تھے۔ حضرت علامہ سے ان کا جماعتی سے کہیں زیادہ ذاتی تعلق تھا۔ ان کی نازک حالت کے پیش نظر ان کی ساری فیملی عامر ہوٹل لوئر مال میں پہلے سے قیام پذیر تھی۔ ان کی وفات کے سبب قاضی عبدالقدیر خاموش جلسے میں نہ آ سکے اور ایمبولینس پر میت لے کر آبائی گاؤں چلے گئے۔ جنازے کا وقت صبح سویرے رکھا گیا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ علامہ کو ان کے دوست کی وفات کی اطلاع نہ دی جاتی۔ جب قاضی صاحب نے علامہ صاحب کو حاجی صاحب کی وفات کی اطلاع دی تو آپ نے جنازے کا وقت آگے کرنے کا کہا اور یہ بھی کہا کہ جنازہ میں خود آ کے پڑھاؤں گا۔'' اب قاضی عبدالقدیر خاموش تو اپنے ماموں اور امیر جمعیت اہل حدیث صوبہ سرحد کی میت لے کر گاؤں چلے گئے۔ مگر قاضی عبدالقدیر خاموش کا جانا گویا قیامت کا آنا تھا۔ یاروں نے وہ فسانے گھڑے کہ اللہ کی

پناہ۔ اپنے مقام پر اس طلسم ہوش ربا کی مانند افسانے کا ذکر آئے گا، فی الحال ہم واپس جلسہ گاہ میں چلتے ہیں۔

جب اسٹیج سج چکا، رات کا اندھیرا چھا چکا تو اپنے دماغ کی بتی جل اٹھی کہ ہاں بھئی اس جلسے کی تو ویڈیو بھی بنی چاہیے۔ اب ہم نے اپنے بڑے تایا زاد بھائی عبدالمجید شاکر کو ڈھونڈا اور اپنی فرمائش ان کے گوش گزار کی۔ وہ کہنے لگے یار یہ وقت ہے بھلا اس کام کا؟ اب میں کہاں سے اس وقت بندہ لاؤں ویڈیو بنانے والا۔ ایک دم ذہن میں آیا کہ اس چوک میں بھی تو ایک دکان ہے۔ سلیم پرنس فوٹو سٹوڈیو۔ ان کے پاس گئے، عرض گزاری۔ انہوں نے ذرا بڑھا کے دام بتائے۔ ہم دینے کے لیے تیار تھے۔ وہ اپنا کیمرہ وغیرہ لینے گھر چل دیئے اور یوں سلیم پرنس بمعہ ایک ساتھی جو کہ ان کے برادر نسبتی بھی تھے، تھوڑی دیر میں ہی جلسہ گاہ میں آ گئے اور اپنا کیمرہ نصب کر لیا اور یوں یہ بھی انتظام ہوا کہ یہ تاریخی جلسہ اپنے مناظر سمیت محفوظ ہو گیا۔ آج اندازہ ہو رہا ہے کہ اپنے دماغ کی بتی جو جلی تھی کہ ویڈیو بن جائے، وہ سلیم صاحب کی زندگی کی بتی بجھانے کا سامان تھا۔ ان کی بیوہ جو اب خود بھی مرحومہ ہو چکی ہیں، بتاتی تھیں کہ ”میں نے ان کو منع کیا تھا مولویوں کا جلسہ ہے، نہ جاؤ لیکن وہ نہ مانے اور کہنے لگے محلے دار ہیں اور پیسے بھی معمول سے خاصے زیادہ دے رہے ہیں، یہ کہا اور چل دیئے۔“

عشاء کی نماز گزرنے کی دیر تھی کہ پنڈال بھرنا شروع ہو گیا۔ ابتدائی مقررین نے تقاریر شروع کر دیں اور یوں جلسے کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔ تب تک کسے خبر کہ یہ جلسہ ایک محلے کا عام سا جلسہ نہیں رہے گا۔ مہمانوں کے وقتی قیام اور طعام کا انتظام ہمارے گھر میں تھا۔ خاص مہمان وہاں آنا شروع ہو گئے۔ محمد خان نجیب صدر اہل حدیث یوتھ فورس پاکستان تشریف لا چکے تھے۔ جناب مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی بھی آ چکے تھے۔ قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی نے بھی جلسے میں آنا تھا مگر وہ نہ آ سکے۔ محمد خان

نجیب کو ہم نے تقریر کے لیے اسٹیج پر بھیج دیا تھا۔ اس دوران سیاہ رنگ کی شاندار ہنڈا اکارڈ پر سیاہ کپڑے زیب تن کیے ایک شاندار آدمی آیا۔ واقعی ایک شاندار آدمی تھا۔ جی ہاں علامہ شہید آئے تھے اور بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں خیال نہیں کرتے تھے کہ ایسے خوبصورت نہیں لگنا چاہیے۔ نظر لگ جاتی ہے۔ بس اس دن کسی کی نظر ہی لگ گئی۔ آپ گاڑی سے اترے اور اندر تشریف لے آئے۔ باتوں کا اور کھانے کا ہلکا پھلکا دور چلتا رہا۔ آپ کہیں سے جا کر بہت کم کھانا کھاتے تھے۔ واپس گھر آکر کھانے کا تقاضا کرتے۔ خالہ جی یعنی آپ کی اہلیہ مرحومہ کہتیں (میں ایسے ہی ان کا ذکر کرتا ہوں) آپ بھی کمال کرتے ہیں کھانے پر بیٹھ کر کھائے بغیر آ جاتے ہیں۔ لیکن اس روز آپ کو واپس نہ جانا تھا، اس لیے کھانا اپنے معمول کے مطابق کھایا۔ باتیں شروع ہو گئیں۔ پھر کچھ خاص باتیں ...... آپ نے سب کو کمرے سے نکال دیا صرف مولانا یزدانی، مولانا قدوسی اور آپ کمرے میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد اذن ہوا کہ اندر آ جاؤ۔ راز و نیاز کی مجلس ختم ہوئی۔

اس روز ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ لکھ چکا ہوں کہ مولانا شمشاد احمد سلفی اور علامہ کے بیچ 18 اپریل 1986ء کے موچی دروازے کے جلسے سے پہلے ناراضی ہو گئی تھی۔ سال بھر کی اس دوری نے سب دوستوں کو بے چین رکھا تھا۔ اس دن میرے والد محترم نے مولانا شمشاد سلفی کو بھی بلا لیا تھا کہ موقع پا کر علامہ سے ان کی صلح کروا دیں گے۔ علامہ کہاں ایسے دل کے سخت تھے لیکن نہ جانے کیوں یہ معاملہ اتنا لمبا ہو گیا۔ اصل میں علامہ کو مولانا شمشاد سلفی سے گہرا دلی تعلق تھا اور جہاں توقعات زیادہ ہوتی ہیں وہاں دکھ بھی گہرا ہوتا ہے۔ مولانا سلفی حضرت علامہ کے زمانہ طالب علمی کے ساتھی تھے اور بے تکلف دوست بھی۔ بہرحال میرے والد نے اس روز علامہ سے کہا کہ اب غصہ جانے دیں۔ انہوں نے مزاحمت نہ کی اور مولانا سلفی کو بھی اپنے ساتھ اندر لے آئے۔ مولانا

سلفی کمرے میں داخل ہوئے تو علامہ ایک دم جوش کے ساتھ بازو پھیلاتے کھڑے گئے۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے عجیب انتظام اور موقعہ تھا دو دوستوں کو ملانے کا۔

رات بھیگ رہی تھی۔ گیارہ بجے کے بعد ہم نے علامہ سے درخواست کی کہ آپ اسٹیج پر تشریف لے جائیں کیونکہ مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی تقریر کر رہے تھے۔ ان کے بعد آپ کی باری تھی۔ علامہ پیدل ہی روانہ ہوئے۔ کتنے ہی افراد آپ کے ہمراہ تھے۔ میں نے بھائی عبدالمجید کی شاندار رائفل اٹھائی اور آپ کے ہمراہ ہولیا۔ رعب جماتے علامہ کے ساتھ اسٹیج پہ پہنچے۔ جب اسٹیج پر پہنچے تو جیسے پورے مجمعے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ محکمہ اوقاف والا ہمارا دوست مولوی شریف آگے بڑھا اور آپ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے لگا۔ اس پر آپ نے اسے ہلکا سا ڈانٹ دیا:

"کیا اس میں زیادہ عزت ہے؟"

یہ سن کر مولوی شریف تو بے چارہ شرافت سے بیٹھ گیا۔ حالانکہ اتنا "شریف" نہیں، بڑا تیز قسم کا وہابی ہے۔ ہر بات کا جواب آتا ہے اسے۔ مولوی شریف علامہ شہید کے جمعے کا مستقل نمازی تھا اور اس کا یہ ساتھ علامہ کے ساتھ آخری جمعے تک رہا۔ مولوی شریف محکمہ اوقاف میں ملازمت کرتا تھا اور بادشاہی مسجد کی حدود میں واقع علماء اکیڈمی میں باورچی تھا۔ کھانا معلوم نہیں اچھا پکاتا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر کوئی اس کے سامنے علامہ کے بارے میں ایک حرف بھی زبان پر لائے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ علماء کی صحبت میں بیٹھنے والے وہابی آدھے عالم تو ہوتے ہی ہیں۔ جیسے ایک روز مولوی شریف نے مولانا عبدالسلام کیلانی سے پنگا لے لیا۔ مولوی شریف کی داڑھی لمبی اور مولانا عبدالسلام کی اس سے بھی زیادہ لیکن علماء اکیڈمی میں اس روز ان میں ایک بالشت سے زیادہ داڑھی کے کٹوانے پر بحث ہوگئی۔ بات طول پکڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد منظر یوں تھا کہ مولوی شریف نیچے تھا، اس کے ہاتھ پاؤں لڑکوں کی گرفت میں تھے اور مولانا عبدالسلام

کیلانی اس کے اوپر قینچی لے کر بیٹھے، ایک مٹھی سے زیادہ داڑھی کٹنے کو تیار تھی۔ مولانا ہنس رہتے تھے کہ آج تجھے اس کے جواز کا پتہ چل جائے گا۔ مولوی شریف زمین پر لیٹے لیٹے کہنے لگا کہ استاد جی آخری بات سن لیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کی ایک بھی حدیث ہے داڑھی کٹوانے کے بارے میں تو کاٹ دیں لیکن صرف ایک حدیث......؟ ایک دم جیسے دنیا بدل گئی اور مولانا کیلانی نیچے اتر آئے۔ مولوی شریف جو داڑھی کٹوانے والے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا، اس کو میں نے ایک روز چھیڑا۔ ''مولوی شریف تم علامہ کے پیچھے تو نماز پڑھ لیتے تھے۔'' آنکھوں میں پانی اتر آیا اور جان چھڑانے کے لیے بولا ''یار تنگ نہ کر مینوں، اودوں مسئلے دا نہیں سی پتا۔''

صاف مکر گیا، میں نے بھی زیادہ تنگ نہ کیا۔ جانتا تھا کبھی آدمی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے اور نظریات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ علامہ کے بارے میں مولوی شریف بہت جذباتی رہا۔ اس کے سامنے کوئی علامہ کے بارے میں بات کر کے جائے کہاں۔ لیکن فی الحال جلسے میں واپس چلتے ہیں۔ جہاں توقع سے کہیں زیادہ افراد آ چکے تھے اور پنڈال اپنی تنگ دامنی پر شکوہ کناں تھا۔ پیچھے مولوی یعقوب وغیرہ مزید کرسیاں لگوا رہے تھے۔

ہماری توقع کے برعکس ادھر علامہ شہید اسٹیج پر پہنچے، اُدھر چند مزید جملوں کے بعد حضرت یزدانی نے فرمایا کہ ''قائد ملت تشریف لے آئے ہیں، یار زندہ صحبت باقی'' اور اپنا خطاب ختم کر دیا۔ افسوس! آپ کی بات جو مشروط تھی ایسے ہی ہوا نہ یار زندہ رہے نہ صحبت باقی۔

اب ایک نظم پڑھی گئی اور نظم پڑھنے والے تھے غلام حسین مخلص۔ جھنگ سے ان کا تعلق تھا۔ لہجہ بھی اسی علاقے کا تھا۔ لیکن جب وہ نظم پڑھتے تو سماں باندھ دیتے۔ آج بھی ان کا صوتی آہنگ کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ عجب اداس کر دینے والا انداز اور

لہجہ تھا۔ انھوں نے اپنی معروف نظم پڑھی جس کا آغاز کچھ یوں تھا۔

خطیب ملت علامہ احسان

غیر ملکاں تے پاکستان

تے دنیا من گئی اے

غلام حسین مخلص کی نظم کے بعد علامہ شہید کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ آپ تھکے ہوئے تھے۔ آپ نے بیٹھنے کے لیے کرسی طلب کی اور بیٹھ کر تقریر شروع کی۔ اس روز آپ کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا تھا۔ جیسے ایک کے بعد ایک لفظ نہ جانے کیا سوچ کر بول رہے تھے۔ خلاف معمول ایک لمبی تمہید۔ ایسے لگ رہا تھا کہ امت کے دکھوں سے آزردہ دل کی پکار ہے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کا آج کا خطاب بہت فکر انگیز اور نسبتاً طویل ہوگا۔ جس میں امت کے زوال کے اسباب بھی بیان ہوں گے اور اس گرداب سے نکلنے کی طرف راہنمائی بھی کہ جس میں امت کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے بھی رائفل اپنے قدموں میں رکھی، دائیں بائیں یوتھ فورس راوی روڈ کے دو کارکنان کھڑے تھے۔ اپنے دونوں بازوں ان کے کندھوں پر ٹکا لیے اور کھڑا ہو گیا۔

اسٹیج کے گرد اور پنڈال میں میرے کتنے ہی عزیز کھڑے تھے۔ یوں سمجھئے میرا سارا خاندان وہاں جمع تھا۔ میری والدہ کے خالہ زاد سہیل جو میرے سے ذرا سا عمر میں زیادہ ہیں، میرے دوست بھی ہیں، ماموں بھی۔ سہیل کہتے ہیں کہ ایک انتہائی خوبصورت گل دان جو خاصا بڑا تھا، ہاتھوں ہاتھ اسٹیج سے بائیں طرف آگے لایا گیا۔ اسٹیج کے بالکل کنارے پر پاؤں لٹکائے میرے بڑے ماموں رانا محمد اکرام ایڈووکیٹ کے بیٹے رانا محمد فاروق بیٹھے تھے۔ انہوں نے آگے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا اور علامہ کی بائیں ٹانگ کے ساتھ رکھ دیا۔ سہیل کہتے ہیں کہ گل دان اس قدر خوبصورت تھا کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ جب جلسہ ختم ہوگا تو میں اسے ابوبکر سے مانگ لوں گا۔

علامہ کی دائیں اوٹ میں کھڑا ہونے کی وجہ سے میں اس گل دان کو نہ دیکھ سکا۔
آپ کا خطاب جاری تھا۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر تھا اور آج کی پستی کے ساتھ موازنہ۔ ان دنوں سیاچن گلیشئر پر ہندوستان نے اپنی افواج داخل کر دی تھیں اور پاکستانی فوج کے "سپہ سالار مرد مومن مرد حق" جنرل ضیاء الحق مبینہ طور پر کھلی آنکھوں سے دریائے آمو کے اس پار فتح کے جھنڈے لہرانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر ہندوستان کی اس پیش قدمی پر اس جرنیل کا بیان آیا تھا کہ "کیا ہوا سیاچن پر تو گھاس تک نہیں اگتی۔" آپ کہہ رہے تھے "گھاس تو تمہارے سر پر بھی نہیں اگتی یہ بھی انڈیا کو دے دو۔" پھر اقبال کا یہ شعر پڑھا

کافر ہے تو شمشیر پر کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑ ....

ابھی آپ نے یہ شعر مکمل نہیں کیا تھا کہ اچانک خوفناک دھماکہ ہوا اور چند ثانیے کی خاموشی، پھر چیخ و پکار جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ اٹھا۔ میں نے ایک بار لکھا تھا۔ آج پھر وہی سوال پیش نظر ہے کہ بتایئے ہم کہاں بھاگتے۔ ہاں، ہماری تمام تر متاع عزیز تو وہاں موجود تھی۔ میرا سارا خاندان وہاں جمع تھا اور پھر علامہ صاحب۔ بھلا ہم کہاں بھاگتے اور اپنی جان اتنی عزیز بھلا کب رہی ہے۔ شاید ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں احساس ہو گیا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میرے دائیں بائیں کے ساتھی نہ جانے کدھر گئے۔ میں علامہ کے پیچھے چند قدم پر کھڑا تھا۔ وہیں سے آگے کو چھلانگ لگائی۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ علامہ کی تلاش تھی۔ لوگ واپس پلٹ رہے تھے جس کا جتنا رشتہ تھا اور جتنا تعلق گہرا تھا، اسی تناسب سے واپسی تھی۔ نیم اندھیرے میں علامہ کی جگہ پہنچا، دیکھا کوئی ایسے اوندھا پڑا تھا جیسے سجدے میں ہو، میں اوپر سے گزرتا چلا گیا کہ علامہ کو دیکھا جائے۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہ آج تو ہر کوئی علامہ کی تلاش اور فکر میں

ہے، میں ذرا اپنے والد کو دیکھ لوں اس خیال میں واپس پلٹا اور اس سجدہ نشین کی طرف آیا۔ وہ میرے والد ہی تھے۔ کچھ یاد نہیں کہ کون میرے ساتھ تھا، کون رکشہ لایا، کس کے ساتھ انہیں سوار کرایا۔ رکشہ ہسپتال کو چل دیا۔ وہ میرے بازوؤں میں بے ہوش تھے۔ جسم کا جیسے ہر تار زخمی تھا۔

جھیاں تن میرے تے لگیاں
تینوں اک لگے تے تو جانے

شدید تکلیف میں اور بے چین سے تھے۔ سارا لباس لہو میں بھیگا۔ شاید انہیں اندازہ تھا کہ میں اپنے بیٹے کے بازوؤں میں ہوں وہ وقت آج بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ میں شاید ان کے چہرے کو چوم رہا تھا۔ یقین کیجیے وہ آج بھی، اس وقت بھی میری آغوش میں ہیں۔ میں اس وقت بھی ان کی محبت کے لمس میں ڈوبا ہوا ہوں۔

میں زیست کی قید میں ہوں اور دائرے میں سفر ہے
میں خود میں تجھ کو دیکھتا ہوں میرا آئینے میں گھر ہے

کب ہسپتال پہنچے؟ یاد نہیں۔ میو ہسپتال کی ایمرجنسی وارڈ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ سینکڑوں افراد وہاں جمع تھے۔ بے شمار زخمی اور ان کے لواحقین موجود تھے۔ اک قیامت کا سماں تھا۔ سب سے پہلے علامہ ہی وہاں پہنچے اور تقریباً ساتھ ہی میرے والد محترم۔ میری ذہنی حالت خاصی بری تھی۔ میں اپنی والدہ اور گھر والوں کی خبر لینے اور دینے گھر آیا۔ کچھ دیر رکا اور واپس ہسپتال چل دیا۔ وہاں اپریشن، خون کی بوتلیں اور علاج معالجے سب چل رہے تھے۔ اوپری منزل پر میرا دوست ذلفی زمین پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ ہم خاموش تھے۔ بھلا کیا بات کرتے اور کیا ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ میں روتا روتا اس کے زانو پر سر رکھے سو گیا۔ گیارہ بج کر سینتیس منٹ اور انیس سیکنڈ پر یہ قیامت صغریٰ بپا ہوئی۔ اب رات کا ایک بجا تھا۔ خبر آئی مولانا

عبدالخالق قدوسی شہید ہو گئے۔ پھر نیند کہاں۔ شاعر نے کہا تھا نا کہ فراق میں بدن کہنہ ہو گیا اور اب آنکھ میں نیند کہاں ؎

ابلى الهوى اسفاً يوم النوىٰ بدنى
و فرق الهجر بين الجفن و الوسن

میں یہ خبر سنانے گھر چلا آیا۔ سب گھر والے میرے ننہیال میں جمع تھے کہ ان کا گھر قلعہ لچھمن سنگھ چوک سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ اک کربلا تھی جو اس روز بیت گئی تھی ؎

ایک پل میں وہاں سے ہم اٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

میری والدہ کو خبر ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے حیران سی ہوئیں اور پھر بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ ان کو اٹھایا، نہ کوئی شکایت، نہ گریہ، نہ چیخ و پکار۔ بس ایک صبر اور خاموشی ع

چوٹ تازہ لگی ہے ابھی

رات تین بجے تک خبر آ گئی کہ محمد خان نجیب بھی چلے گئے...... ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اگلے روز نماز عصر کے وقت مینار پاکستان پر شہداء کا مشترکہ جنازہ تھا۔ کچھ سیاسی راہنما بھی جنازے میں شریک تھے۔ عوام کا جم غفیر تھا۔ وہاں کچھ تقاریر بھی ہوئیں۔ مولانا فضل الرحمٰن، نواب زادہ نصر اللہ خان اور چند مزید افراد نے تقاریر کیں۔ محمد خان نجیب رحمہ اللہ کی میت گڑھی گوندل سیالکوٹ لے جائی گئی۔ جبکہ میرے والد محترم کی میت راوی کنارے واقع قبرستان کی طرف لے کر چل دیے۔ جب جنازہ راوی روڈ سے گزر رہا تھا تو ہنگامہ شروع ہو گیا۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ جنازے میں پیپلز پارٹی کے لوگ

بھی شریک تھے۔ انہوں نے بسوں پر پتھراؤ شروع کر دیا اور ہنگامہ آرائی کی لیکن اس بات کے راوی جو بزرگ تھے، ان کا ایک مسئلہ تھا کہ وہ جنرل ضیاء الحق کو امیر المومنین سمجھتے تھے اور کوئی صلاح الدین ایوبی ٹائپ کی چیز (معاذ اللہ)، اس لیے مجھے اس پیپلز پارٹی والی روایت پر ہمیشہ شک ہی رہا۔ کیا انتظامیہ کا فرض نہ تھا کہ چند گھنٹے کے لیے ٹریفک بند کر دی جاتی، مگر وہاں تو آنسو گیس، لاٹھی چارج کا بھی مکمل سامان تھا۔ جنازے پر آنسو گیس اور لاٹھی چارج شقاوت کی بدترین مثال تھی اور یہ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت کا خاصہ تھا۔ جیسے تیسے جنازہ قبرستان پہنچا اور میرے والد کی تدفین ہوئی۔ مکتبہ سلفیہ کے مدیر اور میرے والد کے قریبی دوست حافظ احمد شاکر نے قبر پر دعا کروائی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جمعیت کی ''محترم قیادت'' لاٹھی چارج سے اتنا گھبرائی کہ قبرستان تک ہی نہ پہنچ سکی۔ ؏

مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

اور ہم بوجھل قدموں سے واپس چل دیئے:

وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ہم خالی ہاتھ، خالی دامن، اپنے ابا جی کو قبر میں اتار کر گھر واپس آ گئے۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ ؏

آج کچھ بھی نہ پوچھ کہ دل اداس بہت ہے

میرے والد کے علاوہ مزید آٹھ افراد شہید ہوئے۔ ان میں بدقسمت سلیم پرنس فوٹو گرافر اور ان کے برادر نسبتی، صدر جلسہ شیخ احسان الحق، ایک بزرگ عبدالحفیظ، بیگم کوٹ کے ایک نوجوان عبدالسلام بھی شامل تھے۔ جبکہ بے شمار افراد زخمی ہوئے۔ کسی کی ایک آنکھ ضائع ہوئی اور کسی کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ میرے نصف درجن قریبی عزیز شدید زخمی ہوئے۔

عجیب ذہنی کیفیت تھی۔ کچھ بھی خبر نہیں تھی کہ دنیا کہاں ہے اور ہم کہاں۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شدید زخمی تھے۔ ان کے جسم کا بایاں حصہ شدید متاثر تھا۔ بائیں ٹانگ تو تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ مکمل ہوش و حواس میں تھے۔ جو لوگ آپ کی عیادت کے لیے آتے۔ آپ ان سے ملتے۔ کسی نے نہیں کہا کہ علامہ مجھے پہچان نہیں سکے۔ دوسری طرف ہسپتال کے جس وارڈ میں آپ زیر علاج تھے، اس کے باہر پاکستان بھر سے آئے ہوئے آپ کے عقیدت مندوں اور دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے کارکنان کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ لوگ اس حد تک جذباتی تھے کہ ڈاکٹروں کو پکڑتے کہتے کیا یہ ممکن ہے کہ ہماری ٹانگ علامہ کو لگ جائے۔ ڈاکٹر نرمی سے ان لوگوں کو بتاتے کہ میڈیکل سائنس کی رو سے ایسا ممکن نہیں۔

اب واپس چل کر دیکھتے ہیں کہ جب دھماکہ ہوا تب علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید پہ کیا گزری۔ مولوی شریف بیان کرتے ہیں کہ ''جب علامہ نے پھولوں کی پتیاں پھینکنے پر مجھے ڈانٹا تو میں دبک کر بیٹھ گیا اور ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر تقریر سننے لگا۔'' اسی طرح رانا جاوید بھی اسٹیج پر ایک کونے میں تقریر سن رہے تھے کہ دھماکہ ہو گیا۔ رانا جاوید بھی زخمی ہو گئے اور حواس باختہ گرتے پڑتے اسٹیج کی پچھلی طرف نکلے جہاں داخلے کا راستہ تھا۔ دیکھا وہاں علامہ شہید گرے ہوئے تھے اور بری طرح زخمی تھے۔ آپ نے اپنا دایاں بازو سرہانے کے طور پر اپنے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ وہاں سنگریزے بکھرے پڑے تھے۔ فوارہ زیر تعمیر تھا۔ ابھی صرف چبوترہ ہی بنا تھا۔ اندازہ کیجیے علامہ کتنی دور آ کر گرے ہوئے تھے۔ رانا جاوید کہتے ہیں کہ ''میری اور آپ کی نظریں ملیں لیکن نہ آپ کچھ بولے، نہ میں بولا اور کچھ یہ بھی کہ میں حواس باختہ تھا'' یہ سارا عرصہ چند سیکنڈز کا ہوگا کہ لوگ لپک کے آئے، علامہ کو ڈھونڈنے۔ مولوی شریف، جاوید محمدی کہ جن کا محمدی کیسٹ ہاؤس ہے، ان کے ایک ملازم اور دو اور افراد نے مل کر علامہ کو اٹھایا۔ مولوی شریف بتاتے ہیں:

"جب میں علامہ کے پاس پہنچا تو آپ بری طرح زخمی تھے لیکن اس حالت میں بھی آپ کے حواس مکمل کام کر رہے تھے۔ پہلا جملہ جو آپ کی زبان سے نکلا "جاؤ جلدی سے جا کر دوسروں کو دیکھو۔" اس دوران دوسرے لوگ بھی آ گئے تو آپ نے کہا "جلدی کرو ہسپتال چلو" علامہ شدید زخمی تھے۔ آپ کی بائیں پنڈلی کا گوشت مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا اور پاؤں سے گھٹنے تک ننگی ہڈی نظر آ رہی تھی۔ جبکہ اوپر ران کا حصہ بھی بری طرح کٹا پھٹا تھا اور آپ کا چہرہ بھی زخمی نظر آ رہا تھا۔ اسی اثنا میں کوئی گاڑی لے کر آیا تو آپ کو گاڑی پہ ڈال کر ہسپتال لے گئے۔

مولوی شریف یہ کہانی سنا رہا تھا اور میری آنکھیں بھیگ رہی تھی کہ کیسا عجیب آدمی تھا احسان الٰہی ظہیر۔ اپنا سارا جسم کٹ چکا، ایسے میں بھی زبان سے پہلا جملہ یہ ہی نکلا جاؤ جا کر دوسروں کو دیکھو۔ کیا خیال ہے اس روز ان کے ساتھ ان کے سگے بھائی ڈاکٹر فضل الٰہی، حافظ شکور الٰہی، محبوب الٰہی یا عابد الٰہی آئے تھے کہ جن کی ان کو فکر تھی؟ یا آپ سمجھتے ہیں کہ ابتسام، معتصم یا ہشام ان کے ہمراہ آئے تھے اور یہ ایک بے چین باپ کی آواز تھی؟؟ جی نہیں! اس روز علامہ اکیلے آئے تھے۔ ڈرائیور کے ساتھ۔ تو یہ "دوسرے" کون تھے کہ جن کے لیے کہا جا رہا ہے کہ جاؤ جا کر پہلے "دوسروں" کو دیکھو۔ یہ ان کے "ماں جائے" تو نہ تھے لیکن علامہ کو اپنے "ماں جائیوں" سے زیادہ محبوب تھے۔ ایسے ہی تو آج مولوی شریف، عزیز الرحمٰن نہیں ہوتے کہ اس کے بعد کسی نے ان کو معتبر نہیں سمجھا ......اور معتبر؟؟ جی نہیں اپنی جان سے قیمتی، کہ علامہ کا یہ جملہ اور اس کا ایک ایک حرف اس بات کی گواہی دے رہا ہے۔ معاف کیجیے جو اس مسلک کے لیے اپنے پاؤں کی انگلی کٹوانے کے لیے تیار نہیں، وہ اپنا تقابل علامہ سے کرنے لگ جاتے ہیں کہ کس کی خدمات زیادہ ہیں، کس کی کارکردگی زیادہ ہے۔ پروفیسر قاضی مقبول احمد کا جملہ پھر یاد آ رہا ہے کہ "علامہ نے ساری عمر جماعت کو دیا، انہوں نے جماعت سے لیا ہی کیا تھا؟"

اور مزید یہ کہ آخر میں اپنی جان بھی دے گئے۔ علامہ کا سیاست میں مقام جماعت کی وجہ سے تھا نہ دولت کی وجہ سے۔ ہاں ہاں یہ ضرور تھا کہ اپنی دولت بھی جماعت پر خرچ کی، اپنا علم بھی جماعت کو دان کر دیا اور سیاست میں اپنے بلند مقام کے سبب جماعت کو بھی صف اول کی جماعت بنا گئے۔

جو گاڑی علامہ کو لینے آئی، وہ مولوی یعقوب کے ماموں زاد عبدالرحمٰن کی تھی، سب اسے ''مانا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ''مانا'' بہت تیز گاڑی بھگاتا ہسپتال کی طرف نکلا۔ علامہ مکمل ہوش و حواس میں تھے۔ گورنمنٹ کالج کے پاس سڑک پر برسوں سے ایک گڑھا ہے، اس میں گاڑی لگی تو علامہ نے مانے کو ڈانٹ دیا ''آرام سے چلاؤ، کیا تمہیں گڑھا نظر نہیں آ رہا۔ دیکھ کیوں نہیں رہے۔'' اس جان لیوا حادثے کے باوجود انہوں نے اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے۔

میں لکھ چکا ہوں کہ سب سے پہلے علامہ اور ساتھ ہی میرے والد ہسپتال پہنچے۔ علامہ کے سب سے بڑے داماد ڈاکٹر محمد اکرام کی ڈیوٹی ان دنوں میو ہسپتال میں ہی تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے دوران کسی کام سے ایمرجنسی وارڈ کی طرف آ نکلے۔ دیکھا تو لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ حیران سے ہوئے کہ آج کوئی بڑا حادثہ ہی ہو گیا ہے۔ اتنے میں علامہ شہید کے ڈرائیور کی نظر ان پر پڑی تو وہ بھاگتا ہوا آیا ''علامہ صاحب پر حملہ ہو گیا ہے۔'' تب بھی ان کا خیال یہ تھا کہ گولی وغیرہ لگ گئی ہو گی۔ بھاگتے ہوئے وارڈ میں پہنچے۔ تب اندازہ ہوا کہ یہ سارا اژدھام اس حادثے کا ہی ہے۔ اندر گئے تو علامہ احسان الٰہی ظہیر شدید زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اکرام پاس آئے تو علامہ نے پہچانتے ہوئے کہا ''میری ٹانگ میں شدید درد ہے۔'' ڈاکٹر اکرام ہسپتال کے ایم ایس کو فون کرنے لگ گئے۔ ویسے بھی ہسپتال میں پتہ چل چکا تھا کہ علامہ زخمی ہو کر آئے ہیں۔ فوراً ہی علاج شروع ہو گیا۔ علامہ کو انستھیزیا (بے ہوش کرنے کا عمل) دیا گیا۔

اس دوران مانیٹر وغیرہ آپ کے جسم کے ساتھ لگا دیئے گئے۔ آپ کے زخموں کی صفائی اور علاج کا عمل جاری تھی۔ ایک مشین ہوتی ہے جس کی سکرین پر مسلسل دل کی حرکت ECG کے یونٹ کی شکل میں نظر آتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر اکرام بتاتے ہیں کہ ''ایک دم وہ آڑھی ترچھی اوپر نیچے مسلسل حرکت کرتی لائن سیدھی ہوگئی۔ اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا کہ اس کا مطلب تھا علامہ کا دل بند ہو گیا ہے۔'' لیکن چند لمحے گزرے کہ مشین سے آواز بلند ہوئی اور دل نے پھر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس رات علامہ شہید کے دل نے دو دفعہ کام کرنا بند کیا مگر پھر چل پڑا۔ پھر ایک سنگین مسئلہ درپیش ہوا کہ علامہ انستھیزیا سے باہر نہیں آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جسم میں زہر کے اثرات زیادہ ہیں اور جگر بھی کام چھوڑ رہا ہے۔ بمشکل تین سے چار گھنٹے بعد ہوش میں آ سکے۔

تکلیف مسلسل تو تھی مگر آپ کمال حوصلے اور ضبط کے ساتھ اس کو برداشت کرتے رہے۔ آپ انتہائی مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ لیکن آپ اس مکمل ہوش و حواس کے ساتھ گفتگو اور ذہنی مضبوطی کی وجہ سے، ہر شخص سے معمول کے مطابق انداز گفتگو نے سب کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ ہر بندہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا اگرچہ شدید زخمی ہیں لیکن علامہ بچ گئے ہیں۔ امید نظر آنے لگ گئی کہ ان شاء اللہ جلد روبہ صحت ہو جائیں گے۔ ہم آپس میں کہا کرتے ہیں کہ علامہ شہید کے مضبوط اعصاب نے ہم سب کو دھوکہ دے دیا۔

حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ ہسپتال تشریف لائے۔ باپ بیٹے کی ملاقات کا عجیب منظر تھا۔ آج حاجی صاحب کی ساری شکائتیں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ آج صرف آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیٹے کا ماتھا چوما۔ آج انہیں کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ بیٹا کن راہوں کا مسافر تھا۔ وہ بیٹے کو مدرس بنانا چاہتے تھے لیکن ان کے بیٹے کی نظر تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر تھی۔ ان کا بیٹا مجاہد بن گیا تھا۔ ہسپتال کے باہر بے قرار، بے

چین لوگوں کا ہجوم حاجی صاحب کو خبر دے رہا تھا کہ معاملہ کچھ اور تھا۔ ان کی شکایات بے جا تھیں۔ آج باہر تڑپتے لوگ جب ڈاکٹروں سے ضد کر رہے تھے کہ کوئی صورت......؟ کوئی صورت......؟ ہماری ٹانگ کاٹ لو۔ ہمارے جسم کا ہر ہر حصہ کاٹ لو جو علامہ کو لگ جائے اور وہ بچ جائیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس روز لوگوں کو بلکتے روتے اور ڈاکٹروں کی منتیں کرتے دیکھا۔ پھر حاجی صاحب نے باہر مصلیٰ بچھا لیا۔

"اللہ میرے احسان الٰہی کو بچا......"

علامہ اپنی ماں کی بڑی مرادوں بھری اولاد تھے۔ ماں ان کا نام نہیں لیتی تھیں۔ پیار سے "پا" کہتی تھیں۔ یہ "پا" پنجابی کا لفظ ہے۔ یہ عموماً بڑے بھائی کے لیے تکریم کے طور پر بولا جاتا ہے اور گاہے کسی بھی بزرگ کے لیے تخاطب کے واسطے بھی بولا جاتا ہے۔
رات گئے علامہ کی والدہ محترمہ ہسپتال پہنچیں۔ سب نے منع کیا کہ اس وقت نہ جائیں کوئی نہیں ملنے دے گا۔ بولیں "میں ماں ہوں اس کی۔ کون بھلا ایک ماں کو روک سکتا ہے؟" ماں نے بیٹے کا زخمی ماتھا چوما۔ تو علامہ بچوں کی طرح رو دیئے کہ رقیق القلب تو بے انتہا تھے۔ ماں بھی بہادر تھیں کہنے لگیں۔ "پا! تیرا خون اللہ کی راہ میں بہہ رہا ہے۔ پریشان مت ہونا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے۔" عزیمت و استقامت کے ان گنت دروس پر مبنی یہ چند الفاظ علامہ کی والدہ کے ہیں اور ملاقات کا یہ واقعہ انہوں نے خود روایت کیا ہے۔

ہاں ہماری مائیں ایسی ہی بہادر ہوتی ہیں کہ بہتے خون کو بھی اللہ کی رحمت کہہ سکیں۔

نواب زادہ نصر اللہ خان آئے۔ علامہ جو سب کو حوصلہ دے رہے تھے نواب صاحب کو دیکھا تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ نواب صاحب نے ایسے پیار کیا جیسے اپنے بچوں سے۔ علامہ بلک کر رو پڑے۔ علامہ بھی نواب صاحب سے ایسے پیار کرتے جیسے بچہ اپنے باپ سے۔ نواب صاحب گھر آتے تو اپنے بچوں سے کہتے آپ کے دادا آئے ہیں۔ آج نوابزادہ کے سامنے خود بچوں کی طرح رو رہے تھے بس ایک جملہ بولا "میرا

کیا قصور تھا؟'' یہ جملہ سننے کی دیر تھی کہ آمریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے آہنی اعصاب کے مالک نوابزادہ نصراللہ خان رحمہ اللہ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔

پھر اس کا نمائندہ بھی آیا جو منافقت کا شاہکار تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا ڈپٹی چیف پروٹوکول آفیسر کرنل ناصر پھولوں کا گلدستہ لے کر آیا۔ جنرل ضیاء الحق پاکستان کی تاریخ کا دھوکے باز حکمران گزرا ہے۔ ایک طرف اپنی نمازوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر مولویوں کو خوش رکھتا۔ دوسری طرف بعض مزارات پر آکر اعتکاف بیٹھ جاتا۔ کبھی بھارت جا کر مندر میں دھاگے بھی باندھ آتا اور ساتھ ساتھ شتروگھن سہنا ہندو فنکار کو اپنا فیملی ممبر بنایا ہوا تھا حتیٰ کہ ضیاء الحق کی بیٹی اس کو اپنا بھائی کہتی۔ کرنل ناصر نے جب ضیاء الحق کی طرف علامہ کو گلدستہ پیش کیا تو علامہ نے ڈاکٹر محمد اکرام سے کہا اسے باہر پھینک دو اور کرنل سے مخاطب ہوئے ''اس کو کہنا اس نے اچھا نہیں کیا۔'' کوئی مانے یا نہ مانے یا تاویل کرے، یہ نزاعی بیان بھی ہے اور ضیاء الحق کے خلاف ایف آئی آر بھی جو علامہ نے اللہ کے حضور کٹوا دی ہے۔

اس شدید زخمی حالت میں بھی علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کو نماز کی فکر دامن گیر رہی۔ علامہ شہید کے داماد شیخ عدنان سرور بیان کرتے ہیں کہ:

''میں آپ کے بیڈ کے ساتھ بیٹھا تھا اور ساتھ ہی علامہ کی والدہ محترمہ تشریف فرما تھیں۔ نیم وا آنکھوں سے علامہ نے میری طرف دیکھا اور ہولے سے کہا کہ مجھے تیمّم کروا دو میں نے نماز پڑھنی ہے۔ میں نے قریب رکھی مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور اس کو علامہ شہید کے ہاتھوں سے لگایا اور پھر ہونٹوں سے مس کیا۔ اس کے بعد علامہ نے اشارے سے نماز شروع کر دی۔ اس کا اندازہ مجھے ان کے ایک ہاتھ کی حرکت سے ہوا جو

اشارے کے انداز میں چل رہا تھا۔ جبکہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غنودگی میں چلے گئے ہیں۔"

زہر جسم میں پھیل رہا تھا۔ علامہ کے جسم کا بایاں حصہ بہت زیادہ زخمی تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹانگ کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے بھائیوں سے پوچھا گیا۔ بات علامہ تک پہنچی۔ آپ جیسا متحرک آدمی اور ٹانگ کٹ جائے۔ آپ نے یک سر انکار کر دیا۔ دوسری طرف سے عراقی صدر صدام حسین اور سعودی حکومت کی طرف سے پیش کش تھی کہ آپ ہمارے ہاں آ جائیں۔ جب معاملہ علامہ تک پہنچا تو آپ نے سعودی عرب جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کے اس فیصلے کے بعد روانگی کے انتظامات کیے جانے لگے۔ سعودی حکومت نے خصوصی طور پر آپ کے لیے اپنا طیارہ ریاض سے لاہور بھیجا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنرل ضیاء الحق بنفسِ نفیس اس معاملے کو دیکھ رہا تھا اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق فیصلے کر رہا تھا جو ظاہر ہے کہ بہت پست تھی۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ایک پست سوچ کا حامل اگر صدر پاکستان بھی بن جائے تو اس کی ذہنی سطح بھی بلند ہو جائے۔ آپ کی روانگی میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھی۔ NOC جاری نہیں کیا جا رہا تھا۔

راولپنڈی کے چوہدری محمد امین جو وہاں کی جماعت کے ذمے دار تھے اور علامہ کے دوست تھے۔ ایک وفد کے ساتھ جا کر جرنیل ضیاء الحق کو ملے جو اس وقت گالف کھیل رہا تھا۔ مختصر سی بحث وتمحیص کے بعد اس نے NOC جاری کرنے کا حکم دیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صوبائی سطح کے ایک سیکرٹری کی سطح کا یہ کام کرانے کے لیے ضیاء الحق تک جانا پڑا...... اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کے بعد بھی ہمارے بعض "خوش فہم بزرگ" اس کو "مردمومن مردحق" سمجھتے رہیں تو ان کی کم فہمی کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ جو اپنوں کے لیے کتنے سخت ہوتے ہیں اور ایک بدعقیدہ غاصب حکمران کے لیے کتنے نرم۔ کہاں گیا عقیدہ ولاء و براء؟ کہاں گئی اللہ کے لیے محبت اور اس کے لیے نفرت

کی خوش کن باتیں؟

اس حکومتی ہٹ دھرمی کے سبب ایک دن ضائع ہو چکا تھا۔ قصہ مختصر تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد علامہ کی روانگی کا وقت طے ہو گیا۔ آپ کا انتیس مارچ کو سعودی عرب جانا قرار پایا۔

جانے سے پہلے آپ کے اہل خانہ آپ سے الوداعی ملاقات کو آئے۔ آپ نے ان سب کو فرداً فرداً نصیحتیں اور وصیتیں کیں۔ اس روز آپ بہت تر و تازہ لگ رہے تھے۔ اگست 1964ء میں مدینہ یونیورسٹی کے پہلے سال کے اختتام پر جب چھٹی واپس پاکستان آئے تھے تو آپ پر دیار حبیب کی جدائی بہت شاق گزری تھی۔ اس روز آپ نے آنسوؤں میں، ہچکیوں میں دعا مانگی تھی۔

''اللہ یہ جدائی عارضی ہو۔''

اور آج تیس برس بعد پھر جانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اس لیے شاید پچھلے پانچ روز کی نسبت معمول سے زیادہ ''فریش'' لگ رہے تھے۔

آپ کے اہل خانہ آ گئے۔ آپ فرداً فرداً سب سے مل رہے تھے۔ ہر ایک کے لیے الگ وصیتیں، نصیحتیں۔

''دیکھو! دیکھو میں نے واپس آ جانا ہے۔ ان شاء اللہ

ہشام! یہ دیکھو میرے پاؤں کا انگوٹھا ہل رہا ہے نا۔

میں ٹھیک تو ہوں۔ پریشان نہیں ہونا۔

اور ہاں دیکھو اگر میں واپس نہ آؤں (ذہن کے کسی گوشے میں تو تھا نا)

تو نماز کا بہت خیال کرنا۔''

پھر اپنی اہلیہ محترمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ معاملات کی بات کی۔ لوئر مال کی بلڈنگ زیر تعمیر تھی، اس کے بارے کچھ کہا اور ہاں یہ بھی کہا ''اگر مجھے کچھ ہو جائے تو

میری یہ وصیت ہے کہ میرے بچوں کو کبھی موٹر سائیکل نہ لے کر دینا۔"

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

والدہ نے پوچھا "احسان الٰہی کہاں درد ہے؟"

احسان الٰہی نے جواب کیا دیا۔ اک جہانِ معنیٰ جملے میں سمٹ آیا۔

"اماں جی درداں بڑیاں۔" [1]

نہ جانے احسان الٰہی کو کتنے درد تھے۔ آج سب درد سمیٹنے کا وقت تھا۔

درد اتنا تھا کہ رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا

ایمبولینس آئی اور آپ ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔

☆......☆......☆

سعودی ائر لائن کا طیارہ لاہور ائر پورٹ پر آیا۔ آپ کے ہمراہ ڈاکٹروں کی ایک مکمل ٹیم گئی۔ ڈاکٹر محمد اکرام بھی اسی ٹیم کا حصہ تھے۔

دارالسلام کے مدیر جناب عبدالمالک مجاہد نے اپنی سرگزشت "سنہری یادیں" میں علامہ کے اس سفر آخرت کا حال بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ چونکہ وہ ان تمام مراحل میں بذات خود موجود تھے اس لیے پہلی بار یہ تفصیلات صفحہ قرطاس پر آئیں۔ عبدالمالک مجاہد لکھتے ہیں:

> علامہ صاحب کا طیارہ جب ریاض کے ائر پورٹ پر پہنچا تو راقم الحروف، حافظ عابد الٰہی، ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب اور دیگر بہت سے کارکنان ائر پورٹ پر موجود تھے۔ ایک ایک لمحہ ہمارے لیے گھنٹوں کے برابر تھا، ہم

---

[1] اماں جی بہت سے درد ہیں۔

سب اپنے قائد کے انتظار میں تھے، ان کو دیکھنا چاہتے تھے، ان سے ملاقات کے لیے بے تاب تھے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے سفیر پاکستان جناب امیر گلستان جنجوعہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے حکومت پاکستان کی طرف سے علامہ صاحب کو خوش آمدید کہا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا، طیارہ جیسے ہی رکا وہ طیارے کے اندر گئے۔ علامہ صاحب اس وقت ہوش میں تھے، انہوں نے سفیر صاحب کو پہچانا اور کہا: سفیر صاحب! آپ کا شکریہ، آپ تشریف لائے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ بات مجھے سفیر صاحب نے خود بتائی تھی۔

ائر پورٹ کے اندر ہی ایمبولینس کھڑی تھی، ہم ہوٹر کی آواز سن رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ باہر تشریف لائیں گے اور ہم ان سے ملاقات کر سکیں گے۔ علامہ صاحب کے ساتھ ان کے والد گرامی، ڈاکٹروں کی غالباً آٹھ یا دس رکنی ٹیم مع ایک نرس کے آئی ہوئی تھی۔ سعودی حکومت کی طرف سے ان کا مخلصانہ استقبال ہوا۔ لہٰذا وہ جلد ہی امیگریشن اور کسٹم کی کارروائیوں سے فارغ ہوکر باہر آ گئے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم کی سربراہی معروف ہارٹ سپیشلسٹ ڈاکٹر راشد رانددھاوا کر رہے تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو یقین دہانی کرائی کہ ان شاء اللہ خیر ہے۔ [1]

ریاض پہنچ کر علامہ کو ریاض کے ملٹری ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ جبکہ علامہ کے ساتھ جانے والے ڈاکٹر اور دوسرے افراد کو ہوٹل بھیج دیا گیا۔ اور علامہ کا علاج ریاض کے ہسپتال کے ڈاکٹروں نے سنبھال لیا۔ وہاں پر علامہ کو انستھیز یا دیا گیا تا کہ زخم وغیرہ کا علاج کیا جائے لیکن علامہ اس مرتبہ بے ہوشی سے باہر نہیں آ پا رہے تھے۔ رات ایک

[1] سنہری یادیں، صفحہ:283۔

بجے ڈاکٹر محمد اکرام ہسپتال پہنچے تو ایک امریکی ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا۔ ڈاکٹر اکرام بتاتے ہیں کہ "جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا صورت حال ہے تو اس نے کہا کہ، آج رات کسی وقت وہ فوت ہو جائیں گے۔" کتنی آسانی سے اس نے کتنی بڑی بات کہہ دی۔

علامہ کو CCU میں رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر اکرام ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے اور بتا رہے تھے کہ ایک روز میاں محمود علی قصوری کی تیمارداری کے لیے علامہ میو ہسپتال آئے وہاں CCU پر نظر پڑی۔ آپ ڈاکٹر اکرام سے پوچھنے لگے کہ "یار یہ جو مریض ہیں، ان کے پاس کسی کو رہنے کی اجازت نہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "جی ہاں ان کے معاملات مکمل طور پر ڈاکٹروں کے حوالے ہوتے ہیں۔" علامہ نے بے اختیار کہا "مجھے تو اگر یہاں رہنا پڑے تو میں مر جاؤں۔" آج علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ CCU میں تھے اور فجر کے وقت ڈاکٹروں نے باضابطہ کہہ دیا کہ

"علامہ احسان الٰہی ظہیر اپنے اللہ کے پاس جا چکے ہیں۔"

اک سورج زمین کے اندر جا رہا تھا اور دوسری طرف اک سورج طلوع ہو رہا تھا۔

حاجی ظہور الٰہی، ڈاکٹر فضل الٰہی، حافظ عابد الٰہی اور ڈاکٹر محمد اکرام سب لوگ ہسپتال کے احاطے میں ایک لان میں زمین پر بیٹھے تھے۔ باہم گفتگو کے بعد طے ہوا کہ علامہ کو جنت البقیع میں دفن کیا جائے۔ اب ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ نے پاکستان فون کیا کہ علامہ اپنے رب کے پاس جا چکے ہیں اور تدفین کے بارے میں سب کی رائے اور فیصلے سے آگاہ کیا "خالہ جی" نے کمال حوصلے سے جنت البقیع میں تدفین پر اتفاق کیا۔ میں پھر کہوں گا کہ ہم اہل حدیث ہیں، اور ہماری مائیں ایسی ہی بہادر ہوتی ہیں۔

عبدالمالک مجاہد لکھتے ہیں:

سارا منظر ہی بدل چکا تھا۔ کل جو امیدیں قائم تھیں، آج وہ دم توڑ چکی

تھیں۔ آہستہ آہستہ احباب اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ ہم علامہ صاحب کے والد صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے: یا اللہ! میرے بیٹے کو معاف کر کے اپنی رضا اور جنت کا مستحق بنا دینا۔ وہ بار بار ان کی مغفرت کے لیے دعائیں کر رہے تھے، پھر مشورہ ہوا کہ علامہ صاحب کو کہاں دفن کیا جائے۔ کسی نے پاکستان کی بات کی۔ شیخ ظہور الٰہی فرمانے لگے: نہیں! اگر احسان الٰہی کو لاہور لے جایا گیا تو وہاں لوگ اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ہمیں پاکستان پیارا ہے، ہم نہیں چاہتے کہ کسی کا نقصان ہو یا کوئی توڑ پھوڑ ہو۔ کسی نے مدینہ طیبہ کا نام لیا، کسی نے ریاض کی بات کی، اچانک شیخ ظہور الٰہی صاحب گویا ہوئے: احسان کو مدینہ بڑا پسند تھا، اسے بقیع میں دفن کریں گے۔ سب لوگوں نے ان کی تائید کی۔ ڈاکٹر فضل الٰہی تو اپنے والد محترم کے اشاروں کے منتظر تھے۔ ہم لوگ اس بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے جہاں علامہ صاحب کو نہلا کر کفن پہنایا جا چکا تھا اور انہیں ایک بڑے کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا۔

ملٹری ہسپتال میں شعبہ جالیات کے انچارج کیپٹن عبداللہ مرسل تھے۔ میں ان سے بخوبی واقف تھا۔ ہمارے شیخ عبداللہ سرور بھی ہسپتال کے اردو جالیات ہی میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں حضرات نے اور اسی طرح برادر عزیز حافظ عبدالرحمٰن کشمیری نے بڑا مثبت رول ادا کیا۔ ہر قسم کی سہولیات مہیا کیں۔ بعد ازاں میرے علم میں یہ بات آئی کہ انہوں نے غسل دینے کی سعادت بھی حاصل کی، نہلانے والی ٹیم میں وہ بھی شامل تھے۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ علامہ صاحب کی میت کو ایک بڑی بلڈنگ میں تیسرے فلور پر منتقل کر دیا گیا تھا، میں بے تاب تھا کہ چہرہ دیکھوں۔ حافظ

عابد الٰہی نے بھی ابھی تک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ دروازے پر فوجی پہرہ تھا، اس نے ہمیں روکا مگر اب کی بار ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب ساتھ تھے، انہوں نے اسے اشارہ کیا کہ ان کو اندر جانے دو، ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ علامہ صاحب کو کفن پہنایا جا چکا تھا۔ متعلقہ ملازم نے چہرے سے کفن ہٹایا۔ اللہ کی قسم! وہ تو شیر تھا۔ بہت خوبصورت اور بڑا چہرہ تھا۔ بائیں طرف زخم کا بڑا ہی گہرا نشان تھا جو جسم کے نیچے تک چلا گیا تھا، چہرہ بہت پر سکون تھا۔ چند لمحے تو ہم نے صبر سے کام لیا، مگر پھر عابد الٰہی نے مجھے گلے لگا لیا اور ہم زور زور سے رونے لگے۔ اس طرح ہم نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر اکرام اس بارے میں بیان کرتے ہیں:

حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ نے سب کی رائے طلب کی کہ تدفین کا کیا کرنا چاہیے۔ سب نے مدینے میں تدفین کے لیے رائے دی۔ میں نے سوچا کہ کیا ان کے اہل وعیال چہرہ بھی نہ دیکھ سکیں یہ کیسی عجیب سی بات ہے۔ اسی کے پیش نظر میں نے کہا کہ میت لاہور لے کر جانا چاہیے۔ میں تب تک حاجی ظہور الٰہی صاحب کے مزاج سے آشنا نہ تھا۔ ورنہ ایسی رائے نہ دیتا: جب مدینے کا طے ہو گیا تو حاجی صاحب فرمانے لگے۔ آپ کی عمومی رائے مدینے کے لیے ہی آئی ہے۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف بھی آتی تو بھی میں نے مدینے ہی لے کر جانا تھا۔''

اللہ تعالیٰ بے شمار رحمتیں کرے حاجی صاحب پر کہ بہت واضح اور ٹھوس رائے رکھنے والے تھے۔

مشہور دیوبندی عالم قاری عبدالمجید ندیم اس واقعے کے راوی ہیں اور خوشنود علی

خان بھی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں، وہ بھی اس سفر میں علامہ شہید کے ساتھ تھے۔ علامہ کا ایک معمول تھا کہ جب مدینہ طیبہ جاتے تو اپنی مادر علمی جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی ضرور جاتے اور عموماً وہاں ان کے لیکچر بھی ہوتے۔

شہادت سے ایک ماہ پیشتر علامہ جب سعودی عرب تشریف لے گئے تو اپنے معمول کے مطابق جامعہ اسلامیہ گئے۔ طلباء نے فرمائش کی کہ ہمارے ساتھ جنت البقیع چلیے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ علامہ جنت البقیع کے بھی ''حافظ'' تھے اور صحابہ وتابعین کرام کی قبور کے متعلق بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ راستے میں ہی قاری عبدالمجید ندیم بھی مل گئے۔ انہیں بھی ساتھ لے لیا۔ آپ جنت البقیع چلے گئے اور طلباء کو بقیع الغرقد کی تاریخ کے متعلق بتانے لگے۔ پھر ایک مقام پر کھڑے ہو کر ایک پتھر کو پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر ماری، آب دیدہ ہو کر کہنے لگے ''اللہ کے ہاں کیا مشکل ہے کہ ہمیں بھی یہاں جگہ مل جائے۔'' کچھ لمحات قبولیت کے ہوتے ہیں۔ وہ لمحہ بھی یقیناً ایسا ہی تھا۔ عین اس جگہ ہی اللہ تعالیٰ نے علامہ کو جگہ عطا فرمائی، ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کے نیک بندے کبھی ایسی بات کہہ دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کے پیر صاحب ہوتے تو وہ یقیناً کہہ دیتے ہمارے پیر صاحب نے پہلے ہی جگہ منتخب کر لی تھی کہ ''میں نے یہاں دفن ہونا ہے۔'' اس واقعے کی تفصیل مولانا قاری عبدالمجید ندیم کے قلم سے پڑھیے: [1]

> ''مدینہ طیبہ کی وہ پرکیف صبح کبھی نہیں بھولے گی۔ جب باب جبریل پر ہماری ملاقات ہوگئی (مسجد نبوی سے باہر آتے ہوئے)
>
> احسان الٰہی ظہیر نے میرا ہاتھ پکڑا ...... اور (قدرے تیز قدموں سے) جنت البقیع کی طرف چل دیئے!

[1] راولپنڈی سے ہمارے دوست حافظ وسیم اختر نے ایک بار چند اصحاب سے علامہ شہید، حوالے سے مضامین لکھوائے تھے۔ قاری عبدالمجید ندیم صاحب کا یہ غیر مطبوعہ مضمون بھی ان کے پاس موجود تھا۔ جو از راہ کرم حافظ صاحب نے مجھے عنایت کر دیا اور اس میں سے یہ واقعہ میں نے شامل اشاعت کر دیا ہے۔ (ا۔ب۔ق)

میں دل ہی دل میں سوچتا جا رہا تھا...... یہ وہابی قبرستان کیوں لے جا رہا ہے......؟

جنت البقیع میں ہم دونوں امام مظلوم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کے مرقد پر جا کھڑے ہوئے۔

انہوں نے میری طرف ...... اور میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ خاموش نگاہوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے!

عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کی عظمت و مظلومیت کی ان گنت یادوں نے دل و دماغ پر جو کیفیت طاری کی۔ اس کے اظہار کے لیے الفاظ قطعاً ناکافی ہیں۔ دیر تک آنکھیں اشک بار رہیں۔ پھر احسان الٰہی ظہیر بچوں کی طرح ہچکیاں لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

شاہ صاحب!

یہ ملت اسلامیہ کا وہ عظیم محسن ہے کہ اس کے احسانات آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں۔ ان کا سب کچھ اسلام کے لیے تھا اور دیکھیے ...... جنت البقیع کے ایک کونے میں دفن ہو کر خاموش ہو گئے۔ یہ تو بعد میں توسیع ہوئی کہ یہ قبر وسط میں آ گئی۔ یہ سامنے والا حصہ تو ابھی شامل کیا گیا ہے جو آنے والوں کے لیے دامن وا کیے منتظر ہے۔ پھر اچانک قبلہ رُو ہو گئے اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

(قبرستان سے ذرا ہٹ کر) ''اے ربّ محمد! جنت البقیع میں اتنی بڑی جگہ خالی پڑی ہے۔ دفن کے لیے دو گز زمین یہیں عطا کر دے۔''

پھر ہم دونوں جنت البقیع میں مدفون صحابہ و اہل بیت و بنات رسول رضی اللہ عنہم اجمعین

جب مارچ میں بم کے دھماکہ میں وہ شدید زخمی ہو گئے ......تو مجھے مدینہ طیبہ میں ہونے والی دعا کے لمحات وکلمات یاد آ گئے کہ کہیں قبولیت کا وقت تو نہیں آ گیا؟

مگر کہاں لاہور......کہاں جنت البقیع!

اللہ اکبر! ایسی نقد قبولیت مشاہدہ میں آئی کہ جو چاہا......سو مل گیا۔

حالات موزوں ہوتے گئے۔ اسباب بننے لگے، فاصلے مٹنے لگے۔ سعودی عرب کے فرماں روا کے دل میں اللہ نے داعیہ ڈال دیا کہ مرے ایک بندے نے مجھ سے جنت البقیع کا بسیرا مانگا، میں اسے دینا چاہتا ہوں۔

انہوں نے اپنا جہاز بھیجا جس میں احسان الٰہی ظہیر کو لے جایا گیا اور توحید و سنت کے مبلغ نے وہاں جا کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا!

پھر وہی ہوا جو سب نے دیکھا کہ دھماکہ لاہور میں اور قبر جنت البقیع میں۔

حالانکہ پہلے ریاض میں ان کی نماز جنازہ ہوئی، وہاں بھی تدفین ہو سکتی تھی۔

مگر جنت البقیع کے دامن شفقت میں دفن ہونا اللہ سے مانگا تھا، اللہ نے وہیں پہنچا کر دکھایا۔

﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ (الرحمٰن)

(از قلم: قاری عبدالمجید ندیم)

☆......☆......☆

وہ چاند طیبہ میں جا کے ڈوبا

جو چاند میرے وطن سے نکلا

سعودی قانون کے مطابق جہاں وفات ہو، میت کو دفن بھی وہاں ہی کیا جاتا ہے۔

مگر علامہ کے معاملے میں خاصی رعایت دی گئی۔ پہلے ریاض میں نماز جنازہ ہوئی۔

میں دل ہی دل میں سوچتا جا رہا تھا ...... یہ وہابی قبرستان کیوں لے جا رہا ہے......؟

جنت البقیع میں ہم دونوں امام مظلوم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کے مرقد پر جا کھڑے ہوئے۔

انہوں نے میری طرف ...... اور میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ خاموش نگاہوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے!

عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کی عظمت و مظلومیت کی ان گنت یادوں نے دل و دماغ پر جو کیفیت طاری کی۔ اس کے اظہار کے لیے الفاظ قطعاً ناکافی ہیں۔ دیر تک آنکھیں اشک بار رہیں۔ پھر احسان الٰہی ظہیر بچوں کی طرح ہچکیاں لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

شاہ صاحب!

یہ ملت اسلامیہ کا وہ عظیم محسن ہے کہ اس کے احسانات آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں۔ ان کا سب کچھ اسلام کے لیے تھا اور دیکھیے ...... جنت البقیع کے ایک کونے میں دفن ہو کر خاموش ہو گئے۔ یہ تو بعد میں توسیع ہوئی کہ یہ قبر وسط میں آ گئی۔ یہ سامنے والا حصہ تو ابھی شامل کیا گیا ہے جو آنے والوں کے لیے دامن وا کیے منتظر ہے۔ پھر اچانک قبلہ رُو ہو گئے اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

(قبرستان سے ذرا ہٹ کر) ''اے ربِّ محمد! جنت البقیع میں اتنی بڑی جگہ خالی پڑی ہے۔ دفن کے لیے دو گز زمین یہیں عطا کر دے۔''

پھر ہم دونوں جنت البقیع میں مدفون صحابہ و اہل بیت و بنات رسول رضی اللہ عنہم اجمعین کے مقبروں پر تبصروں تذکروں کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

جب مارچ میں بم کے دھماکہ میں وہ شدید زخمی ہو گئے ......تو مجھے مدینہ طیبہ میں ہونے والی دعا کے لمحات وکلمات یاد آ گئے کہ کہیں قبولیت کا وقت تو نہیں آ گیا؟

مگر کہاں لاہور......کہاں جنت البقیع!

اللہ اکبر! ایسی نقد قبولیت مشاہدہ میں آئی کہ جو چاہا......سو مل گیا۔

حالات موزوں ہوتے گئے۔ اسباب بننے لگے، فاصلے مٹنے لگے۔ سعودی عرب کے فرماں روا کے دل میں اللہ نے داعیہ ڈال دیا کہ مرے ایک بندے نے مجھ سے جنت البقیع کا بسیرا مانگا، میں اسے دینا چاہتا ہوں۔

انہوں نے اپنا جہاز بھیجا جس میں احسان الٰہی ظہیر کو لے جایا گیا اور توحید و سنت کے مبلغ نے وہاں جا کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا!

پھر وہی ہوا جو سب نے دیکھا کہ دھماکہ لاہور میں اور قبر جنت البقیع میں۔

حالانکہ پہلے ریاض میں ان کی نماز جنازہ ہوئی، وہاں بھی تدفین ہو سکتی تھی۔

مگر جنت البقیع کے دامن شفقت میں دفن ہونا اللہ سے مانگا تھا، اللہ نے وہیں پہنچا کر دکھایا۔

﴿هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ﴾ (الرحمٰن)

(از قلم: قاری عبدالمجید ندیم)

☆......☆......☆

وہ چاند طیبہ میں جا کے ڈوبا
جو چاند میرے وطن سے نکلا

سعودی قانون کے مطابق جہاں وفات ہو، میت کو دفن بھی وہاں ہی کیا جاتا ہے۔

مگر علامہ کے معاملے میں خاصی رعایت دی گئی۔ پہلے ریاض میں نماز جنازہ ہوئی۔

عبدالمالک مجاہد لکھتے ہیں:

علامہ صاحب کی پہلی نماز جنازہ ظہر کے وقت ریاض کی دیرہ والی مرکزی مسجد میں ہونا تھی۔ اس روز سارا شہر امڈ آیا تھا۔ میں صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں کو مجھ پر ترس آتا گیا، میری شکل ہی ایسی بنی ہوئی تھی کہ وہ میرے لیے راستہ چھوڑتے چلے گئے اور میں اسی طرح بڑھتے بڑھتے صف اوّل میں پہنچ گیا۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ، شیخ عبداللہ المعتاز اور دیگر بے شمار چوٹی کے علماء اور مشائخ موجود تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر شرکائے جنازہ کی طرف دیکھا، یہ مسجد ریاض کی بڑی مساجد میں سے ایک ہے، بلاشبہ ہزاروں کا مجمع تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی نظر آئی۔ ریاض کی اس مرکزی مسجد میں علامہ صاحب کا جنازہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ سمیت ہم لوگوں نے رو رو کر پڑھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا، نماز جنازہ کے بعد لوگ کندھا دینے کے لیے آگے بڑھے، ہجوم بہت زیادہ تھا۔ [1]

اور اس دوران حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا جو لوگ مسجد نبوی میں جنازہ و تدفین میں شریک ہونا چاہتے ہیں، دو خصوصی طیارے ان کے لیے مختص کیے گئے ہیں، وہ جا سکتے ہیں۔ یہ دونوں طیارے عزت مآب شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز آل سعود ولی عہد حکومت سعودیہ، وزیر دفاع مملکت کے حکم پر دیے گئے تھے۔ اور میں علامہ کی میت رکھی گئی اور دوسرے جہاز میں عام لوگ سوار تھے۔ قریباً چار سو افراد مدینے کے لیے گئے۔

علامہ کے ریاض سے مدینہ کے اس سفر کا حال عبدالمالک مجاہد اس طرح بیان کرتے ہیں:

اسی ایمبولینس میں بیٹھ کر پرانے ائر پورٹ آ گیا۔ نیچے اترے تو وہاں ایک

[1] سنہری یادیں، صفحہ: 287/286۔

چھوٹی سی دیوار کے اوپر محترم ڈاکٹر عبداللہ ترکی حفظہ اللہ نہایت غم زدہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی غالباً میت کو کندھا دیا، انہوں نے ڈاکٹر فضل الٰہی کو گلے لگایا، تعزیت کی اور اتنی بات میں سن سکا: فضل الٰہی! تم لوگوں نے آنے میں خاصی دیر کر دی۔

یہ C-130 جہاز تھا۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ میں بھی ایمبولینس سے اپنے ہاتھوں میت کو اتارنے والوں اور جہاز تک پہنچانے والوں میں شامل تھا۔ جہاز میں غالباً آٹھ یا دس لوگ تھے۔ جن میں ڈاکٹر فضل الٰہی، کیپٹن عبداللہ المرسل، سفیر پاکستان جناب امیر گلستان جنجوعہ، شیخ عبداللہ سرور، راقم الحروف اور بعض دیگر ساتھی شامل تھے۔

علامہ صاحب کی تدفین کی سعادت کے حصول کے لیے ہم سب مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ریاض سے مدینہ کا سفر کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہو گیا تھا۔ مدینہ ائرپورٹ پہنچے تو وہاں مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک انبوہ کثیر تھا۔ مجھے یہ سعادت پھر ملی کہ علامہ صاحب کے جسد خاکی کو اپنے ہاتھوں سے زمین پر اتارا۔ اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت ائرپورٹ کے اندرون وے تک آئی ہوئی تھی۔ میں اب بھی چشم تصور میں فضیلۃ الشیخ عبدالقادر سندھی رحمہ اللہ کو نہایت غم زدہ دیکھ رہا ہوں۔ ساتھیوں نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ جسد خاکی کا استقبال کیا، وہاں پر ایمبولینس کھڑی تھی، ہم لوگ اسی میں بیٹھ کر مسجد نبوی آ گئے اور ریاض الجنہ میں بیٹھ کر ذکر اذکار اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ ریاض سے علامہ کو مدینہ طیبہ لے جایا گیا اور مسجد نبوی میں جنازہ ادا کیا گیا۔ [1]

[1] سنہری یادیں صفحہ: 288۔

میرے چھوٹے بھائی عمر فاروق قدوسی چند سال قبل حج کے سفر پر تشریف لے گئے تو مسجد نبوی میں ایک قاری صاحب سے ملاقات ہوئی ان کا نام قاری عبداللطیف تھا۔ ان کا اپنا ایک حلقہ تھا۔ سال ہا سال سے وہاں مقیم تھے اور مسجد نبوی میں طلباء کو تجوید و قراءت کا سبق دیتے تھے۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسجد نبوی کا معمول ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی کی میت بھی آ جائے تو بھی مسجد نبوی میں انتہائی مختصر اعلان ہوتا ہے کہ جنازہ ہے اور اس پر نماز ہو گی لیکن شاہ فیصل کے بعد دوسری شخصیت علامہ کی تھی کہ جس کے لیے اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ آج عالم اسلام کی عظیم شخصیت، امام اہل السنہ، نبی کریم ﷺ کی حرمت کے نقیب، صحابہ کے دفاع کا فریضہ انجام دینے والے شہید کا جنازہ آیا ہے۔ کتنی ہی دیر رندھی ہوئی آواز اور آنسوؤں کے بیچ اعلان اور ذکرِ احسان ہوتا رہا۔ پھر نماز مغرب کے فوراً بعد آہوں اور سسکیوں میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مسجد نبوی اس جنازے کے لیے یوں بھری ہوئی تھی، کہ لوگ حیران ہو کر پوچھ رہے تھے کہ یہ کس کا جنازہ ہے اور خاص بات یہ کہ اہل عرب کے بڑے بڑے شیوخ، مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ وطلباء اور عام سعودی شہری بھی اس شہید کے جنازے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے موجود تھے۔

اس کے بعد علامہ کی میت کو جنت البقیع لے جایا گیا۔ آج جنت البقیع کا وسیع احاطہ تنگ دامنی کی شکایت کر رہا تھا۔ جنت البقیع میں علامہ کی تدفین کا منظر سنہری یادوں میں اس طرح رقم ہے:

> سب کی خواہش تھی کہ علامہ صاحب کا آخری دیدار کریں۔ میت کو بقیع الغرقد کی طرف لے جایا گیا۔ اتنا زیادہ ہجوم تھا کہ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ ہر شخص کندھا دینے کا خواہش مند تھا۔ بقیع الغرقد کے دروازے پر جا کر علامہ صاحب کے وجیہ چہرے سے کفن

ہٹایا گیا تو لوگ زیارت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ نوجوانوں نے اپنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک مضبوط انسانی دیوار بنا دی تاکہ لوگ آرام سے زیارت کر سکیں۔ چند منٹ آرام سے گزرے ہوں گے، مگر ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ ہماری تمام تر کوششیں ناکام ہوگئیں، مدینہ منورہ یونیورسٹی کے طلبہ نے بے پناہ نظم وضبط کا مظاہرہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم آنے والوں لوگوں کے لیے راستہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم اتنے زیادہ ہجوم کو کنٹرول نہیں کر سکتے تھے۔

اگر آپ مسجد نبوی کی جانب سے بقیع میں داخل ہوں تو اندر داخل ہونے کے بعد تھوڑی سا بائیں طرف علامہ شہید کی قبر ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو باوجود سخت ہجوم کے قبر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ نے بھی وہاں تک پہنچنے میں یقیناً میری مدد کی۔ اس وقت علامہ صاحب کے والد گرامی ان کی قبر پر کھڑے تھے۔ میں جب پہنچا تو علامہ صاحب کو لحد میں اتارا جا چکا تھا۔ شیخ ظہور الٰہی صاحب روتے ہوئے اپنے بیٹے کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے اور ان کی مغفرت کے لیے بار بار دعا کر رہے تھے۔ پھر قائد اہل حدیث کو منوں مٹی تلے دفنا دیا گیا۔ [1]

لیجیے بسترِ مرگ پر اپنے بیٹے کو اُماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی ناموس کا دفاع کرنے کی وصیت کر کے جانے والا لائق بیٹا اپنی ماں کے قدموں میں ابدی سکون اور آرام کی نیند سو گیا۔

میو ہسپتال میں جب علامہ کی والدہ نے پوچھا تھا ''احسان پتر کتھے درد اے'' تو اس نے جواب دیا تھا ''اماں جی درداں بڑیاں'' آج سارے درد کے درماں ہو گئے تھے

[1] سنہری یادیں، صفحہ: 289-288۔

کہ مدینے کی گلیوں کی عاشق تھا وہیں جا بسا۔

ہمیں یقین ہے کہ (ان شاء اللہ) قیامت کا دن ہوگا، سب سے پہلے نبی کریم ﷺ اپنی قبر مبارک سے اٹھیں گے، پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ اٹھیں گے۔ آپ جنت البقیع کی طرف تشریف لے جائیں گے۔ آپ کے اصحاب اور اہل بیت اٹھیں گے، وہیں ان شاء اللہ ان سب کے قدموں کے بیچ میں سے علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی اٹھیں گے۔

میرے ایک عزیز مدت سے مدینہ طیبہ میں رہتے ہیں۔ وہ بھی علامہ کے جنازے میں شریک تھے۔ وہ کہتے ہیں میرے ساتھ ساتھ دو عرب جوان جا رہے تھے۔ آنسوان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور ہچکیاں بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا تم اس قدر کیوں رو رہے ہو؟ وہ کہنے لگے ''آج اہل سنت کا امام چلا گیا۔ آج صحابہ کا دفاع کرنے والا رخصت ہو رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم یتیم ہو گئے ہیں۔''

☆......☆......☆

لاہور کی زخمی صبح

صبح کے سات بجنے کو تھے۔ سارا گھرانہ جاگ رہا تھا۔ جس روز سے علامہ زخمی ہوئے تھے، علامہ کی والدہ اور دادی محترمہ ۴۷۵ شادمان میں موجود تھیں۔ رات علامہ سعودی عرب جا چکے تھے۔ صبح صبح بھابھی (علامہ کی دادی) زور زور سے کہنے لگیں۔

''لالہ خواب میں آیا ہے کہہ رہا تھا میرا ایک پاؤں سیالکوٹ میں ہے ایک مدینے میں۔ ہائے میں کیا کروں۔''

لالہ جی ''بھابھی'' کے خاوند اور علامہ کے دادا (حاجی احمد دین) تھے۔ سب حیران ہوئے کہ اس خواب کا کیا مطلب۔ کہ علامہ تو ہزار میل دور ریاض میں گئے ہیں لیکن صرف ایک گھنٹے بعد اندازہ ہوگیا کہ اس خواب کا کیا مطلب تھا کہ جب خبر آئی کہ علامہ شہید ہو گئے ہیں اور جنت البقیع میں ان کی تدفین کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

لاہور میں جب علامہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو صف ماتم بچھ گئی۔ ہر کسی کے لیے ناقابل یقین تھا کہ ایسا جیتا جاگتا انسان،

کہ جس کی وجہ سے لاہور جیتا جاگتا شہر لگتا تھا،

کہ جو لاہور کی مجلسی زندگی کا جھومر تھا،

کہ جس کے تبسم سے یہ شہر مسکراتا تھا،

جس کی آمد و رفت اس شہر کی رونق کا پتا دیتی تھا۔

آج وہ ہمالیہ پہاڑ کی طرح بلند انسان زمین کے نیچے جاچکا ہے۔

اک قیامت تھی کہ نہ جانے کتنے دلوں پر بیت گئی۔ بم دھماکے کو سات دن گزر چلے تھے میں اپنے والد کی جگہ پر مکتبہ قدوسیہ پر بیٹھ گیا تھا۔ عربی کتب کا کاروبار، اپنے ''پلّے'' کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

میں دکان پر بیٹھا تھا کہ مولوی یعقوب آیا۔ ایک دم خاموش سا، چہرے پر، ہزار قبرستانوں کی ویرانی لیے،

''علامہ صاحب شہید ہو گئے ہیں۔'' میں خاموشی سے اٹھا، اس کے ساتھ موٹر بائیک پر بیٹھا اور ۴۷۵ شادمان کی طرف چل دیا۔ بس ایک احساس تھا کہ میرے والد آج دنیا سے گئے ہیں۔

وہاں پہنچے تو کہرام تھا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ صحافی سیاست دانوں کی دایہ ہوتے ہیں کہ جن سے ان کا کچا چھٹا چھپا نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس روز عجیب منظر تھا۔ ایک طرف جاوید جمال ڈسکوی دھاڑیں مار رہا ہے دوسری طرف انور قدوائی اور ایک کونے میں مجیب الرحمان شامی نوحہ کناں ہیں۔ وہ شخص سب کی متاع عزیز تھا، سب کے دکھ درد کا ساتھی تھا کہ ہر کوئی رو رہا تھا۔

محبت کے رنگ

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید سے تو یوں لگتا تھا کہ جیسے سارا لاہور پیار کرتا تھا اور پیار کے رنگ کتنے عجیب تھے کہ آپ حیران ہو جائیں گے۔ علامہ کی شہادت کے کتنے برس بعد کا ذکر ہے کہ چوہدری اعتزاز احسن کے والد چوہدری احسن علیگ وفات پا گئے۔ تعزیت کے لیے جانا ہوا۔ باتوں میں ذکر علامہ کا آ نکلا۔ اعتزاز احسن پرانی باتیں یاد کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ علامہ کی شہادت کے اگلے روز میں گھر آیا تو باہر لان میں دریاں بچھی اور چند افراد سپارے ہاتھ میں پکڑے تلاوت میں مشغول۔ میرے والد بھی ساتھ بیٹھے۔ میں حیران پریشان کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آگے بڑھا والد سے پوچھا ''ابا جی یہ کیا'' کہنے لگے آج احسان الٰہی ظہیر کو فوت ہوئے دو دن ہو گئے ہیں نا۔ اس لیے...... میں نے کہا پر ابو جی وہ تو اس کو مانتے ہی نہیں تھے۔ بدعت کہتے تھے۔ جواب میں کہنے لگے ''مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کہتے تھے کیا نہیں ...... میرا وہ بیٹا تھا۔ مجھے اس سے پیار تھا۔ اس لیے یہ تمام اہتمام ہے...... مجھے یہ واقعہ لکھتے ہوئے دلی میں بیٹھا...... ہندو کرنا بیدی یاد آ رہا ہے کہ جب حفیظ جالندھری فوت ہوئے تو اپنے گھر میں دریاں بچھا کر حفیظ کا چالیسواں کروا رہا تھا محبت کے رنگ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

دور جا کے قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے
اب نہ آؤ گے نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے

علامہ شہید رحمہ اللہ کا گھرانہ

علامہ احسان الٰہی ظہیر پانچ بھائی اور پانچ ہی بہنیں تھیں اور علامہ اپنے سب بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ ڈاکٹر فضل الٰہی علامہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھے۔ ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ اپنے والد کی خواہش پہ عالم دین بنے ریاض یونیورسٹی میں اور پھر اسلام آباد یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ آپ کی عربی اور اردو میں تقریباً ساٹھ سے زیادہ کتب ہیں۔ جن میں بعض کی اشاعت لاکھوں کو عبور کر چکی ہے۔ ان کے بعد حافظ شکور الٰہی تھے جو گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ چند برس پہلے وفات پا چکے۔ ان کے بعد شیخ محبوب الٰہی ہیں جو گوجرانوالہ میں رہائش پذیر اور کپڑے کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ سب سے چھوٹے حافظ عابد الٰہی، مکتبہ بیت السلام ریاض کے مالک ہیں۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے حافظ ابتسام الٰہی ظہیر ہیں۔ جماعتی اور ملکی سیاست میں فعال ہیں۔ آپ انجینئر ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ، درجن بھر ایم اے کر رکھے ہیں کہ جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ آپ کی وجہ شہرت آپ کے تبلیغی پروگرام ہیں۔ خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا میں آپ شاید اہل حدیث کی واحد نمائندگی ہیں اور اپنی مستقل محنت کے سبب اپنا مقام ذاتی حیثیت میں بھی طے کروا چکے ہیں۔ ان سے چھوٹے معتصم الٰہی ہیں۔ زیادہ توجہ کاروبار پر ہے مگر گاہے گاہے تبلیغی

پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ تیسرے بیٹے ہشام الٰہی ظہیر ہیں۔ کاروبار کے ساتھ ساتھ علمی مشاغل بھی جاری رکھتے ہیں۔ چند کتب بھی لکھ چکے ہیں جبکہ ٹی وی پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح علامہ شہید کی بیٹیاں ماشاء اللہ سب اپنے گھروں میں آباد اور شاد ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکرام علامہ شہیدؒ کے بڑے داماد ہیں، ریاض میں ہوتے ہیں، آپ ہی کے بیٹے ڈاکٹر سبیل اکرام یعنی علامہ کے نواسے آج کل مرکز اہل حدیث لارنس روڈ پر نماز تراویح میں امامت کرتے ہیں۔ دوسرے شیخ عدنان سرور ہیں، ان کی سیالکوٹ میں فٹ بال بنانے کی فیکٹری ہے، دینی اُمور میں بہت پر جوش ہوتے ہیں۔ پھر شیخ رضوان مقبول ہیں۔ ماشاء اللہ کامیاب کاروباری اور بہت متدین انسان ہیں۔ سب سے چھوٹے محسن جاوید ہیں آپ بھی کپڑے کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ اور پانچویں راقم آثم بھی ان میں شامل ہیں۔ یعنی ابوبکر قدوسی، مکتبہ قدوسیہ کی صورت میں اللہ رب العزت اپنے دین کی نشرواشاعت کا کام لے رہے ہیں۔

احتجاجی تحریک

جب میں نے علامہ کے حوالے سے اپنے چند مضامین کو کتابی شکل دینے کا ارادہ کیا تو میرا خیال تھا کہ علامہ کی شہادت پر اس کتاب کو ختم کر دوں گا۔ علامہ کی شہادت پر چلائی جانے والی احتجاجی تحریک کے حوالے سے کچھ نہیں لکھوں گا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ اس حوالے سے علامہ کی جماعت میں شدید اختلافات پیدا ہوئے اور اس حد تک پہنچے کہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہم بھی اس لڑائی کا حصہ تھے۔ اور اب پچیس برس بعد گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ۔

دوسری بات یہ بھی تھی کہ میں جس قدر نرم زبان استعمال کرلوں، پھر بھی بعض افراد کے چہرے پر شکن ہی نہیں آئے گی بلکہ وہ ''غیر اخلاقی سطح'' پر بھی اتر آئیں گے۔ اور اپنی کمزوری ہے کہ ہم مزاجاً مسلم لیگی نہیں بلکہ ابوالکلامی ہیں کہ جب ابو الکلام کو جناح نے ''کانگریس کا شو بوائے'' کہہ کر گالی دی تو ابوالکلام نے جواب تک نہ دیا۔ لیکن اس ارادے کے ساتھ ایک دوسرا خیال یہ بھی میرے ذہن میں تھا کہ ایسا عظیم انسان یوں بے گناہ اور ناجائز طور پر قتل کر دیا جائے اور تاریخ کے اوراق کہیں کہ کہیں پتہ تک نہ ''کھڑکا'' تھا۔ سو میں نے فیصلہ کیا کہ اختلافی امور سے بچتے ہوئے

بلکہ یہ صحیح تر الفاظ ہے کہ اُن اختلافات پر تین حرف بھیجتے ہوئے احتجاجی تحریک کے بعض ضروری واقعات ذکر کر دیے جائیں اور یہ کہ تحریک کا انجام کیا ہوا۔ یہ سبوتاژ کیوں ہوئی، کون اچھا تھا، کون برا تھا، سب چھوڑیے۔ میں صرف اپنی چند یادیں ذکر کر کے اس موضوع کو ختم کردوں گا۔

پہلا تصادم

ناصر باغ لاہور میں علامہ کا غائبانہ جنازہ پڑھنا طے کیا گیا۔ بے شمار اژدہام تھا، تمام سیاسی جماعتوں کے صف اول رہنما موجود تھے۔ جنازے پر بہت جذباتی تقاریر ہوئیں۔ بعض تقاریر میں جنرل ضیاء الحق، محمد خان جونیجو اور میاں نواز شریف کو براہ راست قتل میں ملوث قرار دیا گیا۔ جنازے کے بعد شرکاء احتجاجی جلوس کی شکل میں مال روڈ پر نکل گئے۔

یقیناً نوجوانوں کے جذبات آج آگ کا سمندر تھے۔ لیکن جو لوگ اہل حدیث قوم کے مزاج کو جانتے ہیں، انہیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ دین کا فہم رکھنے والی اس جماعت کے کارکن کے لیے بہت مشکل ہے کہ کسی کی گاڑی کو ناجائز آگ لگا دے۔ کسی کے گھر کا شیشہ توڑ دے۔ لیکن ہوا یوں کہ مجرمانہ طور پر اور جانتے بوجھتے اس جلوس کو روکا گیا۔ حالانکہ اتنے بڑے اجتماع اور مشتعل گروہ کو روکنے کے لیے سارے لاہور کی پولیس کے جوان بھی کم تھے۔ لیکن حکومت کا اپنا مقصد ہی حالات کو خراب کرنا تھا سو خوب خرابی ہوئی۔ کئی لڑکے گرفتار بھی ہوئے اور کافی نقصان بھی ہوا۔ بدقسمتی سے ہماری جماعت کی قیادت کے لیے اس طرح کے حالات پہلی بار پیش آئے تھے۔ ناتجربہ کاری نے کام دکھایا اور کما حقہ ان معاملات کو نہ سنبھالا جاسکا۔ بلکہ اپنے کارکنان سے بھی لاتعلقی کے بیان جاری کر دیے گئے جس سے نوجوانوں میں بددلی پھیلی اور احتجاجی تحریک کو نقصان ہوا۔ اس کے چند روز بعد گوجرانوالہ میں بھی ایسا ہی پر تشدد

واقعہ پیش آ گیا جو حد درجہ افسوس ناک تھا۔

بھوک ہڑتالی کیمپ

پھر اس کے بعد جماعت نے باقاعدہ احتجاجی تحریک چلانے کا اعلان کیا اور مال روڈ پر ایک بھوک ہڑتالی کیمپ شروع کیا گیا۔ روزانہ چند افراد اس کیمپ میں علامتی بھوک ہڑتال کرتے اور اگلے روز ان کی جگہ نئے افراد آ جاتے۔ اس چوبیس گھنٹے کی بھوک ہڑتال پر بھی جائز نا جائز اور حلال وحرام کے فتوے لگنے شروع ہو گئے۔ خیر ان فتووں نے کسی کا کیا بگاڑنا تھا۔ فقیہ شہر کی سنتا ہی کون تھا۔

ایک طرف اخبارات تھے کہ وہ اس کیمپ کو بہت اہمیت دے رہے تھے اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کا ذریعہ بن رہے تھے۔ دوسری طرف سیاسی قیادت تھی کہ وہ علامہ کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کی لاج رکھنے کے لیے اس کیمپ کا حصہ بن رہی تھی۔ البتہ کیمپ کے چلانے والوں میں کچھ روز بعد ''تھکاوٹ'' کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے۔ احتجاجی تحریکوں کی طوالت دراصل اعصاب کا امتحان ہوتا ہے۔ کوئی کامیاب ہو جاتا ہے کوئی ناکام۔

یہ کیمپ بہت کامیاب جا رہا تھا۔ نواز شریف کی حکومت پریشان ہو چکی تھی کیونکہ علامہ کے مبینہ قاتلوں میں ان ''شرفاء'' کے نام بھی لیے جا رہے تھے۔ اچانک چند روز بعد صوبائی وزیر مواصلات کی آمد پر اس کیمپ کو مذاکرات کر کے بند کر دیا گیا۔ یہ جمعیت میں اختلافات کا پہلا دروازہ تھا۔ بعض لوگ ان مذاکرات کے اتنی ہلکی سطح پر ختم کرنے پر ناراض تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ ان حالات میں یہ ''باعزت'' سمجھوتہ ہی عافیت کا راستہ ہے۔ شاید ہم بھی زیادہ جذباتی تھے یا قتل ہمارے اپنے گھر کے ہوئے تھے، اس لیے مصلحت پسندی سے نا آشنا تھے، بہر حال ہم اس لیے اس گروپ کے ساتھ چلے گئے جو ''قاضی گروپ'' کہلایا کہ جس کے روح رواں برادر عزیز جناب قاضی عبدالقدیر خاموش تھے۔ ان کی اس ''باغیانہ روش'' کے سبب ان کو باضابطہ جماعت سے نکال دیا گیا اور پھر الٹا شعر پڑھے کہ

لوگ ''نکلتے'' گئے کارواں بنتا گیا

کافی لوگ ان کے ساتھ نکالے گئے۔ پہلے لکھ چکا کہ اختلافات کا سبب میرا موضوع نہیں۔ البتہ الگ گروپ کی شکل علامہ کے قتل کے لیے ہم نے جو احتجاجی تحریک چلائی، اس کے چند اہم واقعات ذکر کرنا چاہوں گا۔ ویسے آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کس طرح احتجاجی تحریک کے اتنے بڑے واقعات الزامات، لڑائی جھگڑے کو ''گول'' کر گیا ہوں۔ ویسے تو اس قدر المیہ داستان لکھتے ہوئے بھی میں اس ''گول مٹول'' کہانی پر خود بھی مسکرا رہا ہوں کہ یہ سال بھر کی کہانی ہے، جو میں نے چار جملوں میں اڑا دی ہے۔ چلیے چھوڑیے ہم نے الگ سے جو تحریک چلائی اس طرف آتے ہیں۔

اس تحریک کے سلسلے میں ہم نے پاکستان کے بڑے شہروں میں احتجاجی ریلیاں نکالیں۔ بعض جگہ تو حاضری متاثر کن تھی بعض اوقات بہت کم، جمعیت علمائے اہل حدیث، جسے قاضی گروپ بھی کہا عرف عام میں جاتا تھا، نے لاہور کے بعد سب سے پہلے گوجرانوالہ میں احتجاجی جلوس نکالا۔ جو خاصا کامیاب تھا۔ حافظ محمد شفیق انصاری چوہدری شعیب احسن گوندل، محمود بٹ وغیرہ نے اس کے لیے خاصی محنت کی۔ اس کے بعد قصور میں بھی ایک جلوس نکلا۔ جو بس مناسب ہی تھا۔ کچھ روز بعد پشاور میں بھی ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ جو حاضری کے اعتبار سے خاصا مایوس کن تھا۔ شاید یہ بات بھی تھی کہ علامہ کے حادثے کو دوسرا سال شروع ہو چکا تھا اور ہماری رومانوی کیفیت کے برعکس عام لوگ حقیقت کی دنیا میں واپس جا چکے تھے۔ اس کے بعد ایک جلوس کراچی میں نکالا گیا جو اس سلسلے کا آخری جلوس ثابت ہوا۔ اس کے بعد ہم تھک گئے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ دو سال بعد بھی اخبارات میں علامہ کے قتل پر احتجاج کی خبریں مسلسل آ رہی تھی۔

اس احتجاجی تحریک کے سلسلے میں ایک پریس بریفنگ میں مجیب الرحمان شامی

صاحب نے ہمیں مخاطب کر کے کہا تھا کہ ایک بات طے ہے کہ جس قدر طویل تحریک آپ لوگوں نے علامہ احسان الٰہی ظہیر کے لیے چلائی ہے اتنی تو بھٹو کے لیے بھی نہیں چلائی گئی تھی۔

شاہین میدان میں

ایک بار احتجاجی جلسہ مسجد شہدا میں رکھا گیا۔ بہت خوبصورت اشتہار شائع کیے گئے۔ اس میں بھی استاد عبدالرشید قمر نے جان لگا دی، عنوان تھا۔ ''شاہین میدان میں'' مسجد شہدا کے اس جلسے کے اختتام پر احتجاجی ریلی بھی تھی۔ حسب معمول پولیس نے تشدد کرنا شروع کر دیا۔ اصل میں جب قاتل قاتل نواز شریف قاتل کے نعرے تسلسل سے لگنے شروع ہو گئے تو حکومت ڈر گئی تھی کہ کہیں یہ کیس بھٹو کی طرح نواز شریف کے گلے نہ پڑ جائے۔ اس روز بھی بہت لاٹھی چارج ہوا۔ کئی سر پھٹے۔ مولوی یعقوب پر تو اس قدر وحشیانہ تشدد کیا گیا کہ اس کے سر پر ڈنڈے مارے جا رہے تھے اور ایک دوسرا دوست اس کے سر پر ہاتھ رکھے اس کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس روز اسیروں میں میرے چھوٹے بھائی عمر فاروق قدوسی بھی شامل تھے دس دن بعد ضمانت ہوئی مگر وہ 18 سال سے کم عمر ہونے کے سبب کیمپ جیل کی بچہ بارک کی زیارت کر آئے۔

کفن پوش جلوس

اسی طرح ایک کفن پوش جلوس مسجد چینیاں والی سے بھی نکالا گیا۔ اس میں نوجوانوں نے سر پر سفید کپڑے علامتی کفن کے طور پر پہنے ہوئے تھے، یہ جلوس ابھی بھاٹی چوک پہنچا تھا کہ شاید اوپر سے پھر آرڈر آ گئے اور مار کٹائی کا ''پیریڈ'' شروع ہو گیا، میں جو ہمیشہ بچ نکلتا تھا اس روز قابو آ گیا، پولیس کے ڈنڈوں نے مجھے بھی خاصا زخمی کر دیا اسی روز اندازہ ہوا کہ یار یہ تو خاصے زور کے لگتے ہیں۔

اس مسلسل تحریک نے حکومت کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف مرکز میں

محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت آچکی تھی۔ انہیں یہ سارا منظر خاصا پسند آرہا تھا۔ وہ اگرچہ غیر جانبدار تھیں لیکن ان کی ہم دردیاں مظلوموں کے ساتھ تھیں۔ جی ہاں! ہم مظلوم تھے کیونکہ میاں نواز شریف اور ضیاء الحق کے اقتدار میں ہمارے بزرگوں نے جام شہادت نوش کیا تھا اور ہمیں ان کے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے احتجاج کرنے پر مارا جا رہا تھا۔ گرفتار کیا جا رہا تھا۔ ان شاء اللہ روز آخرت ضیاء الحق اور اس کے اشارہ ابرو پر ظلم کی یہ داستان رقم کرنے والے اس کے کشمیری گماشتوں کو اس ظلم کا حساب بھی دینا ہوگا۔

بات ہو رہی تھی احتجاجی تحریک کی۔ سو میاں نواز شریف نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں لاہور کے ایک صاحب کے ذریعے اس وقت کے وزیر داخلہ چوہدری شجاعت صاحب نے ہمارے گھر آنا چاہا، ملاقات کی حد تک ہمیں کیا انکار ہوسکتا تھا۔ چنانچہ چوہدری شجاعت حسین ہم سے "مذاکرات" کرنے چلے آئے۔ تب چوہدری صاحب کی بات کچھ، کچھ پلے پڑ جاتی تھی۔ اس نشست میں برادرم قاضی عبدالقدیر خاموش بھی موجود تھے۔ بلکہ وہی مذاکرات میں ہماری نمائندگی کر رہے تھے۔

دوران گفتگو میاں نواز شریف کے لیے ان کے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔ البتہ چوہدری شجاعت حسین کا احترام تھا۔ کیونکہ وہ چوہدری ظہور الٰہی کے بیٹے تھے اور چوہدری ظہور الٰہی کو جب قتل کیا گیا تو علامہ شہید سے ان کی قربت کے باعث چوہدری فیملی کی خواہش پر ان کا جنازہ حضرت علامہ شہید نے پڑھایا۔ حضرت علامہ کے چوہدری شجاعت سے بھی بہت گہرے مراسم بلکہ دوستانہ تھا۔ پھر چوہدری شجاعت کا تعلق گجرات سے تھا، قاضی کا تعلق بھی گجرات کے نواح میں ایک گاؤں "ہیل" سے ہے۔ اس لیے چوہدری صاحب سے احترام کا ایک رشتہ تھا۔ چوہدری شجاعت کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا۔ انہوں نے اس نکتے سے بات شروع کی کہ "دیکھیں میاں نواز شریف کا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں آپ اس کے بارے میں ہاتھ ہولا رکھیں۔" میں نے کہا کہ

"آپ کی بات مان لیتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ واقعہ ان کی حکومت میں ہوا ہے، اس لیے بالواسطہ طور پر ہی سہی وہ ذمے دار ہیں۔ دوسرے ان کا بیان شائع ہوا ہے کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں، سب کو پتہ ہے کہ علامہ کا قاتل کون ہے۔ قاتل نہ پکڑیں ہمیں ان کا نام بتا دیں۔"

ایک اور بات جو چوہدری شجاعت حسین نے یہ کہی کہ "آپ کی اس تحریک کا فائدہ پیپلز پارٹی اٹھا جائے گی اور وہ اس کیس کو میاں نواز شریف کے خلاف استعمال کرے گی۔" میں نے انہیں فوراً جواب دیا، کہ ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد سے کسی نے کہا آپ کانگریس کے ساتھ ہیں جو ہندوؤں کی جماعت ہے۔ تو انہوں نے کہا میری دشمنی انگریز کے ساتھ ہے جو اس کے خلاف آگ جلائے گا، میں اپنے حصے کی لکڑی اس میں ڈال دوں گا۔ چوہدری صاحب ہمارا بھی یہ مسئلہ ہے کہ یہ تو پیپلز پارٹی ہے، کالے چور کو بھی فائدہ پہنچے تو ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہمارے اس دو ٹوک لہجے پر چوہدری شجاعت حسین اپنے سیاہ رنگ کے بریف کیس سمیت اٹھ گئے۔ ان کے اس طرح نامراد جانے پر میرے ایک دوست نے تبصرہ کیا کہ تم نے بھرا ہوا بریف کیس واپس ہی بھیج دیا؟ اور میں سوچ رہا تھا کہ بھلا اپنے باپ کا خون بھی بیچا جاتا ہے۔

پنجاب حکومت نے ایک کوشش مزید کی کہ ہمایوں اختر خان کی اور میری ملاقات جاوید جمال ڈسکوی مرحوم کے دفتر روز نامہ جنگ میں کروائی۔ قاضی عبدالقدیر خاموش بھی موجود تھے۔ بہت جلد ہمایوں اختر "سیدھی بات" پر اتر آئے۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ چلیں ایسا کرتے ہیں الذوالفقار والوں کے ساتھ آپ کے ابا کے خون کا سودا ہم کرواتے ہیں آپ پنجاب حکومت سے ہمارا کروا دیں اور یوں بات ختم ہوگئی۔ اس ملاقات کے بعد پنجاب حکومت یعنی شریف برادران کو اندازہ ہوگیا کہ ہر چیز خریدی نہیں جا سکتی۔

اب انہوں نے دوسرا حربہ استعمال کیا کہ قاضی عبدالقدیر خاموش جو اس تحریک کو لیڈ کر رہے تھے، ان کے خلاف جنگ نوائے وقت وغیرہ اخبارات کے پہلے صفحات پر اشتہار لگوا دیے کہ یہ خود علامہ کے قاتل ہیں ہم نے مقدور بھر اس کا جواب دیا۔ لیکن اس شعر کے ایک مصرعے میں پوری کہانی سمٹ آئی ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس کے بعد عبدالقدیر خاموش دفاعی پوزیشن پر چلے گئے۔ وقت بھی کافی گذر چکا تھا اور یوں اہل حدیث کی تاریخ کی یہ طویل احتجاجی تحریک دم توڑ گئی۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر کانفرنس

ہاں یہ ضرور ہے کہ قاضی عبدالقدیر خاموش نے اپنے اس عشق کو دوسرے طور پر شروع کر دیا۔ کہ ہر سال بڑے اہتمام سے علامہ احسان الٰہی ظہیر انٹرنیشنل کانفرنس کا انعقاد شروع کر دیا۔ عموماً یہ الحمرا ہال لاہور میں منعقد ہوتی۔ جس میں اہل حدیث اور غیر اہل حدیث مقررین کو بلایا جاتا۔ ہم دوست مل کر، بہت چاہ سے، محبت سے یہ کانفرنس کرواتے رہے۔ غالباً دس بارہ سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ تآنکہ علامہ رحمہ اللہ کے بیٹے ابتسام الٰہی ظہیر پورے طور پر میدان سیاست میں کود پڑے۔ قاضی عبدالقدیر خاموش یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ اب حافظ ابتسام الٰہی ظہیر میدان میں ہیں، اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔

خود قاضی عبدالقدیر خاموش جماعت اہل حدیث کے عمومی دھارے سے نکل گئے۔ اہل حدیث سیاست کو تقریباً خیر باد کہہ دیا اور روابط کی سیاست شروع کر دی۔ ایک وقت آیا کہ پیپلز پارٹی کے نفس ناطقہ بن گئے۔ حتی کہ بے نظیر بھٹو جب آخری بار وطن واپس آئیں اور حملے میں ماری گئیں، اس سفر سے پہلے لندن میں ARD کی آخری پریس کانفرنس کی۔ جس میں ان کے ایک طرف امین فہیم اور دوسری طرف قاضی

عبدالقدیر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ محترمہ نے کچھ دیر گفتگو کی اور پھر کہنے لگیں اب بقیہ باتیں خاموش صاحب کریں گے اور وہی آپ کے سوالوں کے جواب دیں گے۔ یہ بے نظیر بھٹو کا جناب قاضی صاحب پر غیر معمولی اعتماد تھا اور میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بندہ اتنا با صلاحیت تھا کہ تنہا بغیر جماعت کے اس اعلیٰ سیاسی مقام تک پہنچا۔ آہ ہم نے ایسے قابل لوگ اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیے۔ آج کل قاضی عبدالقدیر خاموش بین المذاہب مکالمے کے پرچم بردار ہیں اور میرا ان سے اس میں اختلاف کا رشتہ ہے۔ لیکن محبت ایسی ہے کہ وہ آج بھی میرا تعارف اپنے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے کرواتے ہیں اور میرے لیے وہ آج بھی بڑے بھائی ہیں۔

خوشگوار موت

اللہ ہم تجھ سے موت مانگتے ہیں تو اسے اپنی راہ میں شہادت کی موت نصیب فرما۔ موت تو وہ ہے کہ جب خدا حشر کو پوچھے کیا لے کر آئے ہو؟ تو کہیں اللہ گناہ تو بہت ہیں لیکن اِن گناہوں کو شہادت کی چادر کے خون میں ڈھانپا ہوا ہے اس سے خوشگوار موت کیا ہے؟

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کو کس نے قتل کیا؟

یہ سوال آج بھی جواب طلب ہے کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کو کس نے قتل کیا تھا۔ اگر علامہ کی زندگی پر نظر دوڑائی جائے تو نظر آتا ہے کہ علامہ نے اپنی تحریر و تقریر کی وجہ سے بے شمار دوستیاں اور دشمنیاں پیدا کر لی تھیں۔

آخری چند برسوں میں علامہ کی تقریریں جنرل ضیاء الحق اور اس کے طرز حکومت کے خلاف بہت تلخ ہو چکی تھیں۔ دوسری طرف تشیع پر یکے بعد دیگرے کئی کتب منظر عام پر آچکی تھیں۔ اگرچہ آخری کتاب ''الشیعہ والتشیع'' حادثے سے چند سال پہلے ہی شائع ہوگئی تھی اور یوں اسے کچھ سال گزر چکے تھے۔ لیکن ایران کی مذہبی اور ملاؤں کی حکومت آپ کے لیے شدید نفرت کے جذبات رکھتی تھی۔ تہران سے شائع ہونے والے پرچے ''کیہان'' میں بعض ایسی تحریریں شائع ہو چکی تھیں کہ جن میں علامہ کے قتل کے حوالے سے بشارتیں دی گئیں ہیں۔

ان کی کتاب ''الاسماعیلیہ'' کے حوالے سے ہم لکھ چکے کہ کس طرح ترغیب اور تحریص کے ذریعے اس کی اشاعت کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ علامہ نے رکنا کیا تھا، الٹا ان کو اپنے آئندہ عزائم سے بھی آگاہ کر دیا کہ اس کا دوسرا حصہ بہت جلد جدید اسماعیلی عقاید اور اعمال

کے حوالے سے آ رہا ہے۔ صاف نظر آتا تھا کہ علامہ کو اپنی جان کی ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی۔ یا شاید وہ قبائے شہادت اوڑھنے کو بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔

جہاں تک علامہ کا تعلق ہے کہ ان کے خیالات اس حادثے کے بارے میں کیا تھے۔ قانونی اعتبار سے یہ سب سے اہم بات ہے۔ اس کو آپ علامہ کا نزاعی بیان بھی کہہ سکتے ہیں۔ یقیناً ان کو کافی وقت مل گیا تھا کہ وہ اپنے شک اور شبے کا اظہار کرتے، یعنی سات دن وہ میو ہسپتال میں زخمی حالت میں مگر ہوش و حواس کے ساتھ زندہ رہے۔ لیکن انہوں نے ماسوائے ایک موقع کے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس روز نواب زادہ نصر اللہ خان ان کی عیادت کو ہسپتال آئے۔ اور نواب صاحب سے علامہ کا تعلق ہم بیان کر چکے کہ ایسے جیسے باپ بیٹا ہوں۔ اس روز علامہ نے ان کو کہا نواب صاحب میرا کیا قصور تھا؟۔

یقیناً ان کے ذہن میں بھی مذہبی دہشت گردی نہیں تھی۔ وہ اس کے عوامل سیاست کی دشمنی کو سمجھ رہے تھے۔ ورنہ نواب صاحب کے سامنے اپنا استغاثہ نہ رکھتے۔

ایک اور بہت ہی اہم بات کہ جب جنرل ضیاء الحق کا نمائندہ کرنل ناصر ہاتھوں میں گلدستہ لیے جنرل کی طرف سے علامہ کو پوچھنے آیا تو علامہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ علامہ نے کہا ''جاؤ ضیاء الحق کو جا کر کہہ دینا۔ اس نے اچھا نہیں کیا، میں بدلہ لوں گا۔'' اور گلدستہ باہر پھنکوا دیا۔

ان شاء اللہ روز قیامت یہ مظلوم اور وہ مجرم آمنے سامنے ہوں گے اور علامہ اپنا کہا پورا کریں گے اور بدلہ لیں گے۔ رہا ہمارے بعض اہل حدیث بھائی جن کو ضیاء الحق میں ''صلاح الدین ایوبی'' اور ''محمد بن قاسم'' نظر آتا ہے، ان کی بصارت اور بصیرت کی کمزوری کا کیا علاج۔ محض افغانستان کے جہاد کے تناظر میں ضیاء کو دیکھنا کوتاہ نظری ہی تو ہے۔ ہم کیوں یہ فرمان نبوی ﷺ بھول جاتے ہیں کہ اللہ اپنے دین کا کام فاسقوں

فاجروں سے بھی لے لیتا ہے۔ جتنا جنرل ضیاء نے دس سال میں اسلام کا مذاق اپنے عمل کے ذریعے اڑایا اتنی تو بھٹو کو بھی جرأت نہ ہوئی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ علامہ کا یہ جملہ جنرل ضیاء الحق کے خلاف ایک ایف آئی آر ہے۔ رہا فرقہ وارانہ معاملات ہم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی کسی کو قتل کرنا چاہ رہا ہوتا ہے اور حکومتی ایجنسیوں کو مکمل پتہ ہوتا ہے کہ ایسا ہونے کو جا رہا ہے لیکن ان کا مفاد اس میں ہوتا ہے کہ ایسا ہونے دیا جائے اور وہ چپکے سے اپنا منہ دوسری طرف کر لیتے ہیں اور بعد میں ان کی پھرتیاں قابل دید ہوتی ہیں۔

ایک اور بات جو کبھی ذہن سے نہیں نکل سکتی، یہ کہ جب بم پھٹا تو عمر فاروق قدوسی جلسہ گاہ میں عام لوگوں کے ساتھ کھڑے تقریر سن رہے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ

> ''جب دھماکہ ہوا تو ایک دم افراتفری پھیل گئی، جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔ میں سٹیج کی طرف بھاگا کہ ایک پولیس والا بھاگتا ہوا آیا خدا جانے وہ کوئی جوان تھا یا آفیسر، زخمی لوگوں کے بیچ میں نیم اندھیرے میں اس نے ویڈیو کیمرہ تلاش کیا، اس میں سے فلم نکالی اور بھاگ گیا۔''

اب آپ ایمان داری سے فیصلہ کیجیے کہ ہماری پولیس والے کتنے بہادر ہوتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقع پر ریلیف کا کام عام لوگ ہی کرتے ہیں۔ ان بے چاروں کو تو اپنی جان بچانے کی فکر ہوتی ہے۔ ایسے میں اس پولیس اہل کار کے اس عمل سے چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ یقیناً وہ ذہنی طور پر تیار اور آگاہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

۲۔ اور اس آگاہی کے نتیجے میں اس نے فطری (یعنی بزدلانہ) ردعمل کی بجائے ایک شعوری ردعمل دیا۔

۳۔ اور وہ یہ تھا کہ دھماکے کے فوراً بعد اس نے کیمرے سے ویڈیو فلم نکالی ہے۔

یہ فلم کئی سال کی عدالتی جدوجہد کے بعد پولیس سے واپس مل سکی۔ اس کو قبضے میں لینے کا اس کے سوا کیا سبب ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسے شواہد "پبلک" نہ ہو جائیں اور جب تسلی ہو گئی تو ویڈیو واپس کر دی گئی۔

چونکہ یہ جلسہ ہم نے کیا تھا اور ہمارے والد اس میں شہید ہوئے، ہمارا کتنا ہی خاندان زخمی پڑا تھا۔ اس لیے ایف آئی آر درج کروانا ہمارا قانونی حق تھا، لیکن پولیس نے یہ کام کیا کہ جمعیت کے ناظم دفتر ہمارے اہل حدیث یوتھ فورس راوی روڈ کے ساتھی محمد یعقوب سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروا لیے اور جعل سازی سے اس بیان کو ایف آئی آر قرار دے دیا۔ یہ سراسر دھوکہ تھا۔ لیکن ہو چکا تھا۔

ایف آئی آر کے حوالے سے ہفت روزہ "زنجیر" کو انٹرویو دیتے ہوئے قاضی عبدالقدیر خاموش کا کہنا تھا کہ آئی جی پنجاب کو کم از کم بیس مرتبہ کہا گیا کہ علامہ شہیدؒ کا بیان قلم بند کیا جائے لیکن انھوں نے ٹال مٹول سے کام لیا اور آخر وقت تک علامہ شہیدؒ کا بیان نہ لیا۔

احتجاجی تحریک شروع تھی اور کیس کی تفتیش بھی جاری تھی۔ دوران تفتیش بہت سی عجیب اور اہم باتیں سامنے آتی رہیں۔ کبھی تفتیش کے ایسے پہلو جانتے بوجھتے ہمارے سامنے لائے جاتے کہ صاف دلالت کرتے کہ اس کیس کو ہمسایہ ملک کے سر ٹھونسا جا رہا ہے اور کبھی اپنے ہی پیش کردہ دلائل اور شواہد کی نفی کر دیتے۔

کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ معاملات کو دانستہ مخصوص رخ پہ ڈالا جا رہا ہے۔ ایک روز ہمارا ساتھی افضل پر جوش سا آیا کہ گیندے کے جو پھول جائے حادثہ سے ملے تھے، ویسے ہی پھول فلاں گھر کے باہر بھی پڑے ہوئے ہیں جیسے ان کو تازہ تازہ کیاری سے اکھاڑا گیا ہو، اور وہ گھر ایک وکیل صاحب کا تھا جو راوی روڈ کے پرانے باسی تھے اور شیعہ عقیدے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس نے بھی اس "ثبوت" کو سنجیدگی سے لیا اور چند افراد گرفتار بھی کر لیے گئے۔

میرا تبصرہ یہ تھا کہ اگر وہ اتنے سمجھدار ہیں کہ ان کو خیال آ گیا اور انہوں نے گیندے کے پھول اپنے گھر کی کیاریوں سے غائب کر دیے تو ساتھ ہی ساتھ وہ ایسے احمق کیوں ہیں کہ وہ پھول اپنے ہی گھر کے سامنے پھینک دیے۔ صاف سیدھی بات ہے ہم لوگوں کو سوچنے کے لیے ایک لائن دی جا رہی ہے۔ اور کبھی دوسری لائن کہ ہم ذہنی انتشار کا شکار رہیں۔ مقصد؟؟

یہ کہ ہم انہی باتوں میں الجھے رہیں اور اصل مجرموں کی طرف ہمارا دھیان نہ جائے۔

میرا اس کیس میں ذہنی رجحان آج تک بھی یہ ہے کہ یہ ضیاء الحق اور اس کی ایجنسیوں کا کارنامہ تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ اس معاملے میں ہمسایہ مذہبی حکومت کو الزام دیتے ہیں، میں ان کی اس بات کو ردّ کرتا ہوں۔ یقیناً شقی القلب درندوں کے لیے انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں اور جان بھی اس کی کہ جو ان کی نظر میں دنیا میں ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

بزدلی سے قوم بچا کرتی
تو
بہادروں کو کبھی موت نہ آتی۔
[آخری خطاب]

سال رحلت ان کا صابر ہے بجا
"دین کے یاور تھے علامہ ظہیر"
۱۹۸۷ء

تاریخِ رفتگاں
جلد دوم
۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۸ء
صابر براری

کتابیات

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید "ایک عہد ایک تحریک"	قاضی محمد اسلم سیف رحمہ اللہ
علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید	جاوید جمال ڈسکوی مرحوم
ہفت روزہ الاعتصام،	لاہور، پاکستان
ہفت روزہ اہل حدیث	لاہور، پاکستان
ماہنامہ ترجمان الحدیث	لاہور، پاکستان
ہفت روزہ الاسلام	لاہور، پاکستان
ہفت روزہ زنجیر	حسن نثار
ہفت روزہ چٹان	شورش کشمیری
الشیخ احسان الٰہی ظہیر	دکتور علی بن موسیٰ الظہرانی
ارمغان ظہیر	قاضی محمد اسلم سیف و بشیر احمد انصاری
خطبات علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید	عمر فاروق قدوسی
ہفت اقلیم	محمد اسحاق بھٹی
دید شنید	رفیق ڈوگر
خاکے	ایس ایم ظفر
مجلّہ الدعوۃ	سعودی عرب
علامہ شہید کے انٹرویوز	....
سفرِ حجاز	از علامہ شہید
سقوط ڈھاکہ	از علامہ شہید
سوانح حیات علامہ احسان الٰہی ظہیر	جناب عبدالرزاق صاحب، ہندوستان
فتاویٰ ثنائیہ	مولانا داؤد راز

علامہ شہید رحمہ اللہ کی ذات ایک ایسی کتاب الفت تھی کہ جس کے ہر پرت پر مختلف اور متنوع صفات و کمالات کے نقش ہائے رنگا رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں دین کی حمیت اور عصبیت اس درجہ موجود تھی کہ وہ اس سلسلے میں شیران غاب کا سا حوصلہ رکھتے تھے۔ میدان خطابت میں وہ شیر کی طرح گرجتے، چیتے کی طرح لپکتے، ہیرے کی طرح دمکتے اور موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ ان کی فکر میں شاہین کا تجسس اور نظر میں عقاب کی سی لپک تھی۔ ان کی حیات جو ایک شعلۂ مستعجل کی صورت تھی، سراسر غیرت ایمانی اور حمیت دینی سے لبریز تھی۔ وہ توحید الٰہی کی پرکار، حب نبوی میں سرشار، جماعت اہلحدیث کا افتخار، علم وتحقیق کی دستار، قلم وقرطاس کا وقار، حریت وحمیت کی تلوار، ائمہ سلف کا کردار، آمروں کے لیے للکار اور خیر القرون کا تذکار تھے۔ اپنی بیالیس سالہ زندگی میں انہوں نے علوم حکمت کے گلزار دیکھے تو سیاست کے خارزاروں میں بھی برہنہ پائی اختیار کی۔ ان کا قلم اگر علمی اور تحقیقی جواہر ریزے برساتا تو ان کی خطابت بھی ہمیشہ شعلہ بار رہی۔ وہ کسی کے جلال و جبروت سے دبنے والے نہ تھے۔ انہوں نے اہلحدیث کے نوجوانوں میں ایک ایسا جذبہ تازہ اور نشۂ دینی بیدار کر دیا کہ جس کے اثرات نے ان کے داعیانہ کردار کو ایک نئی مہمیز عطا کر دی۔ ان کی قائدانہ صلاحیتوں نے اپنی جماعت کو ملک کی صف اول کی جماعتوں کے قد کے برابر کر دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بزم کی رعنائیوں سے رزم کے معرکوں میں لے آئے۔ اپنی مملکت میں جمہوری قدروں کی آبیاری کے لیے قید و بند کی صعوبتوں کو بھی خندۂ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا۔ ایسی شخصیت کے کارنامے ایک مجاہدی شان سے آراستہ تھے تو قدرت نے انہیں شہادت کے اعزاز سے بھی محروم نہ رکھا۔ جس سرزمین نے اسے علم دین کے فیوض وبرکات بخشے بالآخر وہ اسی مدینۃ النبی ﷺ میں جنت البقیع کا حق دار بن گیا۔

(پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ)